
WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلی شعاع	رضیہ جمیل	10
حمد	ریحانہ تبسم	11
نعت	بنت مجتبیٰ	11
نبی کی باتیں	ادارہ	12

انٹرویو

بند مٹھی	امبر خان	17
دستک	شاہین رشید	22
شعاع کے ساتھ	ادارہ	280

ناول

ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	36
رقصِ بسمل	نبیلہ عزیز	172

مکمل ناول

یارم	سمیرا حمید	188
صنم سے صمد تک	کنیز نبوی	110
ڈھل گیا ہجر کا دن	صدف آصف	68

ناولٹ

کوئی نہ جانے بات	عائشہ نصیر احمد	242

افسانے

لیلۃ القدر	قانتہ رابعہ	58
بارش کے بعد	حنا یاسمین	100
بچھڑ جاؤں	بی سحر ملک	168
ایک تیتر	رشک حبیبہ	265

نظمیں غزلیں

غزل	سحر انصاری	270
غزل	صابر ظفر	270
نظم	نثار ترابی	271
غزل	سید علی سلمان	271

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے



مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	26
مسکراہٹیں	صبا سحر	272
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	282
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	275
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	285
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	278
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	288
خوبصورت نغمے	ادارہ	290

جولائی 2014
جلد 28 شمارہ 11
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91، بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

نگہت جیلانی

شعاع کا جولائی کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

اس ماہ رمضان المبارک کی بابرکت اور مقدس ساعتیں ہم پر سایہ فگن ہو رہی ہیں۔ قدرت ہمیں موقع دے رہی ہے کہ ہم رمضان المبارک میں روزہ رکھ کر اور اپنے گناہوں سے توبہ استغفار کرکے اپنا دامن خیر و برکت سے بھر لیں۔

رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں قرآن پاک نازل کیا گیا، جو تمام انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا، اس کو سننا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا رمضان المبارک کی خاص عبادات میں شامل ہے۔ ہم قرآن پاک پڑھتے ہیں، سنتے ہیں لیکن اس کے معنی اور مفہوم سے ناواقف رہتے ہیں۔ رمضان المبارک کے مہینے میں تلاوت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا وقت نکال کر اس کا ترجمہ بھی پڑھیں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ تاکہ ہم جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حکمت کے کیسے خزانے ہمیں عطا کیے ہیں۔

سالگرہ نمبر:

ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ شعاع اپنے سفر میں ایک اور سال آگے بڑھ گیا۔ اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل ہو سکیں۔

قارئین سے سروے:

شعاع کے خاص نمبروں میں قارئین کی شرکت لازمی ہے۔ اس بار قارئین سے سروے سالگرہ نمبر اور عید نمبر کے حوالے سے ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ چاند رات کو آپ کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں؟ اور عید کا دن کیسے گزارتی ہیں؟

2۔ وہ کون سی ڈش ہے جو عید کے دن آپ کے گھر میں لازمی طور پر بنتی ہے اور سب پسند کرتے ہیں۔ اس خاص ڈش کی ترکیب ہماری قارئین سے شیئر کیجیے۔

3۔ شعاع میں شائع ہونے والی آپ کی پسندیدہ مصنفین کون سی ہیں اور وہ آپ کو کیوں پسند ہیں؟

4۔ اس سال شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں آپ کا پسندیدہ جملہ، شعر یا اقتباس، جو آپ کو اچھا لگا ہو، قارئین سے شیئر کیجیے۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 15 جولائی تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

سمیرا حمید نے بہت کم عرصے میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کی تحریریں — زندگی کے دکھوں، تلخیوں اور انسانی فطرت کے تاریک پہلو کی عکاسی کرتی ہیں۔

اس بار سمیرا حمید نے اپنے انداز سے قدرے ہٹ کر لکھا ہے۔ ہلکے پھلکے خوشگوار انداز میں لکھا ان کا یہ ناول فکر کے کئی پہلو بھی سامنے لاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے قارئین اسے پسند کریں گی۔

- بلم — سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- سمندر سے سمندر تک — کنیز نبوی کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ڈھل گیا ہجر کا دن — صدف آصف کا مکمل ناول،
- رفشانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناولٹ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ستارے کی سکھی،
- کائنات زاہد، ثمانہ یاسمین، رشک حبیبہ اور رقیہ محبوبہ کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ رعنا عمر ذیشان اور ارشد محمود کا بندھن،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- آئینہ خانے میں حفظ آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

خلاق دو عالم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
سب کچھ ہے وہی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

اس کے کرم نے پھول کھلائے ہیں دشت میں
ورنہ تو حسنِ موجِ صبا کچھ بھی نہیں ہے

روشن ہیں اس کے نور سے مہر و مہ و نجوم
ورنہ تو ان میں نور و ضیا کچھ بھی نہیں ہے

ہر اک نبی کا معجزہ اس کی ہی دین ہے
چاہے اگر نہ وہ تو عصا کچھ بھی نہیں ہے

جلوہ ہو کہ بینائی نظارہ کہ نظر ہو
تنویرِ الٰہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

وجدان پہ یہ حمد عطائے الٰہ ہے
ورنہ یہ میری فکرِ رسا کچھ بھی نہیں ہے

ریحانہ تبسم فاضلی

نعت رسول مقبول ﷺ

وہ ہے شاہِ عرب وہ ہے طٰہٰ لقب
وہ ہے جانِ جہاں اس پہ قربان سب
اس جہانِ محبت پہ لاکھوں سلام
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

بے وسیلوں کا تنہا وسیلہ بنا
بے سہاروں کا واحد سہارا بنا
ظلمتِ کفر میں وہ نویدِ سحر
شامِ غم میں سحر کا ستارہ بنا
اس نبیؐ کی رسالت پہ لاکھوں سلام
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

وہ ہے بحرِ سخا، وہ ہے گنجِ عطا
وہ دعائے خلیل و حبیبِ خدا
اس کی شانِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
وہ شہِ ذی حشم ہے خدا کی قسم
وہ شفیع الامم ہے خدا کی قسم
اس نے راہِ ہدایت دکھائی ہمیں
وہ خدا کا کرم ہے، خدا کی قسم
اس چراغِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

بنتِ مجتبیٰ مینا

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ماہ رمضان کے قیام (نماز تراویح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے (اللہ کے وعدوں پر) ایمان رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اور رمضان کا قیام کیا۔ اس کے وہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے جو پہلے (سرزد) ہو چکے ہیں۔"

(ترمذی)

فوائد و مسائل:۔

1۔ ہر عمل کے لیے خلوص نیت بہت ضروری ہے۔ روزے اور قیام کا ثواب بھی تب ہی مل سکتا ہے جب یہ عمل محض اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہو ریاکاری کے طور پر نہ ہو۔

گزشتہ گناہوں کی معافی سے عام طور پر صغیرہ گناہوں کی معافی مراد لی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات کسی بڑی نیکی کی وجہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو سکتا ہے۔ روزہ اور قیام جس قدر خلوص نیت کا حامل اور سنت کے مطابق ہو گا۔ اتنا ہی زیادہ گناہوں کی معافی کا باعث ہو گا۔

نماز تراویح

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا۔

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رمضان کے روزے رکھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں قیام نہ فرمایا۔ حتیٰ کہ سات راتیں باقی رہ گئیں تو ساتویں رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز (تراویح) پڑھائی حتیٰ کہ تقریباً" تہائی رات گزر گئی' پھر اس سے متصل چھٹی رات آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام نہ فرمایا۔ پھر اس سے متصل پانچویں رات آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز (تراویح) پڑھائی حتیٰ کہ تقریباً" آدھی رات گزر گئی۔

میں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کاش آپ ہمیں اس رات کا باقی حصہ بھی عطا فرماتے۔" (پوری رات قیام فرماتے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص امام کے ساتھ اس کے فارغ ہونے تک قیام کرتا ہے۔ (اس کا) وہ (قیام) پوری رات کے (قیام کے) برابر ہوتا ہے۔"

پھر اس سے متصل چوتھی رات آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام نہ فرمایا۔ پھر اس سے متصل تیسری رات آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خواتین کو اور اہل خانہ کو اکٹھا کیا اور (بہت زیادہ) لوگ بھی جمع ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی حتیٰ کہ ہمیں خطرہ محسوس ہوا کہ ہماری فلاح چھوٹ جائے گی۔

(ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے) پوچھا گیا۔ "فلاح کا کیا مطلب ہے؟"

فرمایا۔ "سحری کا کھانا۔"

پھر فرمایا۔ "اس کے بعد مہینے کی باقی راتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز (تراویح) نہیں پڑھائی۔"

فوائد و مسائل

1۔ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کا اہتمام معمول سے زیادہ کرنا چاہیے۔

2۔ نماز تراویح نفل نماز ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مہینہ نہیں پڑھائی۔ صرف چند راتیں پڑھائی۔

3۔ نماز تراویح میں قیام، رکوع اور سجود وغیرہ طویل ہونے سے زیادہ وقت تک نماز ادا کی جاسکتی ہے اور کم تلاوت اور مختصر رکوع و سجود کے ساتھ کم وقت میں بھی فراغت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس میں عام نمازیوں کے شوق اور ہمت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

4۔ نفل نماز میں تلاوت کی کوئی خاص مقدار مقرر کرنا ضروری نہیں، کسی دن طویل اور کسی دن مختصر قیام ہو سکتا ہے۔

5۔ طویل نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو تلاوت زیادہ کرلی جائے یا تلاوت ترتیل کے ساتھ کی جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فرمان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز رمضان میں بھی اور دوسرے مہینوں میں بھی وتروں سمیت گیارہ رکعت ہی ہوتی تھی۔ (بخاری)

6۔ نماز تراویح میں عورتوں اور بچوں کو بھی شریک ہونا چاہیے۔

7۔ سحری کا کھانا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روزوں میں امتیاز بھی ہے اور باعث برکت بھی۔ اس لیے فلاح کہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا رمضان تراویح نہیں پڑھائی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر یہ فرض ہو گئی تو امت کو اس عمل کرنا مشکل ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چونکہ یہ خطرہ نہیں رہا۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پورا مہینہ باجماعت تراویح کا اہتمام فرمایا۔

رات کا قیام (نماز تہجد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

"شیطان رات کو انسان کے سر کے پچھلے حصے میں رسی سے تین گرہیں لگاتا ہے۔ اگر انسان جاگ کر اللہ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر جب اٹھ کر وضو کر لیتا ہے تو ایک (اور) گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر جب نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کی تمام گرہیں کھل جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ صبح کو چاق چوبند اور خوش باش ہوتا ہے۔ اسے بھلائی مل گئی ہوتی ہے۔ اگر (انسان) یہ کام نہ کرے تو صبح سست و بوجھل طبیعت ہوتا ہے۔ اسے بھلائی نہیں ملی ہوتی۔"

1۔ شیطان ہماری نظر سے اوجھل مخلوق ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ قرآن و حدیث سے ثابت ہو اس پر یقین رکھنا چاہیے۔

2۔ رسی، دھاگے یا بالوں میں گرہ لگا کر پھونک مارنا جادوگروں کا طریقہ ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ فلق ہے۔ "اور (میں) گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے (اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔) شیطان اس طرح انسان پر نفسیاتی اثر ڈال کر اللہ کی یاد سے غافل کرتا ہے جیسے کہ حدیث میں ہے کہ وہ ہر گرہ لگاتے وقت کہتا ہے۔ "ابھی بہت لمبی رات پڑی ہے، سویا رہ۔" (صحیح بخاری)

3۔ اللہ کی یاد شیطان کی تدبیروں کا بہترین توڑ ہے۔ جاگ کر اللہ کا نام لینا یعنی یہ دعا پڑھنا شیطان کی لگائی ہوئی گرہ کھول دیتا ہے۔ "تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے ہمیں موت دینے کے بعد (دوبارہ) زندگی بخشی اور (قیامت کے دن) اٹھ کر اسی کے پاس جانا ہے۔"

4۔ نماز تہجد شیطان کے شر سے محفوظ رکھنے والی ایک اہم چیز ہے۔

5۔ اللہ کی یاد اور نماز کی برکت سے روح کو آسودگی اور دل کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز پریشانی، پژمردگی اور سستی کا باعث ہوتی ہے۔

6۔ اللہ کی یاد سے دنیا کی بھلائی حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی رضا بھی نصیب ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین راتیں باجماعت قیام کیا

سیدنا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (رمضان المبارک کے) روزے رکھے۔ (شروع میں) آپ نے ہمارے ساتھ مہینے میں سے کچھ بھی قیام نہ کیا۔ یہاں تک کہ 23 ویں رات کو آپ نے ہمیں قیام رمضان کرایا۔ پھر آپ نے 24 ویں رات چھوڑ کر 25 ویں رات کو۔ پھر 26 ویں رات کو چھوڑ کر 27 ویں شب کو اپنے اہل خانہ اور اپنی عورتوں کو اور سب لوگوں کو جمع کرکے قیام کیا اور فرمایا۔ "جو شخص امام کے ساتھ نماز عشاء ادا کرتا ہے اس کے لیے پوری رات کا قیام لکھا جاتا ہے۔"

(سنن ابوداؤد)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تین رات کے بعد) فرمایا۔

"میں نے دیکھا ہے کہ تمہارا معمول برابر قائم ہے تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں تم پر (یہ قیام) فرض نہ کردی جائے۔ (اس لیے گھر سے نہیں نکلا) چنانچہ تم اپنے اپنے گھروں میں (رمضان کی راتوں کا) قیام کرو۔ آدمی کی نفل نماز گھر میں افضل ہوتی ہے۔"

(صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شب قیام رمضان کراکے لوگوں سے فرمایا۔ "تم اپنے گھروں میں پڑھا کرو۔" امام زہری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی یہی طریقہ جاری

رہا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا۔ (پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک امام کے پیچھے پڑھنے کا طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھا اور بوجہ خوف فرضیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل رمضان اختیار نہیں فرمایا تھا پھر سے جاری فرمایا۔)

(صحیح بخاری)

رمضان میں تہجد اور تراویح ایک ہی نماز ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 27 ویں رمضان المبارک کو اتنا لمبا قیام کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں سحری ہی فوت نہ ہوجائے۔

(ترمذی)

معلوم ہوا کہ ماہ رمضان میں تہجد اور قیام رمضان الگ الگ نہیں، بلکہ ایک ہی نماز ہے۔ سرے سے منقول ہی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی کسی رات کو تہجد اور قیام رمضان کا الگ الگ اہتمام کیا ہو۔

قیام رمضان

ابوسلمہ رحمتہ اللہ علیہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ۔

"رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات والی نماز کیسی تھی؟ سیدہ صدیقہ کبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔

"رمضان اور غیر رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (بالعموم) گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔"

(صحیح بخاری)

سحری اور فجر کا درمیانی وقفہ

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے "انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر نماز فجر کے لیے کھڑے ہوگئے۔ (اور نماز پڑھی) سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ۔"

دونوں (سحری اور نماز) میں کتنا وقفہ تھا؟
تو انہوں نے بتایا کہ (سحری سے فراغت اور نماز میں داخل ہونے کا وقفہ) اتنا تھا جتنی دیر میں کوئی شخص قرآن حکیم کی پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھ لیتا ہے۔
(صحیح بخاری)

شب قدر کا بیان

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا۔ پھر آپ نے فرمایا۔ "مجھے شب قدر دکھائی گئی تھی۔ پھر بھلا دی گئی۔ اسے آخری دہائی کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔"

(بخاری)

1۔ شب قدر سال کی سب سے افضل رات ہے۔ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینے کی عبادت سے زیادہ فضیلت کی حامل ہے۔
2۔ شب قدر کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے اعتکاف کرنا سنت ہے۔ البتہ جو شخص اعتکاف نہ کر سکے۔ اسے بھی راتیں عبادت میں گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
3۔ شب قدر بھلا دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد نہ رہی کہ اس سال کون سی رات شب قدر ہے۔ ہر سال اسی رات میں ہونا ضروری نہیں۔
4۔ شب قدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ اس لیے جو شخص دس راتیں عبادت نہ کر سکے۔ اسے یہ پانچ راتیں ضرور عبادت اور تلاوت و ذکر میں گزارنی چاہئیں تاکہ شب قدر کی عظیم نعمت سے محروم نہ رہے۔
اگرچہ علمائے کرام نے شب قدر کی بعض علامتیں بیان کی ہیں۔ لیکن ثواب کا دارومدار اس چیز پر نہیں کہ عبادت کرنے والے کو یہ رات معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ اس لیے اس پریشانی میں مبتلا ہونا چاہیے کہ ہمیں فلاں فلاں علامت کا احساس نہیں ہوا۔

رمضان کے آخری عشرے کی فضیلت

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔
"نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری دس دنوں میں اتنی محنت کرتے تھے جتنی اور دنوں میں نہیں کرتے تھے۔"

فوائد و مسائل

1۔ افضل ایام میں نیک اعمال کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔
2۔ رمضان کے آخری دس دن ۔ سب کے سب فضیلت کے حامل ہیں۔ اسی طرح شب قدر کے علاوہ آخری عشرے کی باقی راتیں بھی رمضان کی دوسری راتوں کی نسبت افضل ہیں۔ اس لیے ان ایام میں ذکر و تلاوت اور صدقات و خیرات جیسی نیکیوں میں پہلے سے اضافہ کر دینا چاہیے۔

راتوں کو جاگنا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔
"جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگتے کمر کس لیتے اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔"

فوائد و مسائل

1۔ کمر کسنے سے مراد عبادت اور نیکی میں مزید محنت اور کوشش ہے۔
2۔ آخری عشرے کی اگر سب ہی راتیں عبادت

دونوں عیدوں کی راتوں کا قیام

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے اللہ سے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے عیدین کی دونوں راتوں میں قیام کیا۔ اس کا دل

نہیں مرے گا۔" جس دن (لوگوں کے) دل مرجائیں گے۔

میں گزاری جائیں تو بہت بہتر ہے۔ ورنہ طاق راتوں کو تو اہتمام کرنا ہی چاہیے۔

3۔ نیکی کے کاموں میں اہل و عیال کو بھی شریک کرنا چاہیے' تاکہ وہ بھی عظیم ثواب سے محروم نہ رہیں اور اللہ کے ہاں بلند درجات حاصل کر سکیں۔

4۔ جاگنے کا مقصد عبادت' ذکر اور تلاوت میں مشغول ہونا ہے۔ بعض لوگ یہ فضیلت والی راتیں فضول بات چیت میں گزار دیتے ہیں' یہ انتہائی محرومی اور بدقسمتی کی بات ہے' خاص کر مساجد میں شور و غوغا عبادت کرنے والوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

5۔ بہت سی مساجد میں طاق راتوں میں اور خاص طور پر ستائیسویں رات کو وعظ و تقریر کا پروگرام ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے رات کا قابل حصہ اسی مصروفیت میں گزر جاتا ہے۔

6۔ اسی طرح ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچے اور بڑے سب ہی عبادت و تلاوت کو بھول کر مسجد کے آداب کو نظرانداز کرتے ہوئے شور شرابے میں لگے رہتے ہیں۔ جس سے نہ صرف عبادت کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے' بلکہ یہ انتہائی قیمتی وقت فضول کاموں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے ان امور سے اجتناب کیا جائے۔

جانوروں پر رحم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دفعہ آدمی راستے پر چلا جا رہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی۔ اس نے ایک کنواں پایا تو اس میں اتر کر اس نے پانی پیا' پھر باہر نکل آیا۔ وہیں ایک کتا تھا جو پیاس کے مارے زبان باہر نکالے (ہانپتے ہوئے) کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس آدمی نے (دل میں) کہا۔ اس کتے کو بھی اسی طرح پیاس نے ستایا ہے' جس طرح میں اس کی شدت سے بے حال ہو گیا تھا' چنانچہ وہ (دوبارہ) کنویں میں اترا اور اپنا موزہ پانی سے بھرا اور اسے اپنے منہ سے پکڑے اوپر چڑھ آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس (کے اس عمل اور جذبے) کی قدر کی اور اسے معاف فرما دیا۔"

(یہ سن کر) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمارے لیے چوپایوں (پر ترس کھانے) میں بھی اجر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(ہاں) ہر تر جگر والے (جاندار کی دیکھ بھال) میں اجر ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے عمل کی قدر کی۔ چنانچہ اسے بخش دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔"

اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"ایک دفعہ ایک کتا کنویں کے گرد چکر لگا رہا تھا' اسے پیاس مارے دے رہی تھی کہ اچانک اسے بنی اسرائیل کی فاحشہ عورتوں میں سے ایک بدکار عورت نے دیکھا' پس اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس کے ذریعے سے اس نے اس کے لیے (کنویں سے) پانی کھینچا اور اسے پلا دیا تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے بخش دیا گیا۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی ہر مخلوق کے ساتھ حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ بھی احسان کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت بڑی وسیع ہے' وہ اگر چاہے تو تھوڑے سے عمل کو بھی قبول فرما کر بندے کی مغفرت فرما دے۔

3۔ قاعدہ یہی ہے کہ کبیرہ گناہوں سے توبہ کی جائے' تاہم بسا اوقات خلوص نیت سے کیا ہوا نیک عمل بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور انسان کے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

بندھن

امبر خان ہمراہ ارشد محمود

شاہین رشید

"کبھی کبھی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنہیں ہم بہت چاہتے ہیں جب وہ ہماری زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں پہلے جیسی شدت نظر نہیں آتی۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنہیں ہم چاہتے ہی نہیں ہیں مگر جب وہ ہماری زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص ہماری زندگی کے لیے کتنا اہم ہے۔ اسے ہم خواہ مخواہ نظر انداز کرتے رہے۔ ایسی ہی کچھ کی ایک کہانی "امبر خان" کی ہے۔ آئیے جانتے ہیں امبر خان کی شادی کیسے ہوئی اور اب کیسی گزر رہی ہے۔"

"کیسی ہو امبر اور کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

"آج کل ماشاء اللہ اپنے "چھوٹے" کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ بھی ایک فل ٹائم جاب ہے اور یہ جاب ضروری بھی ہے اور مزے دار بھی ہے۔"

"نام کیا ہے اور عمر کتنی ہے؟"

"یہ ابھی سوا سال کا ہے اور اس کا نام "ابوبکر" ہے مجھے یہ نام بے انتہا پسند تھا اور ہم میاں بیوی نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکا ہوا تو "ابوبکر" رکھیں گے اور اگر لڑکی ہوئی تو "فاطمہ" رکھیں گے۔ ساس سسر چونکہ ذرا مذہبی ٹائپ کے ہیں تو وہ تو بہت ہی خوش ہوئے البتہ میری امی کو تھوڑا سا اعتراض تھا کہ اتنا بڑا نام پھر لوگ نام بگاڑتے ہیں تو گناہ بھی ملے گا تو میں نے کہا کہ لوگ جو بھی بولیں مجھے ان کی پروا نہیں ہے اور اللہ اس نام کی اور ہمارے بیٹے کی خود ہی حفاظت کرے گا۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"شادی کو تقریباً" ساڑھے چھ سال ہو گئے ہیں اور ابیٹا "اب" آپ پوچھیں گی کہ پہلی اولاد اور اتنی دیر سے تو۔ شروع میں پلان نہیں تھا پھر ایک تو وہ گڑبڑ بھی ہو گئی۔ بس پھر جب اللہ کی مرضی ہوئی تو "ابوبکر" صاحب آ گئے۔"

"اپنی شادی کے بارے میں اور میاں صاحب کے بارے میں بتاؤ؟"

"میرے میاں صاحب کا نام ارشد محمود ہے۔ ایم سی اے انہوں نے گریجویشن کیا ہے اور گرافک ڈیزائنر ہیں اور ہماری شادی ہوئی ہے 13 مارچ 2009ء کو۔"

"کوئی ملاقات تھی۔ کوئی ریلیشن تھا فیملی کا؟"

"آپ کو پتا ہی ہے کہ امی کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے تو یہ پہلے امی کے پاس جاب کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ پسند کرتے تھے مجھے پھر انہوں نے امی سے بات کی میں نے کہہ دیا کہ مجھے ان سے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں۔؟"

قہقہہ "کیوں کہ یہ مجھے پسند نہیں تھے اور۔"

"ارے۔ لکھ دوں اور کیوں پسند نہیں تھے؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں بالکل لکھ دیں۔۔۔ میں تو ٹی وی انٹرویوز میں بھی صاف صاف کہہ دیتی ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور۔۔۔ دراصل ہر انسان کی اپنی ایک چوائس ہوتی ہے۔ بہت چھوٹی تھی کہ شوبز میں آگئی تھی اور شوبز میں اتنے ہینڈسم لڑکے تھے تو ان کو دیکھ کر ذہن میں بھی تھا کہ ایسا ہو' ویسا ہو' نویں کلاس میں تھی جب میں اس فیلڈ میں آئی۔۔۔ آپ خود سوچیں کہ عمر تو کچی تھی نا۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ ہی میچور ہوتا ہے۔ پھر جب عقل آئی تو میں نے امی سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے مجھے آپ کی پسند سے ہی شادی کرنی ہے تو ارشد امی کی ہی پسند ہیں۔"

"اچھا گڈ۔۔۔ تو پھر ارشد صاحب کب پسند آنا شروع ہوئے؟"

بے ساختہ ہنستے ہوئے۔ "مت پوچھیں۔۔۔ سب نے مل کر ہاں کروائی مجھ سے۔"

"او ہو۔۔۔ پھر ہاں کرنے کے بعد کیا ری ایکشن تھا تمہارا؟"

"امی سمجھاتی رہتی تھیں کہ وہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ بڑوں کے فیصلے اور تجربے بہتر ہوتے ہیں۔ ابھی تم نادان ہو' میری باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں لیکن ایک وقت آئے گا کہ تمہیں میرا فیصلہ صحیح لگے گا۔ بس اماں کی بھری ہوئی چابی نے مجھے پھسلا دیا اور شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ "یہ" واقعی بہت خیال رکھنے والے بہت اچھے انسان ہیں۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور اس دوران ملنا جلنا مطلب ڈیٹ وغیرہ؟"

"ہاں ہاں۔۔۔ ملنا جلنا "آنا جانا" رہتا تھا اصل میں مجھے بہت ٹائم چاہیے تھا کہ میں ان کو اچھی طرح جانچ لوں اور اس کام میں مجھے میں نے آٹھ سال لگائے۔ آٹھ سال کے بعد میں نے شادی کی۔ ان کا میں نے بہت دل توڑا' میری بہن بھی کہتی تھیں کہ تم نے ایک اچھے انسان کو بہت پریشان کیا۔"

"بڑی بات ہے ورنہ تو لڑکے کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے ایک بار ریجیکٹ کیا ہے تو میں سو بار کرتا ہوں۔۔۔ پھر شادی کے بعد کوئی بدلہ کوئی انتقام تو نہیں لیا ارشد صاحب نے؟"

"نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا کیوں کہ یہ بہت اچھے مزاج کے ہیں بلکہ یہ مجھے کہتے ہیں کہ تمہارا مزاج بہت گرم ہے' تھوڑا اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھا کرو۔۔۔ انہیں پتا ہے کہ میرا مزاج کیسا ہے اور میں کسی بھی وقت کچھ کہہ سکتی ہوں؟"

"ارشد محمود صاحب کا تعلق کہاں سے ہے اور کتنے فیملی ممبرز ہیں؟"

"یہ لوگ ایبٹ آباد کے ہیں۔ دو نندیں ہیں میری۔ ایک دیور اور ایک جیٹھ ہیں۔ دیور دبئی میں ہوتے ہیں۔ وہ جیٹھ کراچی میں ہیں ان کی پوسٹنگ ہوتی رہتی ہے۔ سارے ہی وہ بھی بھی ہیں تو کبھی کہیں۔ سالوں بعد ہم لوگ اکٹھے ہوتے ہیں' کبھی کسی تہوار پہ تو کبھی کسی تقریب میں۔"

"سسرال تو کیسا پایا۔ رسمیں وغیرہ ہوئیں "آپ کی تو بھگت ہوئی؟"

"جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایبٹ آباد سے تعلق ہے تو ان لوگوں کے مزاج میں اور کلچر میں بھی کافی فرق ہے۔ میں جب وہاں جاتی ہوں تو بہت آؤ بھگت ہوتی ہے اور بہت عزت بھی دیتے ہیں اور جب ابوبکر کو پہلی بار لے کر گئی تو بہت شاندار استقبال ہوا' پھر ان کے آبائی گاؤں بھی گئی۔ وہاں تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہم لوگ منسٹر ہیں ان کے گاؤں والے بہت عزت خاطر کرتے ہیں مجھے وہاں سب "ٹی وی والی" بولتے ہیں۔"

"شادی سے پہلے ارشد مزاج کے کیسے تھے اور شادی کے بعد کوئی تبدیلی آئی مزاج میں؟"

"شادی سے پہلے تو لڑکی کو پتا ہوتا ہے نا۔۔۔" قہقہہ "پھر تو جی حضوری ہو رہی ہوتی ہے۔ ساس کی بھی خدمت ہو رہی ہوتی ہے۔ مجھے قابو کرنے کے لیے میری بہنوں سے بہت اچھے تعلقات رکھے ہوئے تھے۔ شادی کے بعد یہ چینج آیا کہ پہلے تو



میں منہ سے بولتی تھی اور وہ فوری حاضر ہو جاتی تھی کہ اب اچھا ہاں لے تو میں گا کر لوں گا۔۔۔ اب یاد ہو تو شرمندگی ہوتی ہے۔"

"آپ بتا رہی ہیں کہ رسم و رواج میں فرق ہے اور کھانے وغیرہ میں؟"

"جی ہم اردو اسپیکنگ اور یہ پٹھان ہیں تو بہت زیادہ فرق ہے رسم و رواج میں بھی اور کھانے وغیرہ میں بھی۔ ہم لوگ ذرا آزاد خیال ہیں جبکہ پٹھان لوگوں کے ہاں بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جذباتی بھی بہت ہوتے ہیں ان کے یہاں عزت غیرت بہت ہوتی ہے۔ سخت پردہ ہوتا ہے کسی غیر مرد کے سامنے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سر پہ دوپٹہ ہر وقت لینا پڑتا ہے۔

اور جہاں تک رسموں کی بات ہے تو ہماری طرف کی رسمیں زیادہ مزے دار ہوتی ہیں اور ان کے یہاں جو گاؤں میں شادیاں ہوتی ہیں وہ زیادہ اچھی ہوتی ہیں، مگر میری شادی ایبٹ آباد میں نہیں ہوئی تھی ان کے یہاں روایتی ڈانس گانا بہت مزے کا ہوتا ہے اور

کھانے کے ٹیسٹ میں بھی فرق ہے۔ ان کے کھانے بہت پھیکے ہوتے ہیں۔ ہمارے کھانے چٹ پٹے

ہوتے ہیں، اب تو خیر ان کو بھی چٹ پٹے کھانوں کی عادت ہو گئی ہے۔ اب اپنے گاؤں جاتے ہیں تو بالکل بھی نہیں کھا پاتے۔"

"پٹھانوں میں غصہ بہت ہوتا ہے تو یہ کیسے ہیں؟"

"ان کا پورا گھرانہ بہت غصے والا ہے، لیکن یہ خود بہت نرم مزاج ہیں۔ سہہ جاتے ہیں۔ اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھتے ہیں اگر کبھی بہت ہی زیادہ غصہ آجائے تو بس یہ ہوتا ہے کہ گھر سے چلے جاتے ہیں کئی گھنٹوں کے لیے اور پھر میں اپنی ساس کو فون کر کے فوراً" ان کی شکایت کر دیتی ہوں۔"

"نکاح اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے آپ کے؟"

"نکاح کے وقت تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ امی میرے پاس بیٹھی تھیں اور میں امی سے کہہ رہی تھی کہ آپ "ہاں" بول دیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دن مجھے بہت شدید بخار تھا اور جب تک شادی کی

ساری تیاری میں نے خود کی تھی تو میں بے انتہا تھک بھی گئی تھی۔ مہندی کے دن میرا نکاح ہوا تھا مجھے اتنی گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔"

"لباس کے معاملے میں بھی فرق ہے؟"

"پہلے دن کا عروسی جوڑا لال رنگ کا تھا جبکہ مجھے لال رنگ پسند نہیں تھا مگر میں نے اپنی نند کے اصرار پر بنوا لیا تھا۔ لیکن پہلے دن کا جوڑا بہت اچھا تھا۔ باقی جوڑے بھی میں نے اپنی پسند سے بنوائے تھے۔ ولیمہ کا گولڈن تھا۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصان؟"

"دونوں ہی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہے کہ جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ ویسے بیچلر لائف کا اپنا ہی مزا ہے جبکہ میرج لائف میں ذمہ داریوں کا بہت بوجھ ہوتا ہے۔ سب کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تو میں تو یہی کہوں گی کہ شادی ضرور کریں مگر ذرا لیٹ کریں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"منہ دکھائی میں ڈائمنڈ رنگ ملی تھی اور ہنی مون پورا پاکستان گھوم پھر کر منایا۔ میرے دو ولیمہ ہوئے تھے ایک کراچی میں اور ایک ایبٹ آباد میں۔ تو ہمارا ہنی مون بھی دو بار ہوا۔ ایک بار مری گئے اور ایک بار جب ولیمہ کے لیے ایبٹ آباد گئے تھے۔"

"رومانٹک مزاج کون ہے تم یا ارشد صاحب؟"

"یہ تو بالکل بھی رومانٹک مزاج نہیں ہیں۔" قہقہہ۔ "کوئی خاص اظہار نہیں کرتے جبکہ میں بہت رومانٹک مزاج ہوں۔ ارشد بہت سادہ مزاج ہیں۔"

"کوئی اچھی اور بری عادت۔ بچت کی عادت کس کو ہے؟"

"اچھی عادت یہ ہے کہ ماشاءاللہ صابر بہت ہیں۔ میرے ارد گرد کے سب دوست احباب تو یہی کہتے ہیں کہ تمہیں برداشت کر رہے ہیں اور بری عادت یہ کہ لیٹ آتے ہیں تو میں چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔ وہ اور بچت کی عادت تو میری گھٹی میں ہے۔ میرے خیال میں ایک اگر فضول خرچ ہو تو دوسرے کو لازمی سمجھ دار ہونا چاہیے۔"

"گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"بالکل۔ پہلے تو نہیں کرتے تھے یہ لیکن میں تو ضرور کرواتی ہوں اب۔ ابوبکر کے وقت مجھے مکمل بیڈ ریسٹ کہا گیا تھا تو سارے کام انہوں نے ہی کیے تھے۔ کیوں کہ ان کا بھی تو بچہ تھا اس لیے انہوں نے تو سارے کام خوشی خوشی کیے۔"

"جب ایبٹ آباد جاتے ہیں آپ دونوں تو یہ تو اپنی زبان میں بات کرتے ہوں گے تو آپ کی سمجھ میں آجاتی ہے؟"

"جی ہمیشہ ہندکو زبان میں بات کرتے ہیں۔ سمجھ میں تو آجاتی ہے مگر بولنے میں مجھے دشواری ہوتی ہے۔ ہندکو سے بہتر مجھے پنجابی لگتی ہے اور پنجابی میں بول لیتی ہوں۔"

"شام کو گھر آنے پر ساری دن کی روداد سناتی ہیں؟"

"SMS زندہ باد۔ سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ شام کا انتظار کون کرے اور میں سمجھتی ہوں کہ جو میں کر رہی ہوں بالکل صحیح کر رہی ہوں میں چپکوں۔ یہ بھا کر نہیں رکھ سکتی۔ مرد کے بالکل بھی نخرے نہیں اٹھانے چاہئیں پھر یہ خراب ہو جاتے ہیں۔ عورت کو نخرے اٹھوانے چاہئیں۔"

"آپ کہہ رہی تھیں کہ شادی جلد نہیں کرنی چاہیے تو آپ کے خیال میں لڑکے اور لڑکی کو کس عمر میں شادی کر لینی چاہیے؟"

"اب تو لوگ ذرا دیر سے شادی کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ دیر سے شادی نہیں کرنی چاہیے کہ پھر اولاد میں مسئلہ ہوتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ "ہائے یہ تو بڑھاپے کی اولاد ہے" تو جلدی شادی کر لیں تو بہتر ہے۔"



"اسلام میں۔۔؟"

"جی جی مجھے معلوم ہے اور میں انہیں کہہ بھی دیتی ہوں۔ یہ کہتے ہیں، تم کیسے ایسی ایسی باتیں سوچ لیتی ہو۔ کبھی کہتے ہیں۔ آج کون سا اسٹار پلس کا ڈراما دیکھ لیا تھا۔"

"ارشد صاحب کا کیا دل چاہتا ہے کہ آپ ہر وقت فٹ فاٹ رہا کریں؟"

"نہیں میں بالکل سیدھی سادھی ماسی ہی اچھی لگتی ہوں۔ اور میں عادی ہو گئی ہوں ان کی باتوں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت کا صحیح روپ سادگی میں ہی نظر آتا ہے۔"

"سالگرہ مناتی ہیں؟"

"بالکل۔ بچپن سے شوق ہے۔ برتھ ڈے بھی اور شادی کی سالگرہ بھی مناتی ہوں۔ شوق سے تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے خود لا لا کر دیتے تھے اب زبردستی لینا پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے تو یہ جو دیتے تھے لے لیتی تھی مگر شادی کے بعد اگر یہ ڈائمنڈ کا تحفہ نہ دیں تو بس پھر میری ان کی خوب لڑائی ہوتی ہے۔" قہقہہ۔ "اس بار انہوں نے "ایکس فور" لا کر دیا کہ بے شک اس کو بیچ کر تحفہ خرید لو مگر میں نے کہا کہ "ایکس فور" (موبائل) سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے۔"

"آپ کے ہاتھ کا کون سا کھانا پسند ہے؟"

"میرے ہاتھ کے پکے ہوئے سارے کھانے پسند ہیں۔ کیوں کہ میرے ہاتھ میں ذائقہ ہے اور وہ عورت ہی کیا کہ جس کے ہاتھ میں ذائقہ نہ ہو۔ میری ماں نے مجھے ہر کھانے میں پرفیکٹ کیا ہوا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس لڑکی کو اچھا کھانا پکانا نہ آتا ہو وہ اپنا گھر اچھے طریقے سے نہیں بسا سکتی۔ میری ساس میرے پکائے ہوئے کھانے بہت پسند کرتی ہیں اور جب میں سسرال جا کر پکاتی ہوں تو میری ساس اپنے آس پاس کے سب لوگوں کو بتاتی ہیں کہ یہ میری بہو نے پکایا ہے۔"

"آٹھ سال کی منگنی کے بعد جب شادی ہو گئی تو ارشد صاحب نے کمرے میں آکر پہلا جملہ کیا بولا تھا؟"

"یہ تو اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کمرے میں آتے ہی کلاہ اتار اور لیٹ گئے کہ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے اتنا عجیب لگا۔ میں نے دل میں کہا "آج تو کوئی اچھی بات کر لیتے" کوئی رومانٹک جملہ بول دیتے" قہقہہ۔ "اصل میں شادی کی ساری تیاری انہوں نے اکیلے کی۔ اس پہ بہت تھک چکے تھے تو میں نے بھی بے ساختہ کہہ دیا۔ کم سے کم اتنا ہی کہہ دیتے کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"امبر! بہت شکریہ اتنا اچھا انٹرویو دینے کا اور مصروفیات میں سے ٹائم نکالنے کا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم انٹرویو کا اختتام کیا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- [illegible]

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

دستک دستک دستک

شاہین رشید



مصطفیٰ چوہدری

"کیا حال ہیں۔ آپ کا پورا نام چوہدری محمد مصطفیٰ ہے' چوہدریوں والا رعب ہے؟"

"نہیں چوہدریوں والا رعب نہیں ہے اور رعب ہونا بری بات ہے اس لیے رعب نہیں ڈالتا۔"

"لوگ چوہدریوں کو بہت اونچی سمجھتے ہیں کہ جی ان کی تو زمینیں ہوں گی مزارعے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔"

"زمینیں تو ہماری ہیں اور کام کرنے والے بھی' مگر اللہ کا شکر ہے کہ ان پر رعب نہیں ڈالتے۔ کسی کو کمتر نہیں سمجھتے۔"

"آپ کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی خوب صورتی بڑی مشہور ہے۔ یہاں کراچی کیوں آئے اور کیا کشمیر آنا جانا لگا رہتا ہے؟"

"یہاں کیا کر رہا ہوں یا کیوں آیا تو جناب اللہ نے یہاں رزق باندھا ہوا ہے اس لیے اور کشمیر واقعی بہت خوب صورت ہے۔ آنا جانا رہتا ہے کیوں کہ وہاں ہمارے والد' بھائی اور دیگر رشتے دار' کزن وغیرہ ادھر ہی رہتے ہیں۔ سال میں ایک آدھ چکر تو ضرور لگتا ہے۔ میرے بیوی بچے اور گھر بھی ہے یہاں۔"

"اچھا۔ تو شوبز میں بھائی کی وجہ سے آئے؟"

"جی بھائی کی وجہ سے۔ مرتضیٰ (بھائی) نے ایک شو ڈیزائن کیا تھا "فور مین شو" اور یہ سیاسی طنز و مزاح کا شو تھا اس سے قبل میں نے آرٹ تھیٹر کیا بہروپ تھیٹر کے ساتھ تو جب یہ آئیڈیا مرتضیٰ کے ذہن میں آیا تو پھر سر جوڑ کر بیٹھے لکھا اور پیش کر دیا تو اور پھر اللہ کا کرم ہو گیا' سب کو بہت پسند آیا اور سلسلہ چل پڑا۔"

"کشمیر اپنا۔ پاکستان بھی اپنا۔ کبھی دل چاہا کہ دوسرے ملک جا کر رہوں؟"

"ارے نہیں۔ دوسرے ملک میں جاتا ضرور ہوں' وہاں کے قوانین سے متاثر بھی ہوتا ہوں' مگر وہاں کبھی رہنا نہیں چاہتا کیوں کہ مجھے اپنا ملک بہت پیارا ہے اور ہم خوامخواہ اپنے ملک کو انڈر اسٹیمیٹ کرتے ہیں اپنے ملک کا سفیر بن کے جاتا ہوں۔ ہمارے ملک کے لوگ گوروں سے زیادہ عقل مند ہیں۔ گزشتہ سال ایک ریسرچ ہوئی تھی امریکا میں امریکا کے بیشتر شہریوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے جھنڈے میں جو اسٹارز ہیں ان کا کیا مطلب ہے۔ ہمارے لوگ ان کو آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ اچھی بات ہے لیکن اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو کبھی بھی انڈر اسٹیمیٹ

نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں تو یہ کہوں گی کہ سب قوانین ڈنڈے کے زور پر ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگ جب ملک سے باہر جاتے ہیں تو قوانین کو فالو کرتے ہیں اور اپنے ملک میں بے لگام ہو جاتے ہیں کہ کوئی پکڑ دھکڑ اور جرمانہ نہیں ہے؟"

"جی یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ اپنی شخصیت کو کس طرح ڈیفائن کریں گے؟"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ پھر بھی۔ بہت اچھا لڑکا ہے یار۔ اتنا برا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔"

"اپنے پروگرام میں بہت سے لوگوں کی آپ نے پیروڈی کی۔ کوئی ناراض ہوا؟"

"دلچسپ بات بتاؤں ' ہم نے بہت سے سیاست دانوں کی پیروڈی کی مگر آج تک کوئی ناراض نہیں ہوا۔ اپنی پیروڈی انجوائے کرتے ہیں جبکہ ہمارے ٹی وی کے فنکار برا مان جاتے ہیں اور آپ کو یہ سن کر شاید حیرانی ہوگی کہ اکثر سیاست دان جب ہم سے ملتے ہیں تو بڑے پیار سے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں کہ "ہم تو آپ کے فین ہیں۔ اس وقت واقعی احساس ہوتا ہے کہ واقعی ان کا ظرف بہت بڑا ہے۔"

"کس کی پیروڈی ابھی تک نہیں کی اور کس کی بہت "ہٹ" گئی؟"

"کچھ چہرے ایسے ہیں جو میرے چہرے پر فٹ نہیں آتے یعنی جن کا میک اپ نہیں کر سکتا مگر ان کی آوازیں میں بہت اچھی نکال لیتا ہوں۔ ویسے دیکھا جائے تو کافی لوگوں کی پیروڈی کر چکا ہوں۔ اور کون سی ہٹ ہوئی تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یکسانیت کے ساتھ سب کو ہی پسند کیا گیا ہے۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا ایک فون نمبر تو آدھے پاکستان کے پاس ہے تو لوگ تنگ تو بہت کرتے ہوں گے؟"

"جی کافی لوگوں کے فون آتے ہیں مگر سچی بات ہے کہ میں تنگ بالکل بھی نہیں ہوتا کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ہمیں کچھ سمجھتا ہے تو ہمیں فون کرتا ہے۔ میں دوسروں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ تنگ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"بالکل۔ لڑکیوں کے بھی آتے ہوں گے؟ کیسا لگتا ہے؟ اور شادی اپنی پسند سے کریں گے؟"

قہقہہ۔ "جی بالکل لڑکیوں کے بھی فون آتے ہیں اور بس ٹھیک ہی لگتا ہے۔ شادی تو ویسے ارینج ہوگی والدین کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔"

"آگے کا سوچ کیا ہے؟"

"بہت کچھ سوچا ہوا ہے۔ کچھ چیزیں ہیں دماغ میں جو کرنی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل شاہ بچہ کے ساتھ پروڈکشن ہاؤس بنایا ہے تو ان شاء اللہ اس کے تحت کام کریں گے اور "شاہ بچہ پروڈکشن ہاؤس" کہلائے گا۔"

"کون سے چینلز شوق سے دیکھتے ہیں؟"

"مجھے نیوز چینلز بہت پسند ہیں اور انٹرٹینمنٹ چینلز بھی شوق سے دیکھتا ہوں مگر پسندیدہ ترین چینل نیشنل جیوگرافک ہے ڈسکوری ٹائپ کے چینلز بہت پسند ہیں۔"

"آج کل لوگوں کا بہترین مشغلہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہمارے یہاں کے لوگوں کا بہترین مشغلہ فضول باتوں میں وقت ضائع کرنا ہے۔ ہم پریکٹیکل گراؤنڈ میں کچھ نہیں کرتے اور اپنے آپ کو معتبر بنانے کے چکر میں ہی رہتے ہیں۔ ملک کی ترقی باتوں سے نہیں کچھ کر کے دکھانے سے ہوتی ہے۔"

شبنم ثانی

"کیسی ہیں آپ فیس بک پہ تو خوب ملاقات رہتی ہے۔ سوچا آج کچھ آپ کے ڈرامے کے حوالے سے بھی بات کر لیں۔ کیا خیال ہے؟"

"جی جی بالکل۔"

"یہ آپ کا پہلا سیریل ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے اور سمیع ثانی صاحب تو نوجوانی سے اس فیلڈ میں ہیں۔ آپ کیوں دیر سے آئیں؟"

"جی یہ میرا پہلا سیریل ہے اور رسپانس حیرت انگیز طور پر بہت اچھا آرہا ہے۔ بہت حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ سب سے زیادہ تو میاں صاحب نے کی ہے اور مجھے تو ابھی بھی شاید اس فیلڈ میں آنے کا خیال نہ آتا اور نہ ہی میرا ایسا کچھ ارادہ تھا، لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ روبینہ اشرف۔ جو اس سیریل کی ڈائریکٹر ہیں۔ ان سے میری بیس سال پرانی دوستی ہے' بالکل بہنوں جیسی۔ تو اس سیریل میں کام کرنے کا انہوں نے ہی کہا بلکہ اصرار کیا اور ان کا کہنا کیسے ٹل سکتی تھی۔ انہیں پورا بھروسا تھا کہ میں یہ رول کرلوں گی۔"

"اور آپ نے ان کے بھروسے کو پورا کیا؟"

"بہت شکر گزار ہوں اپنے رب کی کہ اس نے عزت رکھ لی ہے اور میں کسی حد تک ان کے معیار پر پوری اتری ہوں' ورنہ روبینہ اشرف جیسی اچھی ڈائریکٹر کسی بات پر خاص طور پر اداکاری کے معاملے میں کمپرومائز کرنے والی خاتون نہیں ہیں اور مجھ پر یہ بھاری ذمہ داری تھی کہ اپنے نام سے جڑے دو ناموں کو میں شرمندہ نہیں ہونے دوں۔ ان میں ایک نام روبینہ اشرف کا اور دوسرا میرے اپنے میاں صاحب کا تھا دونوں ہی نامور ہیں۔"

"اچھا لگ رہا ہے اور کہیں مشکل ہوئی؟"

"بہت اچھا لگ رہا ہے لوگ خوب تعریف کررہے ہیں اور مشکل بھلا کیسے پیش آسکتی تھی۔ سیٹ پر میرا بہت خیال رکھا جاتا تھا کیوں کہ روبینہ جانتی تھیں کہ میں ان مشکلات کو سہنے کی عادی نہیں ہیں جو ایک ریگولر فنکار کو فیس کرنا پڑتی ہیں اس لیے سب کچھ بہت آرام سے ہو گیا۔"

"بہت بڑی بچی دکھائی گئی ہیں۔ آپ اصل زندگی میں بچی نہیں ہیں لیکن اگر ہوتیں تو؟"

"اگر اصل میں بچی ہوتی تو ہرگز ایسی نہ ہوتی۔ اصل میں مجھے شروع میں یہ رول کرتے وقت بہت الجھن ہوئی کہ یہ میری نیچر سے الٹ تھا پھر سمیع نے سمجھایا کہ ایکٹنگ اسی کو کہتے ہیں اور آپ کی کامیابی اسی میں ہے کہ لوگ آپ کو اس رول میں قبول کرلیں بس پھر میں نے اور کچھ نہیں سوچا اور اس رول کو اپنے اوپر طاری کرلیا۔ اس لیے سب کو نیچرل لگ رہا ہے۔"

"مزید آفرز آئیں؟"

"آفرز تو پہلی قسط آن ائیر ہونے سے پہلے ہی آنا شروع ہو گئی تھیں کیوں کہ کئی لوگوں نے مجھے سیٹ پر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک سوپ میں کام کرنے کی حامی بھی بھرلی تھی اور ایک دن ریکارڈنگ بھی شروع کروادی تھی' مگر بہت لمبا کام تھا' اس لیے پھر چھوڑ دیا۔"

"تو بس یہ پہلا آخری اور پہلا سیریل ہوگا؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے' لیکن چونکہ زیادہ ٹائم نہیں دے پاؤں گی تو اس لیے سیریل کروں گی سوچ سمجھ کر۔"

"کیسے رول کریں گی؟"

"بہت سوچ سمجھ کرلوں گی۔ ایسے رول نہیں کروں گی کہ گھر والے دیکھ کر شرمندہ ہوجائیں؟"

"بچے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"بچوں میں دوسرے نمبر والا بیٹا ایک سوپ میں آرہا ہے' جو سمیع نے ہی ڈائریکٹ کیا ہے۔ باقی اپنی پڑھائیوں میں مصروف ہیں۔ ویسے اس کام میں ٹائم بہت لگتا ہے' اس لیے اگر بچے آئے بھی تو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی آئیں گے۔"

"آپ اچھی خاصی اسمارٹ ہوا کرتی تھیں مگر اب؟"

قہقہہ۔ "بھئی اس کے لیے تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ "کبھی ہم بھی خوب صورت تھے" مگر کیا موٹے لوگ انسان نہیں ہوتے؟ ویسے موٹے ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بس عقل موٹی نہیں ہونی چاہیے۔"

قہقہہ۔ "اصل میں لوگ موٹے لوگوں کا اتنا مذاق بناتے ہیں کہ بیچارہ موٹا بندہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ اس کو اپنا جرم سمجھنا شروع ہوجاتے ہیں۔"

"آج کل کے ڈراموں کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"ضرور۔ ہمارے ڈرامے ریٹنگ کے چکر میں اپنی روایات کو بھول چکے ہیں' ہر کوئی خود کو رائٹر اور ڈائریکٹر سمجھ بیٹھا ہے۔ پروڈیوسر اور چینل کی خواہش پوری کرنے کے لیے اندھی دوڑ کا حصہ بن گیا ہے۔ ڈائریکٹر اور رائٹر پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کو سمجھیں اور اپنے ڈراموں کو ریٹنگ کے چکر میں برباد نہ کریں۔"

گلزار حسین (شیف)

"کیا حال ہیں جی اور کیسی چل رہی ہے آپ کی کوکنگ آپ کی جاب؟"

"الحمد اللہ بالکل ٹھیک۔ اور جاب' کوکنگ دونوں پرفیکٹ چل رہی ہیں۔"

"میری نظر میں تو ہر پروفیشن اہم ہے' مگر میں نے دیکھا ہے کہ دو تین پروفیشن ایسے ہیں' جس پر لوگ منہ بناتے ہیں ایک نرسنگ ایک درزی اور ایک شیف کا۔ ایسا ہے نا؟"

"جی بالکل ایسا ہے۔ ہمارے ملک میں شیف کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب لوگ ہر پروفیشن کو اہمیت دینے لگے خواہ نرسنگ ہو' یا ٹیلرنگ اب' تو ہم جہاں جاتے ہیں' ہماری بہت عزت ہوتی ہے۔ لوگ ساصرار بلا بھی لیتے ہیں۔"

"بعض شوق بچپن سے ہی پروان چڑھتے ہیں تو کیا آپ کا شوق بھی؟"

"کچھ ایسا ہی تھا ۔۔۔ یہ شعبہ مجھے اپنی طرف کھینچتا ضرور تھا۔ چنانچہ گریجویشن کے بعد میں شیف کی ٹریننگ لینے کے لیے جاپان چلا گیا۔ مختلف کورسز کیے' ٹریننگ لی اور پھر تھائی لینڈ جا کر بھی ٹریننگ لی تاکہ کانٹی نینٹل کھانے پکانے بھی آجائیں۔"

"پھر پاکستان آئے یا وہیں کے لوگوں کو فیض یاب کیا؟"

"وہیں جاپان میں ہی جاب کرلی اور پھر وہیں ہی ایک لڑکی کو مسلمان کرکے شادی بھی کرلی۔"

"کتنا عرصہ ملک سے باہر رہے۔ پھر پاکستان آنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟"

" 1991ء سے 2005ء تک وہاں رہا۔ 2005ء میں پاکستان آیا اور خیال کیسے آیا تو بس اپنا ملک ہے' جب محبت جاگ اٹھے' آجانا چاہیے اور میں پاکستان آکر بہت خوش ہوں۔"

"پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟"

"پیسہ ۔۔۔؟ اتنی پیسہ ہی پیسہ ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ ہماری تنخواہ کئی پروفیشنل لوگوں سے زیادہ ہے۔ بس اللہ کا ہم پر بڑا کرم ہے۔"

"مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ کھانے پکانے کا شعبہ خواتین کا کہلاتا ہے' مگر میدان مرد حضرات مار لیتے ہیں ۔۔۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ مرد حضرات اس کام کو باقاعدہ سیکھتے ہیں پروفیشن کے طور پر' اس لیے وہ کامیاب ہیں اور اس لیے وہ بڑے بڑے ہوٹلز اور ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہیں۔"

"آپ نے کہا کہ اس فیلڈ میں بہت پیسہ ہے۔ تو کیا نوجوان اس طرف آرہے ہیں یا شرم کا مسئلہ ہے؟"

"نہیں نہیں ۔۔۔ کوئی شرم کا مسئلہ نہیں ہے اب تو کافی تعداد میں لوگ بلکہ نوجوان آرہے ہیں اور بہت محنت کے ساتھ کام کرتے ہیں کیوں کہ اب تو یہ باقاعدہ پروفیشن بن گیا ہے۔"

"آپ دنیا کو کوکنگ سکھاتے ہیں کیا بیگم کو بھی آپ نے ہی سکھائی ہے کوکنگ؟"

"نہیں' انہوں نے بھی وہیں سے ٹریننگ لی جہاں سے میں نے لی ہے۔ جاپان کے جس ٹریننگ سینٹر سے میں نے کورسز کیے' وہیں میری مسز بھی کورس کررہی تھیں۔ مجھے پسند آئیں اور میں نے ان کو مسلمان کرکے شادی کرلی اور اسلامی نام روبینہ رکھا۔ 1994ء میں ہماری شادی ہوئی۔ ہماری ایک بیٹی ہے۔"

"گھر کی ساری ذمہ داری بیگم کے سر ہے۔ کوکنگ بھی بیگم ہی کرتی ہیں اور بہت شاندار کھانا پکاتی ہیں۔"

"ہوں ۔۔۔ گڈ۔"





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو اور ہمارے پیارے وطن کو سلامت رکھے۔ آمین

پچھلے ماہ نایاب نے اپنے بھائی کی رہائی کے بارے میں لکھا تھا۔ اس ماہ موصول ہونے والے تمام خطوط میں قارئین نایاب کے بھائی کی رہائی پر خوشی کا اظہار کیا اور ان کے والدین کو بیٹے کے ملن پر مبارک باد دی ہے۔
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
ہم ان سطور کے ذریعے نایاب جیلانی تک آپ کی مبارک باد پہنچا رہے ہیں۔ نایاب جیلانی آپ کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔
پہلا خط جڑانوالہ سے کوثر خالد کا ہے۔ لکھتی ہیں۔

ایک مسئلہ تو گھر میں ہوا اگر دوسرے کا تعلق تو آپ سے ہے۔ چونکہ پچھلے دو ماہ سے آپ نے تعلق توڑ رکھا ہے۔ تمام رسالہ اس بار بہت اچھا ہے۔ جو کہ میرے ساتھ بیٹھ کو بھی پسند آیا۔ مگر مجھے دل سے کیا تعریف کریں "پیارے نبی" میں اس بار کافی موضوع تھے۔ الحمد للہ ہم نے کبھی استخارہ تو کیا کسی سے باقاعدہ دعا بھی نہیں کروائی۔ صرف اس لیے کہ ہم اپنا ہر کام خود ہی کرنا چاہتے ہیں۔

"خط آپ کے" پڑھ کر بہت اداس ہو گئے کہ ہم شامل محفل نہ تھے "اک تھی مثال" کبھی تو اسے بھی اپنے حصے کی خوشیاں ضرور ملیں گی۔ "صنم سے صمد تک" نام ہی سے کہانی کی سمجھ آ گئی۔ مگر تنزیلہ ریاض کا قلم اور پس منظر میں جھلکتی ان کی شخصیت سے ہم بہت مرعوب ہیں۔ تک تک لگا کر تھک گئے۔ "بت شکن" اختتام پذیر ہوئی۔ اچھی اینڈنگ۔ امایہ جذبات کی ملکہ ہیں۔ ایسی امایہ ناز کوشش پر ہاتھ چومنے کو دل چاہا۔ "کمہاری کا گھر" موضوع نہایت اعلا تحریر تھی۔ "عالم آرائیت" "سمیرا احمد" ہوں یا سائرہ رضا، نبیلہ گو کہ سب ہی ان پر۔ تعریف کے لیے الفاظ میسر نہیں۔

"عنیزہ سید" "انتہا ہو گئی خود غرضی کی۔۔۔ نبیلہ کو دیا بھی کیا جا سکتا ہے۔" "من پسند" "شکر ہے جلد ہی عقل آ گئی بیٹا صاحب کو۔" "صفائی پسند" "ارے آپ نے تو مجھے میرا ماضی یاد دلا دیا۔ بھئی آخر سال سے وہاں تک ہماری صفائی فروا کی طرح مشہور تھی۔ خالہ جیسی تو واقعی توبہ۔ مگر اتنا چور کو توال کو ڈانٹے والا معاملہ تھا۔ ہم ڈانٹنے میں پہل کسی معاملے میں بھی نہیں کر سکتے۔ مگر ہماری دروج اتنی لمبی ہوتی ہے کہ خدا پناہ کسی کو بھی ہم غلطیاں شروع کرنے کا حق کبھی نہیں دیتے۔ خط لکھنے سے پہلے دوسرا مسئلہ کچھ ایسا ہی تھا۔

"پرندے" اک سادہ سی پر سبق تحریر تھی۔ خدا گواہ ہم تو اسی آزادی سے رہتے ہیں۔ "شعاع" کا ساتھ بڑا مزے کا تھا اور شعر تو ہمارا عزیز از جان۔
"ٹلنے کی گھڑی" "نایاب جیلانی آپ نے تو دھڑکنیں ہی روک دیں۔ معلوم نہ تھا آپ کے ساتھ ایسا سانحہ ہوا ورنہ ہم بھی شریک دعا رہتے۔
"تاریخ کے جھروکے" "اُف کیا شعر۔۔۔ توبہ ہی بھلی۔
اب اجازت۔ توبہ کے ورد کے ساتھ ہم رات کا کھانا گھر والوں کو کھلا لیں۔ ورنہ ہمیں بہت بد دعائیں ملیں گی بھوکے پیٹوں کی۔ آج ہم نے بیسن بھرے کریلے پکائے ہیں۔ کیا آپ کھانا پسند فرمائیں گی؟

پیاری کوثر! آپ کھلائیں گی تو ضرور کھائیں گے۔ قیمہ بھرے کریلے ' چنے کی دال بھرے کریلے تو ہم نے بھی کھائے ہیں لیکن بیسن بھرے کریلے اس ڈش کا نام پہلی بار سنا ہے۔ آئندہ خط میں اس ڈش کی ترکیب ضرور لکھیے گا۔

آپ کے پچھلے خط لیٹ موصول ہونے کے باعث شامل نہ ہو سکے۔ کراچی میں کسی بھی وقت ہڑتال ہو سکتی ہے جس کی بنا پر ڈاک کا سلسلہ بھی گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ آپ نے کیا ہم اپنے کسی بھی قاری سے تعلق نہیں توڑ سکتے' آپ کو ٹینشن ہوئی' اس کے لیے معذرت۔ دوسرے مسئلے کے بارے میں تو آپ نے بتایا ہی نہیں ویسے آپ جتنی سمجھ دار ہیں ہمیں یقین ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی مسئلہ ہو بھی تو زیادہ دیر نہیں رہے گا۔ آپ حل کرلیں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

انیلہ بتول اور الوین فاطمہ نے ملتان کے گاؤں W.B/22 سے لکھا ہے

ناول کی بات کی جائے تو مجھے اس کی ورڈنگ زیادہ زبردست لگی اور کہانیاں ان کی تو آپ بات نہ کریں اتنی اچھی ہر دفعہ منفرد اور دلچسپ۔ کنیز نبوی کو دیکھ کر دیا خوشی سے ناچنے کو جی چاہتا تھا لیکن نمرہ احمد کو نہ دیکھ کر تھوڑی مایوسی ہوئی۔ "ایک تھی مثال" میرا فیورٹ ناول ہے رخسانہ نگار عدنان بہت خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں' کماری کا گھر بھی اچھا ناولٹ تھا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ مجھے کرن' شعاع بہت اچھا سلسلہ لگتا ہے۔ کنیز نبوی کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شائع کریں۔

انیلا اور الوین! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کنیز نبوی کا انٹرویو تو ضرور دیں گے لیکن تصویر کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ کنیز نبوی سید ہیں اور شرعی پردہ کرتی ہیں۔ اس لیے وہ تصویر شائع نہیں کرائیں گی۔

ثمینہ اکرم نے بہار کالونی کراچی سے لکھا ہے

ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ماڈل کا جدید اسٹائل کا کیا زبردست سوٹ پہنا ہے ماڈل نے — ہر چیز بالکل پرفیکٹ — اس ماہ کا نہ صرف ٹائٹل زبردست لگا بلکہ پورا رسالہ ہی بہترین تحاریر سے آراستہ نظر آیا۔ ناولٹ' افسانے اور مکمل ناول ایک سے بڑھ کر ایک۔

بہترین افسانہ سمیرا حمید کا "عالم لاہوت" رہا۔ جو عشق حقیقی اور عشق مجازی کی عملی تفسیر نظر آیا۔

دوسرا افسانہ "پرندے" قرۃ العین کا اچھا لگا۔ یہ افسانہ بھی بہت بامعنی اور پر مقصد لگا۔

شہزادی عباس خلجی کے ناول میں گو کہ اس کی کہانی اتنی نئی نہ تھی۔ پھر بھی جدید انداز بیان نے اسے انفرادیت بخشی۔ "ایک تھی مثال" میں اب دکھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ناولٹ "کماری کا گھر" اس مرتبہ بازی لے گیا۔ اس میں حمدان کا کردار مجھے بہت زہر لگا۔

"شعاع کے ساتھ" میں ثوبیہ نور کا دلچسپ احوال پڑھا۔ "تاریخ کے جھروکوں میں" انوکھا شہر کا عجیب و غریب احوال پڑھ کر حیران رہ گئی۔ امتل کی آخر میں کتاب کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ ناولٹ "بت شکن" پہلی قسط سے آخری قسط تک میری توجہ حاصل کیے رہا۔ ویلڈن — امایہ خدیجہ نازنین جیسی خود پرست عورت اپنے انجام کو پہنچی۔ نایاب جیلانی آپ کو اپنے بھائی سے ملنے کی گھڑی بہت بہت مبارک ہو۔ وارشاد کی رہائی کے لیے دعا کرنے والوں میں میرے ہاتھ بھی شامل تھے۔

"بند مٹھی" میں شادی کا احوال پڑھ کر یاد آیا کہ میں تو خرابی طبیعت کی وجہ سے فائزہ عباس کی شادی کا احوال لکھ ہی نہیں پائی۔ اب کیا میں لیٹ ہونے کے باوجود یہ احوال بھیج سکتی ہوں۔

پیاری ثمینہ! حسب معمول شعاع پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ فائزہ کی شادی کا احوال ضرور بھجوائیں۔

حرا قریشی ملتان سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

تصحیح کیجیے حمد پر نعت اور نعت پر حمد کا عنوان لکھا دیکھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کچھ دیر کے لیے اسی جگہ' اسی دور میں پہنچ گئے ہوں — زاد راہ میں کیا خوب صورت دعائیں تھیں بے اختیار سبحان اللہ کہا۔ استخارہ کے بارے تفصیل پڑھ کر دماغ کی کھڑکیاں جن میں مشعل نمناک ہو گئیں "کہیں نہ جائے" پڑھ کر دبی دبی خواہش پھر سے انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئیں۔ تو جناب عزیز شعاع ہمیں بھی تبصرہ کرنے کا موقع فراہم کیجیے۔

ایک ہیرا پیکر مصنف کی تحریروں پر عمدہ تبصرہ تھا یہ آمنہ زریں کا۔ "بند مٹھی" میں فائق اور ثانیہ کی گفتگو سے بھی

اضافت کشید کی۔ خطوط میں تفصیلی تبصرے ذوق و شوق سے پڑھے۔ سب سے پہلے سمیرا حمید کا افسانہ پڑھا جو کہ تھا بھی اول نمبر پر "عالم لاہوت" پڑھ کر کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے۔ "خود غرض" کلفایا "حقیقت بیان کرتی چھوٹی سی تحریر تھی۔ "کمہاری کا گھر" میں پرواے اس قدر ریزولی کی توقع نہ تھی۔ "من پسند" "اگر ہم رب ذوالجلال کی پسند پر قانع ہو جائیں تو ہماری پسند ہمارے تابع فرمان ہو جائے۔" "صفائی پسند" بھی مورل بیسڈ سٹوری تھی۔ "شعاع کے ساتھ" میں تسلسل کے ساتھ مزاح بھی بانکا پیاکا نمایاں تھا۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ "اولی امید کا ستارہ ہے" "ایک ایسی تحریر ہے پڑھ کر ذہن کے دریچے پر کئی سوال براجمان ہو گئے۔" ثانیہ نے کچھ لیے زندگی کی نوید دے کر مدثر کو تنہا کیوں کر دیا؟" فیند اگر علی کو چاہتا تھا تو شادی ضروری تو نہیں تھی" مائیں تو گھر سنوارتی ہیں پھر ثانیہ کی ماں نے اسے ایسے مشورے کیوں دیے؟ "بہت خوب صورت بات "پرندے" میں کی گئی۔ "تیرے سنگ حسین ہے رہ گزر" جسے پڑھ کر من و سلویٰ یاد آ گئی۔ ویل ڈن شہزادی صاحبہ "صنم سے صمد تک" "کنیز نبوی کا اسم خاص دیکھ کر دل مسرت سے اچھلنے لگا۔ ہم متجسس ہیں کہ حمیرا کی آگے کیا پلاننگ ہے" اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

پیاری حرا! بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں آپ مگر صفحات کی مجبوری ہوتی ہے اس لیے ذرا تبصرہ شائع نہیں کر سکتے کیونکہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہنوں کے خطوط شامل کیے جائیں۔ چھوٹے شہروں میں اور دیہات میں خط پوسٹ کرنے میں جتنی دشواری پیش آتی ہے اور جب ان کے خط شامل نہیں ہوتے تو جتنی تکلیف انہیں ہوتی ہے' اس سے بچھ کر ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ حرا آپ افسانوں پر توجہ دیں۔ کوئی اچھی کہانی اپنے ارد گرد تلاش کریں اور اسے الفاظ کا جامہ پہنائیں کیونکہ آپ لفظ پر قادر ہیں۔

نگہت نورین عطاء اللہ نے محلہ دین پورہ سیالکوٹ سے لکھا ہے

جون کا شمارہ ہاتھ میں آیا۔۔۔ یہ کیا اتنا برا ٹائٹل۔۔۔ (معذرت کے ساتھ) نبیلہ عزیز نے قسط کیوں نہ لکھی "بہت شکن سا" واہ بھئی واہ مزہ آ گیا۔ لائبہ جی اب خاموشی اختیار نہیں کرنی کنیز نبوی۔ "صنم سے صمد تک" اچھا تھا۔ مطلب بتا دیں؟ باقی اختتام پر! امیرا جی ویل ڈن اتنے انوکھے کردار کہاں سے لے آتی ہیں آپ......

"عام زندگی۔۔۔ عام خوشیاں۔۔۔ عام دکھ۔۔۔ درد دل زندگی کا مزہ عام ہونے میں ہے۔" یہ تنزیلہ ریاض کے کس ناول کی لائن ہے ضرور بتائیں۔ ابا کافی سخت ہیں۔ مگر پھر بھی پڑھنے دیتے ہیں۔ امام مسجد ہیں میرے ابا! مجھے فخر ہے۔

کنیز نبوی' سائرہ رضا' عنیزہ سید اور تنزیلہ ریاض کا تعلق کہاں سے ہے اور یہ بھی بتائیں کہ سیالکوٹ سے کوئی مصنف تعلق رکھتی ہیں کہ نہیں!

نگہت! معذرت خواہ ہیں آپ کو ٹائٹل پسند نہیں آیا' صرف ایک سطر پڑھ کر ناولوں کے بارے میں بتانا بہت مشکل ہے۔ اگر کسی قاری بہن نے یہ کمال کر دکھایا تو ضرور شائع کریں گے۔ ناولوں کی لسٹ تو پرچے میں کئی بار شائع ہو چکی ہے شاید آپ نے نوٹ نہیں کیا۔ صنم ہٹ کو کہتے ہیں اور صمد اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اس قسط میں وضاحت بھی ہے۔ عنیزہ سید کا تعلق ڈسکہ سیالکوٹ سے ہے۔ کنیز نبوی سندھ سے' سائرہ رضا کراچی سے اور تنزیلہ کا تعلق اوکاڑہ سے تھا۔ اب شادی کے بعد بحرین میں ہوتی ہیں۔

صائمہ مشتاق احمد حافظ آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

سیکنڈ ایئر میں تھی جب آخری بار آپ کو لکھا تھا۔ اب ماسٹرز کیے بھی چھ ماہ ہو گئے ہیں۔

سرورق میں ماڈل کے کپڑے تو خوبصورت تھے مگر ماڈل کا انداز بہت نامناسب لگا۔ شمارہ بہت اچھا تھا۔ سائرہ رضا اور سمیرا حمید نئی لکھنے والوں میں سے میری موسٹ فیورٹ رائٹرز ہیں۔ ان کی وجہ سے پرانی رائٹرز کی یاد بھی اب کم آتی ہے۔ "بہت شکن" کی تو کیا ہی بات ہے۔ لائبہ خان نے بھرپور انصاف کیا۔ امید ہے لائبہ یونہی بغیر وقفے کے اچھے اچھے کرداروں اور کہانیوں سے ہمیں محظوظ کرتی رہیں گی۔ سدرۃ المنتہیٰ اور روجیبہ احمد کے ناولٹ بھی بے حد اچھے تھے۔ "صفائی پسند" کے شروع کے دو صفحات پڑھ کے تو مجھے بے ساختہ شازی باجی کی یاد آتی رہی۔

افسانوں میں سمیرا حمید کا "عالم لاہوت" نمبر لے گیا۔ شہزادی عباس کی کہانی کا مرکزی خیال پرانا مگر انداز نیا تھا۔

ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ لڑکا بچپن کی محبت کو لمحوں میں بھول کر نئے راستوں کو کھوجنے نکل پڑتا ہے اور لڑکی اس کی مالا جپتی رہتی ہے۔ لڑکی ایسے ہرجائی کو قبول ہی کیوں کرتی ہے؟

بیاری

صائمہ! ایک طویل عرصے کی خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی پر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اتنی طویل خاموشی کیوں؟

اس میں شک نہیں کہ نئی مصنفین بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن پرانی مصنفین کی اپنی جگہ ہے اور قارئین کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے ہیروئن ہرجائی ہیرو کو کیوں قبول کر لیتی ہے تو غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ صبح کا بھولا شام کو آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ پھر کچھ معاملے دل کے بھی ہوتے ہیں۔ جو دل کو عزیز ہوتے ہیں ———— دل ان کی غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔

گکھڑ نروال شریف سرائے عالمگیر سے شازیہ قیصر تشریف لائی ہیں

شادی سے پہلے بھائی "امی رسالہ لا کر دیتے تھے اور اب قیصر کے بغیر ہی لاتے ہیں۔

"رقص بسمل" نے پاکر بڑی اپیری ہو لیا"ایک تھی مثال" میں مثال پر بہت ترس آیا۔ تحسین مزید اچھا ناول تھا۔ "بت شکن" ایک زبردست ہواٹ انتظام کو پہنچا۔ امایہ خان کو مبارک باد "گھر سارہ کا گھر" بھی اچھا تھا معذرت کے ساتھ "عالم لازوال" "میری کچھ میں نہیں آیا۔

"تاریخ کے جھروکے" اپنا پسندیدہ سلسلہ پڑھا تو اس بادشاہ کی قبر پر جوتے مارنے کی خواہش کو بڑی مشکل سے دبایا۔ ثانیہ سعید میری فیورٹ ایکٹرز ان کو پڑھ کر بڑا اچھا لگا۔ شعاع کے سارے ہی سلسلے اچھے ہیں آپ سے ایک ریکویسٹ ہے کہ رسالے میں ایک مزاحیہ تحریر ضرور شامل کیا کریں۔

شازیہ اچھا ہوا آپ نے وضاحت کر دی ورنہ ہم نے بھی آپ کے شوہر کا نام قیصری لکھنا تھا ویسے قیصر نام پہلی بار سنا ہے۔ ہماری اکثر قارئین یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کے والدین یا شوہر انہیں رسالے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں

ہے بلکہ آپ کے شوہر خود لا کر دیتے ہیں۔

مزاحیہ تحریریں ہمیں بھی پسند ہیں اور ہماری بھی خواہش ہوتی ہے کہ ہر ماہ کم از کم ایک مزاحیہ ہلکی پھلکی تحریر ضرور شامل ہو۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

روما شہزادی ثمن وقاص عقیلہ قمر قاسم ڈیونہ منڈی گجرات سے لکھتی ہیں

اس دفعہ ٹائٹل ذرا بھی اچھا نہیں تھا۔ رقص بسمل ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس میں مادر اکی ماں اور رضا حیدر کا کیا رشتہ ہے "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا ہے۔ ہمارا دل کرتا ہے کہ بشریٰ اور عدیل جیسے ماں باپ کو کوئی مار دے۔ نمایہ خان کا ناول "بت شکن" بھی زبردست تھا ہم تینوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس کی ٹیچرز ہیں۔ اسکول کا نام الفلاح اکیڈمی ہائیر سیکنڈری اسکول ڈیونہ منڈی گجرات ہے۔

پیاری روما ثمن عقیلہ قمرا شعاع کی بزم میں خوش آمدید آپ تینوں علم کی روشنی پھیلا رہی ہیں' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر نیک نیتی اور فرض شناسی کے جذبے سے ٹیچرز استاد اپنے فرائض انجام دیں تو قوم کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ کسی طالب علم کی خفیہ صلاحیتوں کو پہچاننا انہیں آگے بڑھانے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی' ان کی اخلاقی تربیت اور صحیح سمت کی طرف رہنمائی ایک استاد کے فرائض میں شامل ہے۔ ہمارے کہنے سے رہنمائی سے ایک استاد کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ نبیلہ عزیز ناسازی طبع کے باعث قسط نہ لکھ سکیں۔

کائنات اصغر بوزدار نے ڈہرکی سے لکھا ہے

بلکے پھلکے ٹائٹل نے من تک شانت کر دیا۔ لیکن ماڈل کو دوپٹا پھیلا کر لینا چاہیے تھا۔ حمد و نعت کو پڑھنے کے بعد تھوڑا آگے بڑھے تو "بند حصن" میں فائق اور ان کی مسز کا دوبارہ انٹرویو دیکھ کر غصہ آیا کیونکہ پہلے انٹرویو کو ابھی اتنا عرصہ تو نہیں گزرا۔ نایاب آپی! اس خوشی کے موقع پر آپ ہمارے لیے ایک زبردست ناول لکھیں۔ سمیرا حمید آپ کے لیے بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ آپ چھوٹی سائرہ رضا ہیں' جو ہر موضوع پر لکھتا جانتی ہیں۔ "لمہاری کا گھر" ویل ڈن وجیہہ احمد آپ نے زبردست اسٹوری لکھی۔ وشنگ میں ثانیہ سعید سے مل کر اچھا لگا کیونکہ "تی ازپریتی اینڈ گریس فل لیڈی" "امید کا ستارہ" "سدرۃ المنتہیٰ نے زبردست لکھا۔ مکمل ناول دونوں نہیں پڑھے کیونکہ کنیز نبوی کو تو فرصت میں پڑھوں گی اور اگلے ماہ اکٹھے دونوں اقساط پر تبصرہ کروں گی۔

دوسرا یہ کہ امہ اور اریشہ تو ابھی فقط میٹرک اور آٹھویں جماعت کی اسٹوڈنٹ ہیں پھر بھلا عاصمہ اور واثق کو ان کی شادی کی فکر کیوں ہے۔ "شاعری بچ بولتی ہے" سلسلہ ختم ہو گیا کیا؟ اور ہاں آپ سے پوچھنا ہے کہ وشنگ وغیرہ میں آپ صرف چینلز کے ایکٹرسے انٹرویو لیتی ہیں "تاریخ کے جھروکے" میں محمود غزنوی اور بہادر شاہ ظفر کو بھی سامنے لائیں۔ "شادی مبارک" بشریٰ گوندل کے احوال نے عجیب حالت کر دی کیونکہ اس گرمی میں تو مجھے بیوی بیچاری پھر اری میک اپ کھانے اور زیادہ رش کا سوچ کر ہی الجھن ہونے لگی۔ جون اور جولائی میں شادیوں کا احوال بالکل بھی نہ دیا کریں۔

پیاری کائنات! آپ تو شادی کا احوال پڑھ کر ہی گھبرا گئیں۔ ذرا سوچیں جن کی شادی ہوتی ہے اور جو شادیوں میں شرکت کرتے ہیں' ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ شادی کب اور کس کے ساتھ لکھی ہے تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اب اگر مئی جون میں ہی شادی لکھی ہو تو کیا کیا جائے۔

رخسانہ نگار کے ناول میں اسیہ' اریشہ چھوٹی ہیں لیکن لڑکیوں کو بڑے ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اس لیے فکر تو ہونا ہی چاہیے۔ شاعری بچ بولتی ہے کا سلسلہ بند نہیں کیا گیا ہے۔ صفحات کی کمی آڑے آجاتی ہے۔ راحت جبیں اور فائزہ افتخار دونوں چینلز پر مصروف ہیں اس لیے آپ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے قاصر ہیں اس ماہ کنیز نبوی کے ناول کی دوسری اور آخری قسط شائع کی جا رہی ہے' پڑھ کر اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

سعدیہ سحر قریشی ضلع بہاول نگر سے لکھتی ہیں

اس بار سارا شعاع لاجواب سب ناول اور ناولٹ ایک سے بڑھ کر ایک۔ افسانے ابھی پڑھے نہیں لیکن ایک



خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے [illegible] ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2014ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "نیکیوں کا موسم بہار" قارئین سے خصوصی سروے،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "حمل"،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہد الست"
- صائمہ بشیر کا مکمل ناول "سراب، دھنک اور خوشبو"
- "جھوک دیپ" آنچل رضا کا ناولٹ،
- سائرہ رضا، راشدہ رفعت، فاخرہ رابعہ، فرحی نعیم، مہرشک حبیبہ اور آسیہ مقصود کے افسانے
- معروف رائٹر، ڈرامانگار اور شاعر ظفر معراج سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ "سلمٰی حسن" سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، مدنان کے مشورے

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ جولائی 2014ء کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

پڑھا' صفائی پسند اچھا لگا۔ اور ہاں ایک تھی مثال میں بھول گئی' پڑھتے وقت جس سچویشن سے میں گزری۔ بس نہ ہی پوچھیں۔

سمیعہ سحر! شعاع پسند آیا بہت شکریہ۔ ٹائٹل کے بارے میں آپ کی شکایت نوٹ کرلی گئی ہے' آئندہ خیال رکھیں گے۔

کراچی سے عائشہ جمیل نے لکھا ہے

"صنم سے صمد تک" کنیز نبوی کا مکمل ناول بہت زبردست ہے۔ خصوصاً "ماہم" کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔ عمیر اور حسین رضا! اف اس قدر خود غرض اور بے ضمیر کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنے ہی بھائی کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔ دیکھیں منتظر حسین' حیا حسین کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ شہزادی عباس خلجی کا ناول بس ٹھیک لگا۔ "بت شکن" لائبہ خان نے بے انتہا خوبصورت ناولٹ تحریر کیا۔ آخری قسط میں ہر ایک کردار کے ساتھ رائٹر نے خوب خوب انصاف کیا۔ ویل ڈن لائبہ جی۔ "امید کا ستارہ" "سدرۃ المنتہیٰ اور "کمہاری کا گھر" وجیہہ ان دونوں کے ناولٹ اچھے لگے۔ سدرہ اینڈ وجیہہ ویری گڈ۔ افسانے سب ہی اچھے تھے مگر "پرندہ" "قرۃ العین" کی ہلکی پھلکی تحریر افسانوں پہ چھائی اور لاسٹ مگر نمیرا حمید صاحبہ بلاشبہ ادب کے افق پہ چمکتا ہوا وہ ستارہ جس نے بہت کم وقت میں اپنے اچھے نام سے نام کمایا۔

مگر پھر بھی نمیرا جی! مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔ پلیز مائنڈ مت کیجئے گا آپ کی اکثر کہانیوں کے اینڈ بہت ہی عجیب سے ہوتے ہیں سمجھ میں نہ آنے والے۔ آپ کی تحریروں کا اینڈ پڑھ کر ایک تشنگی سی رہ جاتی ہے۔

پیاری عائشہ! آپ نے شعاع کی تحریروں کے ساتھ ساتھ تمام سلسلوں پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

نمیرا حمید کی سب کہانیوں میں نہیں البتہ کچھ کہانیوں میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ کہانی جلد ختم کردی گئی۔ لاہوت بہرحال اپنی جگہ مکمل کہانی تھی۔ اور اس کا اختتام بھی واضح تھا۔ نمیرا حمید تک ہم آپ کی رائے پہنچا رہے ہیں۔

نوابشاہ سے حنا پیارو خان نے لکھا ہے

مئی کا پورا رسالہ اچھا تھا۔ میں نے کہانی بھجوائی تھی۔ اس کا بتادیں۔

پیاری حنا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی کہانی قابل اشاعت نہیں۔ آپ مزید محنت کریں۔

عائشہ خان شنڈو محمد خان سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ ناول کا سوٹ بہت پیارا لگا۔ بت شکن' جیسا آغاز تھا اختتام ویسا نہ ہوا' ناول میں اب نہیں ہوا معلوم نہیں کیوں۔ کمہاری کا گھر۔ منفرد سے عنوان کا ناولٹ بہت پسند آیا۔ صنم سے صمد تک۔ پڑھنا شروع کردیا تھا مگر سوچا کہ دیکھوں قسط وار تو نہیں۔ مگر دیکھا تو قسط وار تھا اس لیے آگے کا چھوڑ دیا۔ حسین رہ گزر' واہ زبردست شہزادی عباس' بہت پیارا ناول لکھا۔ افسانہ خود غرض زبردست ہے۔ ماہم پر حیرت ہوئی۔ ہم بھی پانچ بہنیں ہیں مگر ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بلکہ میں اگر اپنی بہنوں کی کسی چیز کو پسند کرتی ہوں تو وہ جھٹ مجھے دے دیتی ہیں۔ اور میں بھی ایسی ہوں۔ نمیرا گل کا من پسند بھی اچھا لگا۔

شعاع کے ساتھ میں ثوبیہ نور کے شاعرانہ اسٹائل میں تعارف بہت پیارا لگا۔ ملنے کی گھڑی ہے' "ایک تھی مثال" رخسانہ نگار ہمیں رلا رلا کر جان لیں گی کیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے ناول پڑھنا بند کردیا۔ کیونکہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ کیوں کیا اتنی سی بچی پر اتنا بڑا ظلم۔ کیسے ماں باپ ہیں۔ عفت جیسے کردار زہر لگتے ہیں۔ "خط آپ کے" میں مسز نگین رونا ہری کی انٹری اچھی لگی۔ اور حنا سلیم اعوان اور رضوانہ شکیل کے خط پسند آئے۔

پیاری عائشہ! جس طرح پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں اس طرح سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ بہنیں مختلف بھی ہوتی ہیں بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ آپ بہنیں آپس میں محبت کرتی ہیں تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

رخسانہ درخشی اور الماس ملک نے ملتان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

تمام سلسلہ وار ناول اچھے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگا رنگ سلسلے بھی بہت دلچسپ ہیں۔ میں ایک رائٹر ہوں۔ بچوں کے صفحات کے لیے ہفت روزہ رسائل میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ حال ہی میں میں نے رائٹر ایوارڈ بھی وصول کیا ہے۔

رخسانہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو شعاع کے لیے بھی لکھیں۔ اچھی تحریروں کا ہم ہمیشہ خیر مقدم کرتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صبا عنایت بھریا روڈ سے لکھتی ہیں

نبیلہ عزیز بہت اچھی رائٹر ہیں۔ (رقص بسمل) پڑھ کر بہت اچھا لگا اور یہ کہانی بہت اچھی جا رہی ہے اور باقی سب ناولٹ بہت شوق سے پڑھے۔

پیاری صبا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے پہلی بار ہمت کرکے خط لکھا اور وہ شائع نہ ہو سکا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کائنات جہاں نے راولپنڈی سے لکھا ہے

میں کائنات جہاں' عمر سترہ سال' سات سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ اب ایف ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں' بچپن میں انگریزی سے اور بچوں کی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ میرا لکھا ایک انگلش پلے ایک ... میں چلا اور مجھے انعام بھی دیا گیا۔ شعاع میں میں نے ... کے رائٹرز اور کردار پڑھے جن میں نمرہ احمد کی تحریر مجھے سب سے زیادہ متاثر کن لگی۔

کائنات! دس سال کی عمر سے شعاع پڑھ رہی ہیں' اتنی چھوٹی عمر میں آپ نے اردو' انگریزی ڈرامے لکھے اور انعام بھی حاصل کیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔

لاریب' ملاذ زیب چونیاں سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

جون کے شمارے کا ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں لاجواب تھیں اور ایک بہت پرانی الجھن بھی دور ہو گئی کہ اگر دعائے استخارہ میں اپنی حاجت کا نام عربی میں نہ لے سکیں تو.....؟ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ استخارہ دن یا رات میں کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔

احادیث کے نیچے فوائد و مسائل کا جو کالم دیا جاتا ہے وہ بھی بہت مفید ہے۔ بہت شکریہ جزاک اللہ۔ آپ نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

سمیرا حمید بہتر سے بہترین اور مشکل سے مشکل تر لکھنے کی طرف جا رہی ہیں۔ وجیہہ احمد اور شہزادی عباس کی ہلکی پھلکی تحریریں پسند آئیں۔

کنیز نبوی بہت عرصہ بعد آئیں پر چھا ئیں نہیں۔ کیونکہ ان کی کہانی اچھی تو تھی پر عشق آتش اور ماروی سیریز والا مزہ بالکل نہیں تھا۔ (ناول کا اگلا حصہ پڑھ کر یہ رائے تبدیل بھی ہو سکتی ہے)

سدرۃ المنتہیٰ کی کہانی اعلا تھی۔

لاریب اور ملاذ زیب! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ناول مصنف نہیں ہے یہ کالم ہم لوگوں کا ہے۔ کنیز نبوی کے ناول کا دوسرا حصہ پڑھ کر آپ کی رائے یقیناً" تبدیل ہو جائے گی۔

سمیرا انجم نے ضلع چنیوٹ سے لکھا ہے

خوبصورت ٹائٹل۔ واہ دل خوش ہو گیا۔ کمہاری کا گھر (معذرت) کہانی لکھی سی لگی جبکہ پرچے کی جان سدرۃ المنتہیٰ کا ناولٹ امید کا ستارہ رہا۔ تمغے کے جھوٹے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔

آپی آج سے تقریباً" 20 سال پہلے خواتین رسالے میں پل بیتے کا سایہ ناول آیا تھا پلیز پلیز آپی اگر آپ کے پاس وہ ناول ہے تو اسے دوبارہ شائع کریں۔ بہت شکن جتنی شان دار کہانی شروع ہوئی اینڈ اتنا ہی اچھا لگا۔

تیرے سنگ میں شہزادی عباس خلجی نے کیسا الجھا دیا ہے ہم تو مرتضیٰ کا قصہ ہی ڈھونڈتے رہ گئے۔

سمیرا! شہزادی عباس خلجی کی کہانی مکمل تھی۔ آپ اپنے بک اسٹال والے کو پرچا دے کر اسے تبدیل کرالیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اریبہ آصف اور عابدہ رانو نے کبیر والا سے لکھا ہے

اس دفعہ کا شعاع بہت پسند آیا۔ ماڈل اس دفعہ بہت ہی پیاری تھی۔ سب سے پہلے جو ناول پڑھا وہ ہے "ایک تھی مثال" مثال کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا "بہت

"شمعین" کی آخری قسط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کہ صمریز اور رامین ایک ہو گئے۔ اس کے بعد شہزادی عباس خلجی کا مکمل ناول "حسین رہگزر" نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ بیسٹ آف لک شہزادی جی۔ ناولٹ میں وجیہہ احمد کا "کماری کا گھر" بہت زبردست تھا۔ میرے بھتیجوں آریان حیدر اور آیان حیدر کی سالگرہ 27 جون کو ہے۔ شعاع کے ذریعے انہیں وش کرنا چاہتی ہوں۔

پیاری عابدہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہم آپ کا خط شامل کر رہے ہیں اور آپ کے بھتیجوں کے لیے دعائیں بھی۔ لیکن یہ سلسلہ مبارک بادی کے پیغامات کے لیے نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں اگر تمام قارئین اپنے عزیز و اقارب کو مبارک باد دینے کے لیے یہ ذریعہ اختیار کریں تو پھر اس سلسلے میں صرف مبارک بادی کے پیغامات ہی شامل ہوں گے۔ تبصرے کے لیے تو جگہ ہی نہیں بچے گی۔

قارئین متوجہ ہوں!

1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

کراچی سے یاسمین حنفی نے لکھا ہے

"بت شکن" کی آخری قسط بہت شاندار رہی۔ صمریز اور رامین مل ہی گئے۔ بہت بہت مبارک باد ہو آپ کو امایہ خان! "ایک تھی مثال" اب بور کر رہا ہے۔ ہر قسط میں یکی پڑھ رہے ہیں۔ "وکٹنیز ہوئی" مکمل ناول میں سب واضح ہو گیا ہے۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ خضر حسین کیا فیصلہ کرتا ہے؟ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ "حسین رہگزر" اچھا ناول تھا۔ "کماری کا گھر" سب سے زیادہ پسند آیا۔ اگرچہ کہانی اتنی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ پر موضوع بہت اچھا تھا۔ "سیپی" بھی اچھی تحریر تھی۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ "مثال پسند" زبردست تھا۔

یاسمین! آپ کی ایک کہانی تو لگ چکی ہے بقیہ کے بارے میں معذرت۔ ویسے آپ میں صلاحیت ہے مزید لکھیں۔

افق آتش نے چیچہ وطنی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

"امید کا ستارہ" بہت خوبصورت، بہت اعلا۔ سدرہ جزاک اللہ اس محبت کے لیے۔ کماری کا گھر کے لیے میں بھی فقط اتنا ہی کہوں گی وجیہہ احمد مجھے یہ پسند آیا۔

پیاری افق! آپ نے خط لکھا بہت شکریہ۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ غزل کے لیے معذرت۔

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مطلقہ بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہیں بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کا عہد لے لیتی ہے، مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروقی صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروقی صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروقی صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔



اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں متعولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل، بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے۔ مگر کچھ عرصے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل، عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کیس پرشنٹ ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے فوزیہ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسراری عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے۔ پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بالآخر وہ احسن کمال سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے اور سادگی سے دو گھنٹے کے اندر نکاح بھی ہو جاتا ہے۔ عاصمہ اس جادوگر عورت کو نکالنے کے بعد اپنا مکان دوبارہ کرائے پر نہیں دیتی بلکہ پڑوس میں رہنے والی سعدیہ کے ساتھ کوچنگ سینٹر کھول لیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے مشورے پر بی اے کے پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری شروع کر دیتی ہے۔

سترہویں قسط

اندھیرے میں پیچھے آنے والے کی شکل کچھ اور بھی خوف ناک لگ رہی تھی یا وہ چھوٹا ہی اتنا ڈراؤنا۔ نشے میں سرخ آنکھیں لیے جھومتا جھامتا کوئی لڑکا تھا' جو دیکھنے میں اتنا مریل تھا کہ ہیولے کی طرح لگتا تھا مگر اس کی سرخ آنکھوں کے ڈورے اور ان میں جھلکتی ہوس۔

مشال کو لگا۔ آج یہاں اس اندھیری' اکیلی گلی میں وہ کچھ ہو جائے گا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔ صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اس نشئی نے مشال کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

مشال کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور پھر وہ اس جگہ کھڑی خوفزدہ سی چیختی چلی گئی۔

اس کی ٹانگوں سے جان سی نکل گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ اب یہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہل سکے گی۔

وہ لڑکا اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ اسے کھینچنے لگا کہ اسی وقت پیچھے موجود گھر کا سیاہ گیٹ ایک دم سے کھلا اور کوئی ان دونوں کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا۔

مشال خوف سے لڑکھڑا کر گرنے کو تھی۔ جب ان دو مہربان ہاتھوں نے بے اختیار اسے تھام لیا تھا۔

"کون ہو تم۔ جاتے ہو یا تمہارا حشر کروں میں۔ دفع ہو جاؤ۔"

عاصمہ اس نشئی پہ پوری قوت سے چیخی تھی۔ وہ ڈر کر فوراً" ہی الٹے قدموں بھاگ گیا۔

عاصمہ مشال کو ساتھ لگائے اسے تھپکتے ہوئے کھلے گیٹ سے اندر لے گئی۔

☆ ☆ ☆

عاصمہ پلکیں جھپکائے بغیر اس معصوم' سادہ سے بے ریا چہرے کو دیکھے جا رہی تھی' جو خود پر قابو پاتے ہوئے گویا بہت جبر کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔

"بیٹا! اگر تمہیں رونا آرہا ہے تو تم رو لو۔ تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا مگر اتنا خود پہ جبر نہیں کرو۔ یہ لو پانی پیو۔"

وہ اس کے سامنے ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے نرمی اور پیار سے بولی۔ مشال ایک ہی سانس میں سارا گلاس چڑھا گئی اور جیسے جبر کے سارے مرحلوں سے گزر گئی۔

"نہیں میں رو نہیں رہی' میں ڈر گئی تھی۔ وہ شخص جو میرے پیچھے آرہا تھا وہ بہت خوفناک تھا۔ مجھے ڈر لگا تھا بہت۔"

وہ سنبھل چکی تھی اور اب قدرے اعتماد سے بول رہی تھی۔

اس وقت اکیلی کہاں سے آرہی تھیں۔ بلکہ کہاں جا رہی تھیں۔ شام گہری ہو چکی ہے بلکہ رات۔ تو تم اکیلی؟"

عاصمہ بات کرتے ہوئے اس کے بھاری سے بیگ کو دیکھ کر کچھ ٹھٹک کر بولی۔

"میں اپنے پاپا کے گھر آئی تھی مگر وہ لوگ گھر پہ نہیں تھے۔ اپنی والدہ کے ایک رشتہ دار کے گھر جا رہی تھی کہ راستہ بھول گئی تو بس۔"

وہ رک رک کر کچھ اٹک کر بولی۔

"پاپا کے گھر۔ مطلب تمہاری ماں۔"

"ماما کے گھر سے تو آئی تھی۔ ڈرائیور مجھے باہر ہی ڈراپ کر گیا۔ اسے بھی پتا نہیں تھا کہ پاپا لوگ گھر نہیں ہیں۔" وہ ذرا وضاحت سے بولی عاصمہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔

"کچھ کھاؤ گی؟" کچھ دیر بعد عاصمہ کو خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ مجھے جانا ہے۔" وہ بے چین ہو کر بولی مگر فوری طور پر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اب کہاں

جانا چاہیے۔

"اپنی ماما کے گھر جاؤ گی؟" عاصمہ نے ذرا سوچ کر کہا۔

اس نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

اب وہ اس عورت کو کیا بتاتی۔ اس کے دو گھر ہیں مگر کہیں بھی اسے بے حد محبت نہیں رکھا جاتا۔ وہ تو ایک زبردستی کی مصیبت تھی جو دونوں گھروں کو بھگتنا پڑتی تھی۔

"ماما کہاں ہیں تمہاری؟" عاصمہ پھر سے بولی۔

"وہ ملائیشیا گئی ہیں اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ۔" بہت آہستگی سے مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولی۔

عاصمہ کو معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر اس ڈری سہمی بچی سے مزید کریدنا بھی اسے اچھا نہیں لگا۔

"اچھا بیٹا! آپ کو جہاں جانا ہے آپ مجھے بتا دیں۔ میں آپ کو بھجوا دوں گی۔ اگر کہیں فون کرکے کسی کو بلانا ہے تو میں آپ کی بات کروا دیتی ہوں لیکن بہتر ہے پہلے آپ کچھ کھا لیں، مجھے لگ رہا ہے آپ نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا۔" وہاں تھی اور پھر بہت سالوں سے بچوں کی استاد بھی۔

بچوں کو کب بھوک لگتی ہے اور کب وہ بھوک کو چھپاتے ہوئے بھی چھپا نہیں پاتے۔ وہ جانتی تھی۔

"نہیں مجھے بھوک تو نہیں ہے۔" وہ انگلیاں مسل کر آہستگی سے بولی۔ عاصمہ تو اس لڑکی پہ جانے کیوں پیار سا آیا۔ جی چاہ رہا تھا اسے گلے سے لگا کر پیار کرے مگر۔۔۔ وہ چلی گئی۔

"کیا کروں۔ مجھے اب کہاں جانا چاہیے؟" عاصمہ کے اٹھ کر جاتے ہی وہ مضطرب سی سوچنے لگی۔

عاصمہ جلدی سے اس کے لیے کباب، فرنچ فرائز اور کچھ سموسے لے آئی تھی اور اشتہا انگیز خوشبو والی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"میں چائے لے کر آتی ہوں۔ تم آنٹی ہی سمجھو۔ میری بیٹیاں اپنے اسکول ٹرپ پہ گئی ہیں۔ وہ آنے والی ہیں، تم بالکل بور نہیں ہو گی۔" عاصمہ کہہ کر جانے لگی۔

"وہ آنٹی! مجھے جانا ہے پلیز۔" جلدی سے بولی۔ عاصمہ نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

"اوکے، آپ یہ کھالیں پھر آپ جہاں کہیں گی۔ میں آپ کو خود چھوڑ آؤں گی۔ اگر ہاتھ منہ دھونا ہے تو یہ ساتھ ہی واش روم ہے۔ میں آتی ہوں چائے لے کر۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

مثال سلیقے سے سجے چھوٹے سے ڈرائنگ روم کو دیکھنے لگی۔ "کتنی نائس آنٹی ہیں اور سب سے بڑھ کر انہوں نے اوروں کی طرح مجھ سے بے ہودہ سوال نہیں پوچھے۔ ماما کا گھر الگ کیوں اور پاپا کا الگ کیوں؟"

وہ تنہائی میں خود ہی بیہودہ سوال پوچھنے والوں کو منہ چڑھا کر واش روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔

عاصمہ جب تک چائے لے کر آئی۔ مثال آدھی سے زیادہ پلیٹ خالی کر چکی تھی۔

"آنٹی! مجھے اپنی نانو کے گھر جانا ہے۔ ماموں کی طرف۔" وہ کھانے کے دوران فیصلہ کر چکی تھی۔

اگرچہ حنا مامی بہت بری تھیں۔ منہ پھٹ اور سخت سنانے والی مگر اس وقت یوں آوارہ پھرنے سے تو بہتر تھا کہ وہ وہاں جا کر حنا مامی کی کڑوی کسیلی باتیں سن لیتی۔

"اچھی بات ہے۔ آپ کی نانو کا گھر کہاں ہے۔ آپ کو ایڈریس معلوم ہے ان کے گھر کا؟" عاصمہ سر ہلا کر کچھ مطمئن سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"جی معلوم ہے مجھے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"نانو کے ساتھ اور کون ہوتا ہے ان کے گھر میں؟"

"ماموں، ممانی، ان کے بچے۔" وہ کچھ تفصیل سے بتا گئی۔

"تو آپ اپنے ماموں سے پہلے بات کر لو یا وہ تمہیں آ کر لے جانا چاہیں تو زیادہ بہتر ہے۔" عاصمہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"جی میں کر لیتی ہوں ان سے بات۔" وہ تابع داری سے بولی۔ یوں بھی اسے ڈر تھا کہ وہ نانو کے گھر کا ایڈریس بھول نہ جائے۔ وہ تو ادھر سالوں سے نہیں گئی تھی۔

"تو نمبر ملا کر بات کرو۔ اگر وہ تمہیں لینے کے لیے آتے ہیں تو میں انہیں یہاں کا ایڈریس سمجھا دیتی ہوں۔ تم مجھ سے بات کروا دینا۔" عاصمہ نے سیل فون لا کر مثال کو دیا۔

مثال فون لے کر لمحہ بھر سوچتی رہی۔ پہلے جی میں آیا پاپا کا نمبر ملا کر انہیں ذرا ستائے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ پاپا تو اپنا نمبر اسے بتائے بغیر ہی تبدیل کر چکے ہیں۔

درد کی ایک لہر سی اس کے سینے میں اٹھی۔ جسے دبا کر اس نے جلدی سے عمران کا نمبر ملا کر اسے مختصراً صورت حال بتائی جس کا سوٹ پہن کر ترف ہو گیا تھا کہ اب اسے مثال کو لینے کے لیے آنا پڑے گا۔

عاصمہ نے عمران کو گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔

عمران نے آدھے گھنٹے میں آنے کا کہا اور پورے گھنٹے بعد پہنچا۔

اس دوران عاصمہ اس سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے اس کا سارا احوال جان چکی تھی۔

اسے اس معصوم سی لڑکی پر جی بھر کر رحم آیا۔ جس کے ماں باپ نے اسے یوں بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔

وہ دونوں اس کے پاس تھے مگر کتنے دور تھے۔

کاش میں اسے اپنے پاس رکھ لیتی ہمیشہ کے لیے۔ انوکھی سی خواہش جو وہ جانتی تھی کسی بھی طرح پوری نہیں ہو سکتی اس کے دل میں جاگی تھی۔

"سنو مثال بیٹی! آپ کا جب دل چاہے آپ میری طرف آ جایا کریں۔ میرا کوچنگ سینٹر بھی ہے اگر آپ کو اسٹڈیز میں کوئی پرابلم ہو ٹیوشن کے خیال سے نہیں آپ یونہی آ کر مجھ سے یا کسی بھی ٹیچر سے ڈسکس کر لیں، اگر نوٹس چاہیے ہوں تو بھی آپ آ سکتی ہیں میرے پاس بلا جھجک۔"

مثال کی شفاف آنکھوں میں نمی کی جھلملانے لگی۔

"یہ زندگی ایک امتحان گاہ بھی ہے بیٹیا! کچھ لوگوں کو بہت شروع ہی سے اس میں سخت سوالوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے اور کسی کو آخر میں۔ مشکلیں جو سب کو پیش آتی ہیں گزرنے کے لیے یہ مشکلیں جلد آسان ہو جاتی ہیں جو بہت بہادری سے ان کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟" عاصمہ اسے ساتھ لگائے ہوئے ہولے ہولے کسی مشفق مہربان ماں کی طرح سمجھا رہی تھی۔

مثال نے جھکے سے اپنے آنسو صاف کر لیے۔

"ضرور آنٹی! میں آ جایا کروں گی۔ آپ کا گھر پاپا کے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ میں جب ویک اینڈ کے لیے پاپا کے پاس آیا کروں گی تو آپ کے پاس بھی آ جایا کروں گی۔"

وہ لرزتی پلکوں کے ساتھ آنسو ضبط کرتے ہوئے معصوم لہجے میں کہتی سیدھی عاصمہ کے دل میں اتر گئی۔

اس نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

باہر عمران کی گاڑی کا ہارن بجا تو عاصمہ نے اسے بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا جیسے وہ صبح اریبہ اور اریشہ کو اسکول ٹرپ پر جانے کے لیے رخصت کر رہی تھی۔

اس کی گاڑی کی بیک لائٹس دور جا رہی تھیں اور عاصمہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہیں دور تک تکے جا رہی تھی۔ جب واثق کی بائیک دروازے کے پاس آ کر رکی۔

وہ بھی ماں کی نظروں کے تعاقب میں دور جاتی شیرلاؤ کو دیکھنے لگا۔

"کوئی آیا تھا مما؟" وہ ماں کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ جہاں فریج فرائز اور بچے ہوئے وہ کبابوں کے ساتھ کیچپ کی پلیٹ رکھی تھی۔

وہ علو تا" کباب اٹھا کر کھانے لگا۔

"ہاں۔۔۔ تھا کوئی۔" عاصمہ گہرا سانس لے کر کچھ سحر زدہ سے لہجے میں بولی۔

"کون۔۔۔ آپ کا گیسٹ تھا کوئی؟" وہ ذرا متجسس لہجے میں پوچھنے لگا۔ عاصمہ کے شاگردوں کے والدین آتے رہتے ہیں۔ اس نے اس خیال سے پوچھ لیا۔

"ہاں بس یہی سمجھ لو۔ تم نے آج دیر لگا دی جم میں؟"

"ہاں بس یونہی۔۔۔ یہ اریشہ اور ریبہ ابھی تک نہیں آئیں' آپ نے فون کر کے معلوم کیا؟" گھر کی خاموشی پر وہ ماں سے بولا۔

"نہیں' وہ لوگ پہنچنے والی ہوں گی' جب میں نے کال کی' ان کی کوچ وہاں سے نکل پڑی تھی۔"

"مما۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ اٹھ کر جانے لگا کہ صوفے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ محسوس ہوا۔

قرمزی نگینے کے ساتھ چھوٹا سا ٹاپس تھا۔

عاصمہ کو یاد آیا۔ یہ ابھی اس نے مثال کے کانوں میں دیکھا تھا۔

"اوہ شاید اس کے کان سے گر گیا۔" وہ جلدی سے ہاتھ میں لے کر بولی۔

"کس کے؟" وہ کچھ حیرانی سے بولا۔

"تھی میری ایک اسٹوڈنٹ۔ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ شاید اس کے کان سے گر گیا ہو۔ اب آئے گی تو واپس کر دوں گی۔ تم منہ ہاتھ دھو لو میں تمہارے لیے کھانا لگا دوں۔"

وہ ٹاپس واثق کے ہاتھ سے لے کر اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ذکیہ بیگم کو فالج ہو چکا تھا۔

وہ بستر پر لاچار ہو کر گزشتہ تین سال سے پڑی تھیں۔ حنا کے یکے بعد دیگرے چار بچے ہوئے تھے کہ اسے سانس لینے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

چار بچوں کے ان گنت کام پھر بستر پر پڑی مفلوج ساس کی ہر لمحہ خدمت' وہ ملازماؤں کے ساتھ بھی حنا کے کام نبٹتے نہیں تھے۔

پھر مسلسل کام اور ذمہ داریوں نے اسے بہت چڑچڑا' بدمزاج اور بدزبان بنا دیا تھا۔

بشریٰ تو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جب وہ اپنے دولت مند شوہر کی لمبی گاڑی میں سجی سجائی کبھی کبھی ماں سے ملنے آتی تو کسی مہمان کی طرح دو گھڑی بیٹھ کر چلتی بنتی۔

اسے ذکیہ کے پاس بیٹھنے' ان کی خدمت کرنے کا نہ تو کوئی شوق تھا نہ احسن کمال اسے چند گھنٹے سے زیادہ وہاں رکنے کی اجازت دیتا تھا۔

وہ بڑے تکلف بھرے انداز میں آتی اور چائے اسنیکس کے ساتھ ماں کا حال احوال پوچھ کر کچھ تحفے بچوں کے حوالے کر کے چلتی بنتی تو ایسے میں حنا کا جی چاہتا اسے دھکے دے کر گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔ وہ دوبارہ یہاں اس کا جی جلانے کے لیے نہیں آئے۔

مگر اس کے جلے دل کی یہ خواہش بھی پوری ہونا ناممکن تھی بہرحال عمران ذکیہ ابھی بھی بشریٰ کو چاہتے تھے اور اس کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔

حنا کو جب بشریٰ اچھی نہیں لگتی تھی تو پھر اس کی بیٹی مشال کیوں کر اچھی لگ سکتی تھی۔

جب وہ ماموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی 'حنا حسب سے چھوٹے بیٹے کی ڈنر سیٹ کی پلیٹ توڑنے پر ٹھیک ٹھاک دھنائی کر رہی تھی۔

بچے کو مارنے پیٹنے کے دوران اس نے جی بھر کر اپنے نصیبوں کو اور بچوں کی بدتمیزی کو کوسا۔

اور اسی طرح چیختی چلاتی غصیلے مزاج کے ساتھ کچن میں چلی گئی۔

عمران بیوی کا آف موڈ دیکھ کر دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے کھسک گیا۔ مشال کسی مجرم کی طرح پہلے لاؤنج میں بیٹھی رہی 'اندر کچن میں حنا ابھی بھی برتن پٹختے ہوئے اسی طرح کرختی سے بول رہی تھی جانے اب کچن میں کون سے نمبر والا بچہ تھا۔

"یہ لو پکڑو۔ اپنی اس بیمار 'بدمزاج نانی کو کھلا دو یہ چاول۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میری ہی ڈیوٹی نہیں کہ میں اس بیگار کیمپ میں جتی رہوں۔ تمہاری احسان فراموش ماں اور عیاش ماموں کو تو کوئی شرم ہے نہ حیا کہ اس بیمار بڑھیا کو میں اپنے جہیز میں نہیں لے کر آئی تھی دو گھڑی کو وہ بھی اس کی خدمت کرلیں۔"

وہ پلیٹ اس کے آگے پٹخ کر جس طرح بولتی ہوئی آئی تھی اسی طرح بولتی بکتی چلی گئی۔

مشال چاولوں کی پلیٹ لے کر نانی کے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ذکیہ بیگم بستر پر عبرت کی تصویر بنی پڑی تھیں۔

اور ان کے کمرے میں کس قدر تعفن 'گندگی اور بدبو تھی کہ مشال کو لگا اسے ابھی قے آجائے گی۔

کمرے کے پردے گرے ہوئے تھے۔ کمرے میں عجیب سی گیلی گیلی بساند تھی۔ ذکیہ کی زبان پر بھی فالج گرا تھا وہ جو بھی بولتی تھیں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

سو وہ بغیر بتائے بستر خراب کرتی تھیں بغیر بتائے کھانا یا اگل دیتیں اور حنا گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف کئی کئی گھنٹے اس کمرے میں جھانکنا تک بھول جاتی۔

ملازمہ موجود تھی مگر جب مالکن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی تو وہ کیوں دل سے کام کرتی۔

اوپر اوپر سے کمرہ صاف رکھتی اور بےچاری ذکیہ کے کمر کے نیچے بننے والے زخم پھیلتے ہی چلے جارہے تھے۔

مشال کو دیکھ کر ذکیہ حلق سے عجیب سی آوازیں نکالتی رونے لگی تھیں۔

وہ غوں غاں کرتی کیا بولے جارہی تھیں۔ مشال کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر وہ نانی کی بےبسی 'ان کی لاچاری کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میرے اللہ! میں ہر وقت اپنی حالت کو 'اپنی بےبسی 'بےچارگی کو روتی رہتی مگر نانی۔۔۔ جو کسی گندے شخص کو جس کے کپڑوں سے 'منہ سے اسمیل آرہی ہوتی تھی پاس نہیں بیٹھنے دیتی تھیں وہ اس حال میں ہیں کہ اپنے جسم سے پھوٹتی ان غلیظ بدبوؤں کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔"

وہ اتنے بدبو دار ماحول اور ذکیہ کو خستہ حالی میں دیکھ کر کس طرح انہیں چاول کھلا سکتی تھی۔

وہ کتنی دیر تک پلیٹ ہاتھ میں لیے یونہی بیٹھی رہی۔

ذکیہ کو شاید بھوک لگی تھی۔ وہ پلیٹ کو دیکھ کر غوں غاں کرتی جارہی تھیں۔

مثال نے اپنی سانسوں کو بمشکل روکتے ہوئے ذکیہ کو چند نوالے کھلائے کہ وہ ٹھیک سے غذا کھا بھی نہیں سکتی تھیں۔

ان کی آتی جاتی سانسیں کسی عذاب سے کم نہیں تھیں۔

عمران تو ماں کے کمرے میں کئی کئی دن جھانکتا بھی نہیں تھا مثال کو حنا کی پریشانیوں کا ان چار دنوں میں اندازہ ہوا۔ کم از کم وہ بشریٰ اور عمران سے تو اچھی تھی جیسے تیسے سہی ذکیہ کو تین ٹائم کھانا کھلاتی تھی۔ وہ اوپر کی ملازمہ کے سر پر چیخ کر حتی الامکان ان کا کمرہ صاف کرواتی۔ ان کے کپڑے روز بدلواتی۔ ان کے زخموں پر مرہم لگاتی اور کسی دن اس کے پاس ٹائم ہوتا تو وہ ملازمہ کے ساتھ مل کر ذکیہ کو کرسی پہ بٹھا کر باہر بھی لے جاتی۔

مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا اگرچہ روز بھی ہو سکتا تھا اگر عمران دلچسپی لیتا تو۔۔۔

مگر اس نے تو جیسے ماں کو بالکل بھلا دیا تھا ایسے میں حنا واقعی ذکیہ کے لیے کسی فرشتے سے کم نہیں تھی۔

مثال نے ان چار دنوں میں ماہی کے ساتھ مل کر جتنی ہو سکی ذکیہ کی خدمت کی۔ ملازمہ کے ساتھ مل کر سارا کمرہ دھلوایا۔ پردے اتروا کر بدلوائے۔ بستروں کی چادریں کرسیاں میزیں سب صاف کروا کے رکھوائیں۔

ذکیہ کی کمر کے زخم چار دن میں بہتر ہونے لگے تھے کہ وہ اب وہاں دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں اور ٹی وی دیکھتی تھیں۔ پانچویں دن کی شام عدیل اسے لینے کے لیے آیا۔

عدیل کا موڈ سخت آف تھا۔ مثال باپ کا چہرہ دیکھ کر ڈر سی گئی۔

"کیوں آئی تھیں تم ادھر رہنے کے لیے؟" وہ کچھ دیر ہی خود پہ ضبط کر سکا۔ تھوڑا آگے جاتے ہی برہم موڈ میں بولا۔

"وہ پاپا۔۔۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا تو۔۔۔ مما۔۔۔" وہ کچھ بھی ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکی اس شام کی سنگین صورت حال اور اس فرشتے جیسی آنٹی کے بارے میں اور اس شیطان جیسے شخص کے بارے میں جو اس کے پیچھے آیا تھا اور نہ ماں کی بے بسی کے بارے میں نہ وہ ملائیشیا کا ٹرپ اس کی وجہ سے کینسل تو نہیں کر سکتی تھی۔

"جانتی ہو ناں مجھے ان ماں بیٹے سے کتنی نفرت ہے۔ ان ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ میں چاہوں بھی تو اس تلخ حقیقت کو بھلا نہیں سکتا۔ تم جو آج چند روز چند دن کے لیے کبھی ماں کے گھر دھکے کھاتی ہو۔ کبھی باپ کے گھر اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ماں بیٹا تھے۔" مثال اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ نفرت بھرے لہجے میں پھنکار رہا تھا۔

"پاپا! جب مما مجھے چار دن پہلے آپ لوگوں کو بتائے بغیر آپ کے گھر کے دروازے پر چھوڑ گئیں اور آپ لوگ مجھے بتائے بغیر یہاں نہیں تھے تو پھر میں کہاں جاتی اس رات اگر یہاں نہ آتی تو؟"

وہ بھی تلخی سے بولی کہ شاید باپ کو اپنی غلطی کا کچھ احساس ہو سکے۔

"مثال! میری ایک بات یاد رکھنا، یہ دونوں ماں بیٹے کبھی بھی تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتے اور تم کسی ایسے موقع پہ کسی دوست کے پاس رک جانا مگر ان کے پاس نہیں آنا۔ اور آج تو میں تمہیں یہاں لینے آ گیا ہوں اگلی بار تم نے ایسی حرکت کی تو میں کبھی تمہیں لینے نہیں آؤں گا اوکے۔"

مثال ساکت سی باپ کے سرد چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

حنا اس سے بہت متاثر ہوئی تھی جس طرح ان چار دنوں میں اس نے ذکیہ کی خدمت کی تھی۔

"ماہی! میں اب جب بھی پاپا کی طرف آؤں گی ایک دو راتیں ضرور یہاں آ کر رکا کروں گی پھو دیکھیے گا ہم نانی کو چند دنوں میں کرسی پر خود بیٹھنے کے قابل کر دیں گے۔ ہے نا۔" وہ بہت جوش سے حنا سے وعدے وعید کر کے آئی تھی۔

"مشال! تم اپنی ماں سے بہت مختلف ہو، بہت سمجھ دار، بہت سلجھی ہوئی اور بہت حساس ورنہ تمہاری عمر کی بچیاں اس طرح کب کسی کا خیال رکھتی ہیں۔ تم بہت اچھی ہو اور مجھے تمہارا انتظار رہے گا صرف مجھے ہی نہیں تمہاری نانی کو بھی۔ وہ بھی تم سے بہت پیار کرتی ہیں اور ان چار دنوں میں تو اور بھی تم سے مانوس ہو گئی ہیں۔"

حنا بہت متاثر لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور حوپاپا کہہ رہے تھے۔

وہ دکھ سے صرف آنسو پی کر رہ گئی۔

"پاپا اگر آپ نانو کی حالت دیکھتے ان کی بے بسی ان کی بے چارگی تو شاید آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ وہ نانو نہیں تھیں جو بہت کروفر سے بات کرتی تھیں جن کا مغرور انداز انہیں ساری محفل میں الگ کرتا تھا۔ یہ تو بہت بے چاری سی بہت مسکین عورت تھیں جو آپ کی میری ہم سب کی تھوڑی سی ذرا سی توجہ چاہ رہی ہیں اور بس۔" وہ دل میں سوچتی رہ گئی۔

پھر رات بھر عدیل نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ایک بار اس بات پہ ہلکی سی معذرت بھی نہیں کی کہ وہ لوگ بتائے بغیر چلے گئے تھے تو اسے تکلیف ہوئی ہوگی۔

عفت کا موڈ گھر میں الگ تپ تھا۔

دن بھر اسے اکیلے گھر میں کام کرنا پڑا تھا۔ عدیل تاکید کے باوجود رات گئے واپس لے کر آگیا تھا جب وہ رات کے کھانے کے برتن تنخ کر دھو رہی تھی۔

مشال خود بہت تھکی ہوئی تھی' وہ خاموشی سے دادی کے کمرے میں چلی گئی۔

پورے گھر میں اس کے بستر کی جگہ صرف نسیم کے کمرے میں ہی بن سکی تھی۔

وہاں نسیم کی بک بک اور یہ جان کر کہ وہ چار دن زکیہ کے گھر میں گزار کر آئی ہے' وہ تو رات تک غصے اور نفرت سے مشال پر چلاتی رہی تھیں۔

اور مشال دونوں کان تکیے کے اندر گھسیڑ کے ساری رات یوں پڑی رہی جیسے وہ اس کمرے میں موجود ہی نہیں۔

اس کا جی ہر شخص سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

یہاں ہر کوئی مطلبی' خود غرض اور خود غرض تھا' خواہ وہ اس کی ماں تھی' اس کا باپ' نانی' دادی' ماموں' سوتیلا باپ سوتیلی ماں۔ وہ ہر رشتے سے مایوس ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کل بیس اکتوبر ہے ناماما؟" آئینہ تیرہ سال کی ہو چکی تھی۔ اپنے ہوم ورک کی کاپی پہ ڈیٹ لکھتے ہوئے وہ رک کر شزا سے پوچھنے لگی۔

بیس اکتوبر۔ تو مشال کی برتھ ڈے ہے۔" وہ عجیب دھیان سے چونکی تھی۔

اور بیٹھے بیٹھے انگلیوں پر کچھ گننے لگی۔

"بیس سال کی ہو گئی مشال۔ مائی گاڈ!" اسے جیسے بیٹھے بیٹھے جھٹکا سا لگا تھا۔

یوں بھی آج کل اسے بہت کچھ بھولنے لگا تھا۔

احسن کمال کے پیسوں کو پھیلا ہر کے چکر نے اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیا تھا۔

سیفی دو سال پہلے انگلینڈ چلا گیا تھا ہائر اسٹڈیز کے لیے مگر آج کل وہ آیا ہوا تھا۔

احسن کمال کا کسی آسٹریلین کمپنی کے ساتھ بزنس بہت زبردست طریقے سے چل رہا تھا اور بہت سوچ بچار اور

حساب کتاب کے بعد اس نے آسٹریلیا شفٹ ہونے کا ارادہ کرلیا تھا۔

بشریٰ اس تبدیلی کے لیے رضامند نہیں تھی۔

دونوں کے درمیان روز ہی اس بات پر بحث ہوتی اور بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتی۔ وہ آج کل بہت ڈسٹرب تھی۔

مثال کہاں ہوتی ہے آج کل؟ اودھر ہے یا باپ کی طرف وہ اکثر یہ بھی بھول جاتی۔

سیفی بھی باپ کا ہم خیال تھا اور دونوں ہی چند مہینوں میں یہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کرکے آسٹریلیا شفٹ ہونے کے حق میں تھے۔ بشریٰ نے اپنی مرضی اور خواہش کا اختیار دوسری بار گھر بچانے کے خیال سے جو چھوڑا تھا۔ وہ آج تک اسی طرح احسن کمال کی مرضی اور خواہش پر چلتی آرہی تھی۔

"مثال کہاں ہے آئمنہ؟" وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئی ڈونٹ نو مام۔" آئمنہ ہوم ورک کرتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

"ٹھیک ہے اگر احسن کمال کو یہاں سے جانا ہی ہے تو میں مثال کی شادی کرکے ہی جاؤں گی۔ اس کا گریجویشن تو ہونے ہی والا ہے۔" وہ سیڑھیاں اترتی چڑھتی سارے گھر میں مثال اور سیفی خود سے باتیں کررہی تھی۔

مثال اس کی توقع کے عین مطابق اوپر ٹیرس پر تھی اور ڈوبتے سورج کی قرمزی شعاعوں کو تکتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی حال کے بارے میں یا ماضی کے بارے میں یا اپنے آنے والے کل کے بارے میں۔

بشریٰ کتنی دیر اس کے پیچھے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

مثال نے کتنا اچھا قد کاٹھ نکالا تھا اس کی رنگت دودھیا نہیں تھی گندمی سنہری مائل جس میں عجیب سی کشش تھی۔ اس کی سنہری مائل آنکھیں اور لائٹ براؤن بال اس کے چہرے کو اور بھی پرکشش بناتے تھے۔

بشریٰ کو بے اختیار اپنی بیٹی پر پیار آگیا۔

"ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر مثال۔۔۔ میری جان!" وہ بے اختیار اس کے پیچھے سے لپٹتے ہوئے مسرور لہجے میں بولی۔

مثال کے لیے ماں کا یوں وش کرنا کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ وہ ماں کے یوں لپٹنے پر بھی ساکت سی رہ گئی فوراً کوئی ردعمل نہ دے سکی۔

بشریٰ اب اس کا ماتھا اس کے رخسار چوم رہی تھی۔ مثال اسی طرح بغیر پلکیں جھپکائے ماں کو دیکھے جارہی تھی۔

"مثال! میری جان! تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا کہ آج تمہاری برتھ ڈے ہے۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولی۔

"کیونکہ مجھے یہ بات خود بھی یاد نہیں تھی۔" وہ عجیب روکھے میکانکی انداز میں بولی۔

بشریٰ لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہیں سکی۔

کتنے سالوں سے وہ خود بھی مثال کی برتھ ڈے نہ تو منا سکی تھی نہ یاد رکھ کر اسے وش ہی کرسکی تھی۔

"آج آپ کو کیسے یاد آگیا۔" وہ گلہ کرنا تو نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیسے اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

"میری مثال بیس سال کی ہوگئی۔ میں صرف یہ سوچ کر حیران ہوں کہ میری بیٹی اتنی بڑی ہوگئی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔"

وہ عجیب جذباتی پن میں بیٹی کو پیار کررہی تھی۔

"اس سے کیا ہوتا ہے ماما؟" وہ مایوسی سے لہجے میں بولی۔

بشریٰ اس کے چہرے کے اطراف میں بکھرے بال سمیٹنے لگی۔
"تمہارا فائنل کب ہے گریجویشن کا؟" وہ یوں عام سے لہجے میں پوچھ رہی تھی جیسے وہ دونوں ماں بیٹی روز اسی طرح ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر۔ روز مرہ کی باتیں کرتی ہیں۔
"تین چار ماہ ہیں ابھی تو۔" وہ سرسری لہجے میں بولی۔
بشریٰ اسی طرح محبت لٹاتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔
"ایک بات پوچھوں مشال؟" وہ بہت رازدرانہ انداز میں بولی۔ مشال کچھ حیرانی سے ماں کو دیکھنے لگی۔
"تم میری بات کا غلط مطلب نہیں لینا جان۔" وہ جلدی سے صفائی دیتے ہوئے بولی۔
"میں سمجھی نہیں مما!" وہ آہستگی سے بولی۔ اسے بشریٰ کے رویے سے الجھن سی ہو رہی تھی۔
"تم اب بڑی ہو چکی ہو اور میں جانتی ہوں۔ بحیثیت ماں میں نے تمہاری ذمہ داریاں اس طرح نہیں نبھائیں جس طرح مجھے نبھانی چاہیے تھیں تمہارے بہت سے حقوق میں نے نظر انداز کیے اور تمہیں وہ محبت بھی نہیں دی جس کی تم حق دار تھیں۔ مجھے اپنی تمام تر کوتاہیوں کا احساس ہے مشال؟" وہ نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"لیکن میں چاہتی ہوں۔ اب آئندہ آنے والے دنوں میں میں تمہارے ساتھ جانے یا انجانے میں کچھ برا نہ کروں۔ کیا تم اپنی ماں پر بھروسا کروگی مشال؟"
وہ جانے کس بات کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھ رہی تھی مشال کو الجھن سی ہونے لگی تھی۔
"آپ کو جو کہنا ہے آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں مما!" وہ تحمل سے بولی بشریٰ اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔
اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نوخیز بشریٰ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔
"تم۔۔۔ تمہیں کوئی پسند ہے مشال! میرا مطلب ہے تم کسی کو پسند کرتی ہو۔"
بشریٰ کی تمہید جتنی لمبی اور اکتا دینے والی تھی سوال اتنا ہی چونکا دینے والا اچانک سا تھا۔
"مما!" وہ پریشان ہو گئی۔
"میری جان! ماں پر شک نہیں کرتا بیٹی تمہیں غلط نہیں سمجھ رہی میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کو آنے والی زندگی میں بہت سے خوشیاں بہت محبتیں ملیں اور اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو یا تمہیں کوئی چاہتا ہے تو تم مجھے بلا جھجک بتا سکتی ہو میں خود ان لوگوں سے ملوں گی بات کروں گی اور تمہارا رشتہ۔"
مشال ایک جھٹکے سے ماں کو خود سے الگ کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔
"جو ذمہ داری آپ نہیں نبھا سکیں۔ آپ چاہتی ہیں کوئی دوسرا اسے نبھائے تاکہ آپ خود اپنی نظروں میں سرخ رو ہو سکیں۔" وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔
بشریٰ ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ مشال کی آنکھوں میں ایک دم سے اجنبیت اتر آئی تھی۔
"مشال تم میری بات نہیں سمجھیں۔"
"میں آپ کو بھی سمجھ چکی ہوں اور آپ کی ذہنیت کو بھی اور آپ کی بات کو بھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتی۔" وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
بشریٰ گم صم سی وہیں بیٹھی رہ گئی۔
یہ تو اسے اندازہ تھا کہ ایک روز جب کبھی بھی اس نے مشال کے ساتھ پچھلا حساب کتاب کھولا تو وہ یونہی تہی دامن بیٹھی رہ جائے گی۔ خالی جھولی لیے۔
جب اس نے مشال کو کبھی کچھ دیا نہیں تو اس کے دل نے یہ توقع کیسے لگائی کہ وہ جواب میں اسے محبت، چاہت

اور وہ خوشی ہوئے گی جو وہ خود اسے کبھی دے ہی نہیں سکی۔

وہ اپنے سارے جذبے تو سیفی اور آئینہ پر لٹا چکی تھی۔ مثال تو اس کے ماضی کی تلخ یادوں کا حصہ تھی جو جب بھی اسے نظر آتی تو وہ اس سے نظریں چرا لیا کرتی تھی پھر اب کس بھروسے پر وہ اس کے سامنے اپنے جذبات رکھ رہی تھی۔ اعتماد یا بھروسا لمحے بھر کا کھیل نہیں ہوتا۔ جب وہ ماں ہونے کی حیثیت جتا کر بیٹی کے آگے رکھے گی تو وہ آنکھیں بند کر کے اس کی انگلی تھام کر چل پڑے گی۔

"اسے اب یوں بھی میرے سہارے میری انگلی تھامنے کی ضرورت نہیں اور مثال کسی کو پسند نہیں کرتی۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے لیکن پتا نہیں کیوں مجھے چند دنوں سے یہ محسوس ہو رہا ہے اگرچہ میں گھر کی ذمہ داریوں اور احسن کمال کی اس نئی بحث میں بہت الجھی رہتی ہوں پھر بھی مجھے کئی بار لگا سیفی مثال کو بہت الگ سی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے وہ اسے دل ہی دل میں پسند کرنے لگا ہو۔ اسے چاہنے لگا ہو' جب سے وہ یو کے سے واپس آیا ہے۔ اس کی نظریں مثال کے لیے بدلی ہوئی ہیں۔

اگر ایسا کچھ ہو جائے تو میری مثال ہمیشہ کے لیے میرے پاس ہی رہ جائے گی اور میں ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی کی محرومیاں دور کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں آج کل ہی کسی بہانے سے سیفی کو ٹٹولتی ہوں تو پھر اس سے بات کروں گی۔" اس کے دل میں انوکھا خیال جاگا تھا' وہ بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

اور یہ ٹھیک ان ہی دنوں کی بات ہے' جب واثق انجینئرنگ کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا تھا۔

اور اکثر وہ دور چھت پر بیٹھی مثال کو دیکھتا اور اس کے آگے بچھتا جاتا تھا۔

پھر ایک رات جب وہ یونہی نکلی ہوئی تھی' تو اس کے ساتھ کسی خوشبودار جھونکے کی طرح اس سے آ ٹکرائی تھی۔

دونوں سحرزدہ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

اور ان ہی دنوں میں جب اسے ایک معمولی سی کمپنی میں ایک بہتر جاب ملی تھی اور مثال اسے اکیلی ملی اور وہ اس کو مخاطب کرنے کی جرأت کر بیٹھا تو اس نے کیسی بے خوفی سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا تھا۔

اب تو اتنی ملاقاتیں' واسطے بالواسطہ ہو چکی تھیں کہ واثق کو وہ بہت اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔

مثال کے حافظے سے بھی وہ محو نہیں ہو سکا تھا۔

جس رات وہ اس سے ٹکرائی تھی۔ اس رات اور بعد میں آنے والی بہت سی راتوں میں اس کی مضبوط بانہوں کا حصار اسے بہت بے چین رکھتا رہا تھا۔ اتنے سارے اپنوں کے درمیان اجنبی رویے اسے اندر ہی اندر بہت کمزور کر چکے تھے۔

بظاہر وہ لاتعلق' بے نیاز رہتی۔ بے حس' بے تاثر چہرہ لیے۔ عفت کو اور بھی غصہ آتا کہ اس لڑکی پر کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا مگر وہ اندر سے بہت ڈرپوک اور سہمی ہوئی تھی۔

وہ دوبارہ کبھی عاصمہ کے گھر نہیں گئی تھی۔

اگرچہ وہ ایک بار دن کی روشنی میں وہاں سے گزری تھی مگر وہ مشفق عورت اس کے قدموں کو اور بھی تیز کر گئی۔

اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ اس کے حالات جان کر اس پر ترس کھائے' اس سے ہمدردی کرے۔ وہ اب کسی کو بھی یہ نہیں بتاتی تھی کہ پاپا کے گھر سے آ رہی ہے یا ماما کے گھر۔۔۔

وہ آج کل صرف ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ جلد سے جلد گریجویشن کرتے ہی اپنے لیے کوئی جاب تلاش کرنا ہے اور اپنے پیروں پہ خود کھڑے ہونا ہے۔

احسن کمال اور بشریٰ کے درمیان روز ہونے والی بحث بھی اسے چوکنا کر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی 'جلد یا بدیر احسن کمال کی جیت ہوگی اور بشریٰ کو سب کچھ سمیٹ کر اس کے ساتھ آسٹریلیا جانا ہی پڑے گا۔

اور اس سب کچھ میں مثال تو کہیں بھی نہیں ہوگی اور عفت اسے مستقل اپنے گھر میں ٹھہرانے پہ کبھی بھی راضی نہیں ہوگی۔

تو ایسے میں اسے خود کو مضبوط کرنا تھا۔ وہ ہمدردی اور بے چارگی کا نشان بن کر لوگوں کے لیے مثال نہیں بننا چاہتی تھی۔

نسیم کا پانچ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا اور وقیہ تو وہ جب آخری بار ان کی خدمت کر کے آئی تھی۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی زندگی کے آزار سے رہائی پا گئیں۔ عدیل کو دوبارہ کبھی اسے ٹوکنا نہیں پڑا تھا کہ وقیہ اور عمران سے کبھی نہیں ملے گی۔

پریشے بہت خوب صورت نکلی تھی۔ قد کاٹھ میں بھی تیرہ چودہ سال کی عمر میں وہ مثال کے برابر آ گئی تھی 'جو دیکھتا وہی اس کے حسن کا مداح ہو جاتا عفت کا سر فخر سے اٹھ جاتا۔

پریشے کا اصل حسن اس کی معصومیت تھی۔ وہ اس حسن پر مغرور نہیں تھی لیکن اس معصومیت میں بھی بہت بے نیازی تھی وہ جب موڈ ہوتا مثال سے ٹھیک طرح بات کر لیتی موڈ نہ ہوتا تو مثال کے بلانے پر اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔

دانی ایک لاپروا سا لڑکا تھا جسے مثال میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شروع سے عفت کی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ یہ تمہاری سوتیلی بہن ہے۔ تم اس سے جتنا بھی فاصلہ رکھو گے یہ ٹھیک پندرہ دن بعد یہاں سے چلی جائے گی۔

دانی نے بھی اسے دل سے بہن نہیں سمجھا تھا۔

ان لوگوں کی ایک مکمل فیملی تھی جس میں مثال کی جگہ نہیں تھی۔ نسیم بیگم کی وفات کے بعد اس کا کمرہ پریشے کے حصے میں آ گیا تھا۔ اوپر والا پورشن کرائے پہ تھا۔ صرف چھت ان کے پاس تھی جس پر مثال کبھی کبھی تنہائی کی تلاش میں جا کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

اور آج بھی وہیں بیٹھی بشریٰ کی بات کو نئے سرے سے سوچ رہی تھی۔

"مثال تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" اس نے ماں کی بات کو کس طرح سختی سے رد کیا تھا مگر اب جس سے وہ چہرہ اس کے سامنے آ گیا تھا جو اس کے اچانک بہت قریب تھا۔

"نہیں 'مجھے اس کے بارے میں نہیں سوچنا۔" وہ سر جھٹک کر اٹھی اور یونہی چھت پہ ٹہلنے لگی۔

اور دوسرے لمحے وہ ساکت سی رہ گئی۔

وہی لڑکا یک ٹک اس کو دیکھے جا رہا تھا 'مثال کے قدم جیسے وہیں جکڑے رہ گئے۔

دونوں بہت دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے جیسے بہت قریب محسوس کر رہے تھے۔

واثق نے دور سے ہاتھ ہلا کر اسے وش کیا تھا۔

وہ جھینپ کر بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی رات تک اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر اتھل پتھل ہوتی رہی تھیں۔

"کدھر دھیان ہے تمہارا؟ کھانے میں نمک کی جگہ چینی ڈالنے لگی تھیں مشال! تم جب بھی اپنی ماں کے گھر سے ہو کر آتی ہو مجھے زچ کرکے رکھ دیتی ہو۔ کیا پٹیاں پڑھا کر بھیجتی ہے وہ عورت تمہیں؟" عفت کو جی بھر کر اس پر غصہ آرہا تھا۔ زور زور سے بولتی چلی گئی۔

"ماما کہتی ہیں جب آپ بابا کی ساری تنخواہ ان کی ہر چیز پر قابض ہیں۔ ان کی سیلری میں سے ایک جوڑا کپڑوں کا تمہیں نہیں بنا کر دیتیں تو پھر تم بھی مشال اس گھر کا کوئی کام نہیں کیا کرو۔ تم نوکرانی نہیں ہو عفت بیگم کی۔"

وہ باقاعدہ کمر پر ہاتھ رکھے نڈر لہجے میں بول رہی تھی۔ عفت کی آنکھیں تو جیسے پھٹنے کو تھیں۔

"یہ۔ یہ تمہاری ماں نے بکواس کی؟" وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"بالکل سچ کہا ماما نے لیکن میں نے ان سے کہا چونکہ میں بابا سے بہت محبت کرتی ہوں تو صرف اس لیے کہ عفت ماما بابا کو میرے خلاف اکسا نہیں۔ میں ان کے گھر کا کام کر دیتی ہوں ورنہ کوئی میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا۔" وہ ٹونٹی سے ہاتھ دھو کر کھانا ادھورا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا جی ہر کام کو الٹا کرنے کو چاہ رہا تھا اور اب عفت کچن میں کس طرح جل بھن رہی ہوگی۔ سوچ کر ہی مشال کو ہنسی آرہی تھی۔

"مگر وہ لڑکا!" اس نے بے اختیار آنکھیں رگڑیں وہ تو اس کے دھیان کا سنگھاسن سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے بھولتا کیوں نہیں؟" وہ بے بسی سے سیڑھیوں میں بیٹھ کر پھر اسی کو سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ پر تو جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گیا تھا۔

ہاشم بھائی اور ان کی بیوی صاعقہ اپنے دونوں بیٹوں رفقہ اور وقار کے ساتھ اتنے سالوں بعد پاکستان آئے تھے۔ اور دونوں میاں بیوی نے آتے ہی اریبہ اور اریشہ کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔

"اور ہم پندرہ دن میں نکاح رخصتی کروا کے اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر جائیں گے۔" صاعقہ بھابھی کی بات پر عاصمہ کو لگا ابھی خوشی سے اس کا دل بند ہو جائے گا۔

"بھابھی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ عاصمہ تو بس... میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں سوچا۔"

وہ کانپتی آواز میں بول رہی تھی۔

"واثق! تم بھی تو بولو بیٹا کچھ؟" ہر ایسے مشکل وقت میں وہ واثق کو پکارا کرتی تھی سو اب بھی یہی کیا۔

"میرے خیال میں امی! اس میں کچھ ایسا حرج بھی نہیں، صرف ایک بار اریشہ اور اریبہ سے پوچھ لیتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی اعتراض نہیں ہو تو۔ کیوں ماموں؟" واثق ہاشم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہاری ماں شروع ہی سے ایسی ہے واثق! اچانک اس کے سر پہ خدانخواستہ غم کی خبر ہو یا خوشی کی بات پڑ جائے تو یہ ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتی ہے۔ بہت تھڑدلی ہے اس کا۔ اماں کہا کرتی تھیں۔ میری بیٹی کا دل تو چڑیا جیسا ہے۔" ہاشم بہت پرانی بات یاد کرتے ہوئے بولے تو عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"سچی بات تو یہ ہے عاصمہ باجی! کہ مجھے گٹھیا کے اس مرض نے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا یوں سمجھیں جیسے تیسے زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہی ہوں۔ پہلے ہاشم کی صرف جاب تھی سعودی عرب میں تو ارادہ تھا کبھی نہ کبھی یہاں آجائیں گے مگر اب تو ان کا اور دونوں بیٹوں کا بزنس اللہ کے فضل سے جم گیا ہے وہاں تو واپسی تو مشکل ہے اور گھر چلانے کے لیے تو ہمیں صرف آپ کی بیٹیوں کا خیال آیا کہ جس طرح کی سلجھی ہوئی سمجھ دار آپ ہیں ویسی ہی اریبہ اور اریشہ ہوں گی۔ بس آپ ہمیں انہیں دے دیں۔ ہم سمجھیں گے آپ نے ہمارا مان رکھ لیا۔"

صاعقہ کم گو عورت تھی پھر عمر بھر اپنی بیماری کے ہاتھوں عاجز رہی۔

اور آج وہ جس طرح عاجزی سے بات کر رہی تھی۔ عاصمہ کو لگا اللہ نے اس کی عمر بھر کی ریاضتوں کا حساب یک مشت چکا دیا ہو۔ وہ بھابھی کے گلے لگ کر روتے ہوئے مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ لائبریری سے باہر نکل رہی تھی۔

پیلے رنگ کے کھلے ہوئے کاٹن کے سوٹ میں دوپٹہ اچھی طرح لپیٹے پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پہ چمک رہے تھے جب بے دھیانی میں تیزی سے سیڑھیاں اترتے وہ اوپر آتے واثق سے ٹکرا گئی۔

دونوں کے ہاتھوں میں موجود کتابیں گر گئیں۔ واثق نے دونوں کتابیں اٹھائیں۔

وہ سیدھی ہو کر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پلیز میری کتابیں واپس کریں۔" وہ اس کی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر بولی۔

"آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ قدرت واقعی ہم دونوں کو بار بار ملانے سے یوں سر راہ ٹکرانے سے کوئی خاص بات بتانا چاہتی ہے۔" وہ شوخی سے بولا۔

"لگتا ہے آپ کو وہ تھپڑ بھول گیا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں جتا کر بولی۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"مجھے لگتا ہے آپ بہت ہتھ چھٹ ہیں۔ یونہی ہر راہ چلتے کو تھپڑ جڑ دیتی ہیں۔" وہ بھی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"آپ نے کیا مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھ رکھا ہے۔"

"جو سمجھ رکھا ہے وہ تو آپ مجھے سمجھنے نہیں دے رہیں ورنہ بتاتا کہ میں آپ کو کیا سمجھوں گا۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"پلیز میری کتاب واپس کریں۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"انٹرویو میں کامیاب ہونے کے سوتر۔" وہ کتاب کا ٹائٹل پڑھنے لگا تو وہ چڑ کر اسے کہنے لگی۔

"ویسے ایک مشورہ دوں۔ آپ یہ کتاب واپس کر آئیں۔ اس کتاب میں بے کار قسم کے سوالز ہوں گے۔ میں آپ کو پریکٹیکلی ہزار ٹپس دے سکتا ہوں انٹرویو میں کامیاب ہونے کے لیے۔ آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے۔" وہ سینہ پھلا کر بولا۔

مشال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کتاب جھپٹی اور جانے کے لیے مڑی۔

"تو آپ کو جاب کی تلاش ہے۔ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں اس سلسلے میں؟" وہ پیچھے سے سنجیدگی سے بولا تو مشال ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

واثق نے آہستگی سے کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا۔

"اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو اس نمبر پر کال کر لیجئے گا۔ جاب خود چل کر آپ کے پاس آجائے گی۔"

وہ کارڈ کتاب کے کونے میں رکھ کر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

مشال کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر کونے سے وہ کارڈ نکال کر پڑھنے لگی اور کچھ سوچتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی۔

اتنی گہری کہ وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کس گھر میں سو رہی ہے۔ شیریں کے یا عدیل کے۔

اس کے چہرے پر کوئی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔

اور پھر وہ سرسراہٹ اس کی گردن تک آگئی۔ اس کا دم جیسے گھٹنے لگا تھا۔

اس نے گہری نیند میں خود کو جیسے آزاد کرانے کے لیے ادھر ادھر سر مارا مگر اس کا وجود جیسے کسی شکنجے میں کستا چلا جا رہا تھا۔

وہ بے بس سی ہو گئی مگر نیند کا غلبہ اس مزاحمت میں کچھ کم ہو گیا۔ کوئی اسے کھینچ رہا تھا۔ گھسیٹ رہا تھا۔

اس نے ایک زوردار چیخ ماری۔

کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بند کرنے کی کوشش کی اس کا دوپٹہ اس کے کپڑے۔ دوسرے ہی لمحے ایک قیامت ٹوٹ پڑنے کا احساس تھا جو وہ چیختی چلی گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فائزہ رابعہ

لیلۃ القدر

ادھر فلزہ آخری پیپر دے کر آئی اُدھر امی نے اپنی "مجلس شوریٰ" کا اجلاس بلا لیا۔ ایک مہینہ سے تو دونوں کے امتحانات نے فلزہ کو اپنی سدھ بدھ بھلا دی تھی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ نیند کا احساس۔ آج آخری پرچہ دے کر آئی تو بے سدھ ہو کر جو لیٹی تو آپا کی دو سالہ گلِ نازلی خنساء کے شور پر آنکھ کھلی۔ خوابوں کی دنیا سے حقیقی دنیا تک آنے میں فلزہ کو کئی منٹ لگے۔ پھر اسے یاد آیا تو خوش ہو گئی۔

"شکر الحمدللہ آج پیپرز ختم ہو گئے ہیں۔"

باہر آئی تو بڑی آپا، بھیا، شمرین بھابھی اور منصورہ خالہ کے چہرے نظر آئے اسے بہت حیرت ہوئی۔ بڑی آپا اپنے گھر میں بہت مصروف رہتی تھیں اور کئی دنوں بعد ہی چکر لگا پاتی تھیں۔

"السلام علیکم۔۔۔ آپ سب اکٹھے ہی آئے ہیں میرا مطلب ہے حسن اتفاق ہے یا باقاعدہ بلائی گئی ہیں؟" فلزہ نے خالہ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"آپا نے بلایا تھا۔" منصورہ خالہ ذو معنی لہجے میں بولیں۔

"مجلس شوریٰ" کا اجلاس تھا۔ مجلس شوریٰ کی اصطلاح ان کے تمام گھرانوں میں عام تھی۔ جب کوئی خاص مسئلہ ہوتا تو خاندان کے چیدہ افراد کو بلایا جاتا اور باہمی مشاورت سے مسئلہ حل کر لیا جاتا۔ حیرانی اسے مجلس شوریٰ کے اجلاس پر نہیں ایجنڈے پر تھی۔

"ایجنڈہ کیا تھا؟" فلزہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ایجنڈہ بذات خود فلزہ ہو گی۔

"لی بو آئی معصوم نہ بنو تمہاری شادی اور رخصتی کی بات۔ یہی ایجنڈہ تھی۔" آپ کے بھابھی نے بھی گفتگو میں لقمہ دیا۔

"میں؟ میری شادی؟" حیرانی سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ پیپرز کے دوران اڑتی اڑتی سی خبر سنی تھی کہ جو لوگ لسٹ دیکھنے آئے تھے ادھر سے گرین سگنل مل گیا ہے۔

"ہائے مجھے نہیں ابھی شادی کرنی۔" فلزہ پریشانی سے بولی۔

امی قریب سے گزریں تو اسے اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ فلزہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ امی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"جی امی۔۔۔" وہ امی کے بیڈ کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو۔۔۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ کچھ تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہے فرحان کے جس دوست کے بھائی کا رشتہ آیا تھا انہوں نے تمہارے پیپرز کے شروع میں ہاں کر دی تھی۔ میں نے سوچا کہ تمہیں امتحانات کے دوران بتایا تو تم ذہنی طور پر پریشان ہو جاؤ گی اس لیے میں انتظار میں رہی کہ تم فارغ ہو جاؤ۔ آج منصورہ اور صائمہ وغیرہ کو اسی سلسلہ میں مشورہ کے لیے بلایا تھا۔ ہم سب نے یہی سوچا ہے کہ اگلے مہینہ کی کسی تاریخ کو تمہارے نکاح کی تاریخ رکھ دی جائے۔"

فلزہ کا سانس رُک گیا۔ امی شروع سے ہی ایسی

تمہیں بہت باعمل زندگی گزارنے والی۔۔۔ دو ٹوک بات کہنے والی' بات حقوق اللہ کی ہو یا حقوق العباد کی' وہ دونوں کو عبادت سمجھتی تھیں لہٰذا سسرال' میکے والے سب ان کے خلوص کے قدر دان تھے۔

"لیکن امی! آج ہی تو میرا آخری پیپر تھا۔۔۔ کم از کم رزلٹ کا تو انتظار کر لیتیں۔" فلزہ نے درخواست پیش کی۔ جو کہ انہوں نے فی الفور رد کر دی۔

"نہیں اس کی گنجائش نہیں' تمہاری شادی کے کچھ دنوں بعد رمضان کا مہینہ آرہا ہے اور میں رمضان کا مقدس مہینہ شادی کی تیاریوں میں' بازار میں ضائع نہیں کرنا چاہتی' رمضان کے بعد ویسے بھی تمہارے بھیا کی سوڈان روانگی ہے اس لیے یہی طے پایا کہ تیاری کے لیے یہ بیس بائیس دن کافی ہیں۔"

"امی۔۔۔" فلزہ نے احتجاج کیا "رمضان تو ادھر گزار لینے دیں۔ پتا نہیں وہاں کیا ماحول ہو؟ آپ کو پتا بھی ہے میں رمضان میں کہیں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔"

"ہاں۔۔۔ یہ نکتہ صائمہ نے بھی اٹھایا تھا۔۔۔ پہلی تو ایک تو یہ بچگانہ بات ہے کہ تم رمضان میں کہیں نہیں رہ سکتیں۔ آخر زندگی میں کبھی نہ کبھی تو تمہیں ماں کے گھر سے جانا ہی ہے۔ دوسری بات ماحول کی ہے۔ ماحول کیا ہوتا ہے؟ جو میں اور تم کریں گے وہی ماحول ہو گا۔"

"امی آپ جانتی بھی ہیں پھر بھی ایسے کہہ رہی ہیں؟ آپ کو پتا ہے رمضان میں میرا تعلق دنیا سے کٹ جاتا ہے نئے ماحول میں ایسے کہاں ہو پائے گا؟"

امی ایک لمحے کے لیے چپ رہیں۔ پھر بولیں "ہمارا صرف رمضان میں نہیں پورا سال ہی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے تعلق کٹ جانا چاہیے۔"

"اف' آپ بات نہیں سمجھ رہیں' ان لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے کی اللہ جانے رمضان میں کیا روٹین ہو' پھر میں کیا کروں گی؟" فلزہ جھنجلا کر بولی۔

امی مسکرائیں۔

"میں تمہارا نقطہ نظر اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا جس طرح بارش کا قطرہ اللہ کے حکم کا محتاج ہوتا ہے اس طرح ہر جوڑ ہر رشتہ بھی اللہ کے حکم سے طے پاتا ہے۔ اگر تمہیں تمہارے مزاج کے لوگ مل گئے تو پھر زندگی تو سکوت اور جمود کا شکار ہو جائے گی۔ میری بیٹی زندگی تو امتحان ہے۔۔۔ یہاں مختلف مزاج لوگوں میں رہنا ان کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کوشش کرنا ہی مقصود و مطلوب ہے۔۔۔ یہی کوششیں "سعیا مشکورا" قرار پائیں گی نیکوکاروں کو نیکوکار اور بدکاروں کو بدکار ہی ملتے رہے تو زندگی کا مقصد ہی ختم ہو جائے۔"

"پھر بھی رمضان سے آگے نہیں لے جا سکتیں آپ؟" فلزہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارا رمضان میں عمرہ کا پروگرام بن رہا ہے اور وہاں جانے سے پہلے ہم یکسو ہو کر جانا چاہتے ہیں۔"

"پھر امی! میں آپ کے عمرہ پروگرام میں رکاوٹ ہوں؟" فلزہ خفگی سے بولی۔

"نہیں چندا! ایسی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے ہمیں زندگی دی اور اس محدود زندگی میں اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی توفیق دی' شکرانہ تو بنتا ہے ناں۔" امی نے دلیل دی۔

"رمضان کے بعد شادی کر دیں اگلے رمضان میں شکرانے کا عمرہ کر لیں۔" فلزہ نے تجویز دی۔

"یہاں پل بھر کا بھروسا نہیں۔۔۔ اگلا سال اور رمضان کس نے دیکھا ہے؟" امی نے افسردگی سے کہا۔ پانچ چھ ماہ قبل ان کے بڑے بھائی اور والدہ کا انتقال ہوا تھا جس کے بعد وہ پل بھر کے لیے بھی موت کو نہیں بھولتی تھیں۔ آئے بہانے موت کا ذکر لبوں پہ ہی رکھتیں۔ کفن تک خرید رکھا تھا۔ کیا خبر جمعہ کا دن ہو' بازار بند ہو' ہڑتال ہو یا کوئی اور معاملہ پیش آجائے۔

"گویا آپ نے طے کر لیا ہے؟" فلزہ فکر سے بولی۔

"ہاں مجلس شوریٰ کا متفقہ فیصلہ ہے۔ تم گھبراؤ نہیں اٹھتے بیٹھتے اللہ سے مدد مانگو کبھی اس نے مانگنے والے کو مایوس کیا ہے؟" امی نے سوال کیا۔ فلزہ خاموش رہی۔ اتنے میں منصورہ خالہ نے انٹری دی۔

"گھبراؤ نہیں فلزہ! یہ وقت تو ہر کسی پر آتا ہے۔" انہوں نے فلزہ کو گلے لگایا۔

"خالہ روزوں کے بعد رخصت کردیجے۔"

منصورہ خالہ ــــ آپ جانتی ہیں گیارہ ماہ جس افراتفری اور کاموں کی بھرمار میں گزرتے ہیں ایک رمضان کا ہی تو مہینہ ہوتا ہے جس میں زندگی کی بے قراریوں کو قرار آجاتا ہے مجھے تو سارا سال اس ماہ مقدس کا انتظار رہتا ہے۔"

"ہاں بات تو صحیح ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ عبادت صرف جائے نماز پر اللہ اللہ کرنے کو تو نہیں کہتے مخلوق کے بندوں سے تعلقات استوار کرنا بھی تو عبادت ہی ہوئی۔" بڑی بھابھی نے بھی اندر آتے لب کشائی کی۔

فلزہ نے نظریں جھکالیں۔ اب وہ کیا کہتی کہ پورے سال میں جو معرفت اور لذت اسے رمضان میں ملتی ہے وہ پتا نہیں نئے رشتوں میں ملتی بھی ہے یا نہیں لیکن امی بھی ٹھیک کہتی تھیں ــــ اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں تھی تبھی ہمیشہ کی طرح اس نے بڑوں کے اس فیصلے پر بھی سر جھکا دیا۔

۞ ۞ ۞

ڈر خوف گھبراہٹ اور بہت ساری خوش گمانیوں کے ساتھ فلزہ نے اپنے نئے گھر میں قدم رکھا۔ جب تک نکاح نہیں ہوا تھا تب تک ڈر اور خوف ہی پھن پھیلائے رہا جونہی نکاح کے کاغذات پر اس نے اپنے دستخط ثبت کیے ایک دم ہی دل کی کیفیت بدل گئی۔ سکون اور محبت بھرے جذبات کے ساتھ اس نے پہلی دفعہ اپنے شریک حیات کے بارے میں سوچا۔

ڈاکٹر محمد جواد رضا۔

اس کی تمام سوچوں کا مرکز و محور اب جواد کی ذات تھی ــــ رخصتی کے وقت اس کے بھی وہی جذبات تھے جو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں تاہم سسرال میں پہلا قدم رکھتے وقت وہ رب سے برکتوں اور رحمتوں کے حصول کے لیے راز و نیاز کرنا نہ بھولی عشا کی نماز کے فوراً بعد اسے اس کے کمرے میں بھجوادیا گیا۔

پانچ منٹ' دس منٹ' بیس منٹ' یہاں تک کہ انتظار کرتے کرتے اسے اونگھ سی آئی تھی جب کمرے کا دروازہ ناک ہوا اور بھاری مردانہ آواز میں السلام علیکم کی آواز سنائی دی۔

اپنے سینے میں دھڑ دھڑ کرتے دل کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" کیا کہا گویا دبستان کھل گیا ــــ صبح فجر کی نماز کے لیے جاتے ہوئے جواد اسے گھر سیدھی کرنے کا مشورہ دینا نہ بھولا۔

ولیمے کے لیے تیار ہوتے ہوئے دلہن بن کر ہال میں پہنچ کر وہ کسی کو نہ بھی بتاتی تو بھی اس کے چہرے پر پھیلے رنگ ہی بتا دیتے کہ دولہا بھائی بہت اچھے ہیں۔

۞ ۞ ۞

شادی کے بعد تین ہفتے پر لگا کر کیسے گزرے اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ بھرا پرا گھرانہ مہمان نوازی کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ گھر کے افراد کو مصروف رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اوپر سے جواد کی چلبلی فطرت' ہر وقت مصروف رہنے اور رکھنے والا بندہ ــــ اسے تاریخ تو کیا دن بھی یاد نہ تھے۔ ہاں جمعہ کے دن گھر کے افراد جمعہ کے لیے سفید لباس اہتمام سے پہنتے تو یاد آتا کہ آج جمعہ ہے۔ انہی دنوں میں امی کا فون آیا۔

"مبارک ہو بھئی ہماری سیٹ کنفرم ہوگئی ہے آج سے چھ دن بعد کی' تیسرے روزے کو جانا ہے۔ تم اگر نہ آسکو تو میں اور تمہارے ابو خود ملنے آجائیں گے۔"

فلزہ کے دماغ کی سوئی بس آج سے چھ دن بعد تیسرے روزے پر اٹکی ہوئی تھی۔ رمضان آگیا۔ مجھے پتا

ہی نہ چلا' خوشیوں میں ہنڈولے لیتا دل ایک دم بحر ندامت میں ڈوب گیا۔ واقعی شادی کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اسے تو اپنی سابقہ زندگی کے تمام روزے یاد آرہے تھے جن کی تیاری وہ دو دو ماہ قبل کر لیتی تھی۔ رمضان کے روزے رکھنے کا اس کا اپنا ہی انداز تھا۔ ہر روزہ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ گزارتی۔

رمضان میں اس کا ٹارگٹ صرف ایک ہی ہوتا تھا اور وہ تھا تربیت و تزکیہ۔۔۔ اس کے لیے وہ پہلے صفحہ سے قرآن کھولتی ہر آیت کا مطلب اور آج کے دور میں اس پر عمل کیسے ہو کے تحت وہ کئی کئی گھنٹے مغز ماری کرتی۔۔۔ کبھی سیرت کی کتب اور صحابہ کرام کے مفصل حالات زندگی کے مطالعہ میں گم ہو جاتی۔ سب سے بڑی فکر اسے اسی بات کی ہوتی تھی کہ ایسا نہ ہو جب وہ دنیا سے جائے تو اس کے سینے میں حسرتیں ہی حسرتیں ہوں۔

ہائے یہ بھی کرنے کا کام تھا جو رہ گیا' رب سے تعلق تو یوں بھی مضبوط ہو سکتا تھا۔ یہ یہ عادتیں بد کس طریقے سے چھوٹ سکتی تھیں۔ اس معاملے میں اس کا نقطہ نظر بہت واضح تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہ جمناسٹک کے کھلاڑی کو پہلے دن "ہوم ورک" کے طور پر ہاتھ کی انگلیاں پیچھے کی طرف کرنے کا کہا جاتا ہے جو اس کو ناممکن لگ رہا ہوتا ہے۔ پھر وہی جمناسٹک کا کھلاڑی ــــ جب اس کی تربیت مکمل ہوتی ہے تو انگلیاں تو ایک طرف وہ اپنے سر کو بھی پیچھے کی طرف جھکا کر کمر سے لگا لیتا ہے۔۔۔ اگر جسم کے اعضا میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے' مسلسل تربیت اور پریکٹس سے جسم کے ہر عضو کو موڑا جا سکتا ہے تو انسانی رویے کو کیوں نہیں بدلا جا سکتا؟ اس کے لیے بھی مسلسل تربیت تزکیہ اور پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا دس بارہ سال قبل رمضان میں اس نے اصلاح کے لیے جو عادت بد منتخب کی ۔ وہ غیبت تھی۔ عورتوں کی مشہور و معروف بیماری جو شب معراج بھی لوگوں کے چہروں کو تانبے کے ناخنوں سے کھرچتی دکھائی دی تھی۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ علت چھوڑنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں' اس نے پورے تیس دن غیبت چھوڑنے کی پریکٹس کی۔ گھر میں یا اسکول کالج میں جہاں یہ برائی ہو رہی ہوتی۔ وہ ناک پر رومال رکھ لیتی ۔۔۔ اور کہتی "گوشت کی بو آ رہی ہے۔"

غیبت کرنے والے اگر عمر میں اس سے بڑے ہوتے تو وہ حد درجہ احترام کرتے ہوئے حکمت کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیتی۔

بہرحال حالات میں اس نے اس برائی کے متعلق اتنا کچھ پڑھ رکھا تھا کہ گھن آتی تھی۔۔۔ بات صرف ہمت و حوصلے کی تھی۔۔۔ اور پھر پورے تیس دن کی پریکٹس نے اس کے اندر سے یہ برائی دور کر دی۔

استغفار کے عشرے کو وہ گناہوں کی فہرست بنا کے اور پھر معافی تلافی کر کے مناتی۔ پورا سال کس کس کی دل آزاری کی' آنکھ سے کیا غلط دیکھا' کانوں نے غیبت چغلی کب کب سنی' ٹانگیں کہاں غلط چل کے گئیں' زبان کے گناہ شمار کرتے کرتے تو وہ رو پڑتی۔۔۔ جوں جوں خطائیں یاد کرتی جاتی' آنسو بہتے رہتے۔

کبھی وہ شکرانے کا ہفتہ مناتی۔۔۔ نعمتوں کی فہرست بناتی۔ ایک ایک نعمت یاد کرتی اور صفحات کے صفحات کالے کر دیتی۔۔۔ کہیں بارش کی رم جھم نعمت نظر آتی تو کہیں دوست احباب' کبھی چپاتی جیسی روٹی اور ٹھنڈی ٹھار لسی نعمت ہوتی تو کبھی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں نعمت عظیم لگتیں۔ کبھی عبد اور معبود کے رشتے پر غور کرتی تو تعلق صرف دعا کا ہی نظر آتا۔ پھر کیا تھا کئی کئی دن وہ دعاؤں میں مگن رہتی۔ لمبی لمبی مسنون دعائیں تھوڑی دیر میں یاد کر لیتی' یہی بات بہت رلاتی کہ دعاؤں کے یہی الفاظ ہوتے ہوں گے جو چودہ سو سال قبل محبوب خدا

کے لبوں پر ہوتے ہوں گے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کی ہر دعا اُسے یاد تھی۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان دعاؤں کی کرامات تھیں کہ وہ ہر آفت سے محفوظ اور ہر دل کی دھڑکن تھی۔

کسی رمضان میں وہ اپنے اردگرد کے محتاجوں ناداروں کی فہرست بناتی اور دادی اماں 'نانی' پھوپھو سے رقم جمع کر کے ضرورت کی اشیا ان تک پہنچا آتی۔۔۔ ہسپتالوں میں یخنی 'کھچڑی' بھیجتے تو رمضان کے

علاوہ بھی ثواب دارین سمجھ کرے جاتی تھی۔

کئی چھوٹی موٹی کوششیں تھیں جو شاید بارگاہ الٰہی میں مقبول ٹھہریں کہ سال کی تین سو پینسٹھ راتوں میں سے رمضان کی آخری طاق راتیں۔ اور ان پانچ طاق راتوں میں سے ایک رات اور اس ایک رات میں سے پورے سال کا جو ہر اللہ نے اسے عطا کیا جسے دنیا لیلتہ القدر کی گھڑی کہتی ہے۔۔۔! انوار و تجلیات کے چند چھینٹے اس کے دل پر بھی پڑے۔ اوپر والے کے کرم سے وہ بھی اس گھڑی میں مالا مال ہوئی۔ بس پھر کیا تھا فلزہ کا اللہ سے تعلق اور مضبوط ہو گیا۔

رمضان اور فلزہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے۔ رب کو راضی رکھنے کے اپنے اپنے طریقے رمضان میں اس کے من میں سماتے نہ معلوم وظیفہ اسے سب بے نیاز ہو کر ان پر عمل کے لیے کمر بستہ ہو جاتی۔۔۔ ہر نعمت پر شکرانے کے نوافل ادا کرتی۔

اور اب اب۔۔۔ فلزہ نے بھر بھری سی لی آب یہی یاد نہیں کہ تین دن کے بعد رمضان شروع ہے۔۔۔ وہ خوب روئی۔ رونے کا شغل جاری تھا کہ فلزہ کی نند قدسیہ اندر آئی۔

"ہائیں بھابھی! آپ کو کیا ہوا؟ آپ رو رہی ہیں؟" فلزہ نے آنسو پونچھے۔

"ہاں اصل میں مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ تین دن کے بعد رمضان شروع ہو رہا ہے۔ تو یہ سوچ کر مجھے رونا آگیا کہ میں اتنی غافل ہو گئی ہوں؟ میں تو روزوں کا بہت پہلے سے اہتمام شروع کر دیتی تھی۔"

"سچ بھابھی پھر تو بہت مزہ آئے گا۔ ہمارے ہاں بھی روزوں کا بہت اہتمام ہوتا ہے۔ جواد بھائی کو پالک کے پکوڑے پسند ہیں۔ مجھے آلو والے پکوڑے 'مونو کو بینگن کے پکوڑے۔۔۔ راضیہ ورقی سموسے بہت اچھے بناتی ہے۔ آلو میں چکن اور انار دانہ مکس کر کے۔ آپ یقین کریں اس طرح کے پکوڑے پورا رمضان روزانہ ہی بنتے ہیں 'ابو کو نہ پالک کے پکوڑے پسند ہیں نہ بینگن کے۔ پتا ہے وہ کون سے پکوڑے بنواتے ہیں' انڈوں کے۔۔۔ ابلے انڈے پر بیسن لگا کے خاص

پکوڑے بنتے ہیں۔۔۔ بہت مزے کے اور اس سے بھی مزے کی بات یہ کہ ہر طرح کے پکوڑوں کے لیے چٹنی بھی الگ الگ۔۔۔ ابو املی کی چٹنی کے ساتھ انڈوں کے پکوڑے کھاتے ہیں۔۔۔ جواد بھائی پالک کے پکوڑوں کے ساتھ انار دانے کی چٹنی بنواتے ہیں 'مونو بینگن کے پکوڑوں کے ساتھ پودینے کی چٹنی لیتی ہے۔ امی بے چاری تو بارہ بجے ہی افطاری کی تیاری میں مصروف ہو جاتی ہیں۔"

فلزہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا کہے اور کیا نہ کہے 'اللہ کی رحمت اور مغفرت پر 'جنت کی بشارتوں پر پکوڑے کیوں غالب آگئے؟ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا۔

"قدسی یہ تو پھر پکوڑوں کا مہینہ ہوا۔"

"ہاں تو دادا ابا شوگر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے سب سے زیادہ پکوڑے وہی بنواتے ہیں اجوائن ڈال کے۔ ابا کہتے ہیں رمضان میں دستر خوان وسیع کرنا چاہیے۔ اللہ راضی ہوتا ہے۔ ابا تو آلو' پیاز' بیسن بھری بوریاں بھر بھر کے سامان ڈلواتے ہیں۔۔۔ بکرا تو بے چارہ رمضان سے ایک دن پہلے ہی فریزر میں پہنچ جاتا ہے۔ اصل میں رمضان میں ہمارے ہاں رات کو سویا نہیں جاتا۔ تایا ابو ان کی فیملی سے اسکائپ پر بات کرنا ہوتی ہے۔ عظمیٰ آپی نیویارک ہوتی ہیں وہ بھی بلا ناغہ اسکائپ پر آتی ہیں اور پکوڑوں سموسوں سے سجا دستر خوان دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ آپ کو تو پتا

ہی ہے کہ جب انسان رات کو جاگتا رہے تو کتنی بھوک لگتی ہے "کیا آپ کے ہاں رمضان ایسے نہیں گزرتا؟" لمبی گفتگو کے بعد بالآخر سوال کر کے وہ خاموش ہو گئی۔

"نہیں بھئی ہمارے ہاں تو پہلے دودھ سوڈے کی بوتل کے ساتھ پھر فروٹ چاٹ کھجوریں تو موجود ہوتی ہی ہیں۔ تراویح کے بعد سادہ سا کھانا۔" فلزہ نے اطمینان سے کہا۔

"تو بھا بھی آپ لوگ۔۔۔؟" قدسیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

"آپ رات کو نہیں جاگتیں؟"

"جاگنے کے لیے کھانے کی شرط نہیں میں تو خود ساری رات جاگتی ہوں۔" اب فلزہ۔۔۔ سنبھل چکی تھی۔۔۔ نئے گھر نئے لوگ نئے رشتوں میں رمضان میں کچھ نیا۔ ایسے ذہن میں بھی آرہا تھا۔ اس لیے وہ بہت مطمئن تھی۔۔۔ اٹھ کے وہ امی کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

رمضان کی پہلی رات بھی آگئی۔ اب فلزہ بیٹھے، ہلی فلزہ تھی۔ جواد کو اس نے پلان میں شریک کرنا چاہا۔ اس نے پہلے تو کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"نہ بابا نہ۔۔۔ سب سے زیادہ چٹورا اور چٹخورہ تو میں ہی ہوں تمہیں کیا پتا سارا سال مجھے رمضان اور سو طرح کی ڈشز کا ایسے انتظار رہتا۔۔۔ میں کیسے سب کے سامنے منہ بھر کے کہہ دوں بھئی فلزہ میری تو طبیعت ٹھیک نہیں میرے لیے سادہ سا کھانا بنانا۔" پھر فلزہ کی روتی صورت دیکھ کر وہ بھی مان گیا۔

"اف۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔۔۔ ہم بھرپور تعاون کی یقین دہانی کراتے ہیں۔" حکمرانوں کے سے انداز میں اس نے ہامی بھری۔

"شکریہ شکریہ۔۔۔ جب آپ میرے جیسے رمضان گزاریں گے پھر آپ کو پتا چلے گا کہ رمضان کو نیکیوں کا موسم بہار کیوں کہتے ہیں۔ بھلا بھرے پیٹ بھی کبھی معرفت کی باتیں سوجھی ہیں؟ بھرے شکم کے ساتھ قیام ہو سکتا ہے؟ غار حرا تو فاقوں کا راستہ تھا! علم اور نور کا سمندر تو وہاں غور و فکر سے۔۔۔ بہہ نکلا تھا ورنہ صادق اور امین تو مکہ والوں نے بھی کہہ رکھا تھا!" فلزہ بڑے جذب سے بولی۔

جواد بس فلزہ کو دیکھتا ہی رہا۔ اس کی چمکتی رنگت کو وہ فیشل اور کلینزنگ کی برکات سمجھتا آیا تھا یہ تو اسی نور کا ایک چھینٹا تھا۔

"اور آپ نے بیچ چوراہے میرا بھانڈا نہیں پھوڑنا کہ میں نے آپ سے کہا ہے کہ میرے لیے کوئی خاص اہتمام نہ کیا جائے۔" فلزہ نے کہا۔ "قسم سے رمضان کے بعد جو کہیں گے بنا دیا کروں گی" اصل میں ہر وقت چولہے کے آگے رہ کر رمضان ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"توبہ توبہ میری مجال۔۔۔" جواد نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "جو کہو گی ویسے ہی کروں گا۔"

☼ ☼ ☼

پہلے روزہ کے قیمتی چھ سات گھنٹے گھر کے مکینوں نے سو کر گزار دیے تھے۔ لمبی نیند کے بعد سب سے پہلے انگڑائیاں لیتے ہوئے جواد کمرے سے برآمد ہوا۔۔۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ اس کے قدم وہیں تھم گئے۔ سفید براق سوٹ میں سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے فلزہ نے قرآن ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ قریب ہی لیپ ٹاپ پر قاری مشاری راشد کی تلاوت والی سی ڈی چل رہی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد ابا باہر آئے۔ ان کے لیے بھی یہ حیرت انگیز تھا وہ کشن لے کر وہیں لیٹ گئے۔ پھر قدسیہ، امی، دادا ابا بھی آگئے۔

"واہ بھئی دلہن نے تو رمضان کا سا ماحول بنا دیا۔" دادا ابا نے کہا۔

"ہم تو خود روزانہ ایک پارہ پڑھتے ہیں لیکن اس طرح سنا کبھی نہیں۔" ابا نے کہا۔

"لیکن اچھا لگ رہا ہے۔"

باتوں اور ہلچل کی وجہ سے فلزہ سی ڈی بند کر چکی

تھی۔ قرآن مجید کو ریک پر رکھتے ہوئے اس نے بڑے ادب اور احترام سے کہا۔

"دادا ابا! رسول اللہ سارا سال قرآن خود پڑھتے تھے لیکن رمضان میں ہر سال جبرئیل امین سے سنا کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے بعض اوقات پڑھنے سے زیادہ سننا محبوب اور مسنون عمل بن جاتا ہے۔"

"ارے واقعی۔" دادا ابا حیرانی سے بولے۔

"امی آج افطاری میں کیا بنائیں؟" قدسیہ نے موضوع بدلا۔

"بھئی میرے لیے تو کوئی خاص اہتمام نہ کرنا۔ کیوں کہ شادی اور دعوتوں کے کھانے کھا کھا کر اب میرا پیٹ یہ سب برداشت نہ کرے۔" بہت اداکاری سے جواد نے کہا۔

"سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں' تلی ہوئی چیز نہ ہی کھاؤں۔" امی نے چند دن پرانی معدہ کی تکلیف کی وجہ سے کہا۔

"میں بھی سوچ رہی تھی کہ تلنے تلانے والا کام رمضان میں کم ہی کرنا چاہیے' معدہ پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔" فلزہ نے پرجوش ہو کر کہا۔

"لیکن رمضان میں اللہ جی نے کہا ہے دسترخوان وسیع کرو۔" ملازمہ نے بھی دخل اندازی کی۔ اس گھر کے وسیع دسترخوان کی وجہ سے بے چاری بھی نت نئی اشیا لے جاتی تھی۔

"دسترخوان وسیع کرنے کا مطلب آلو بینگن' پالک گوبھی اور چکن کے پکوڑے نہیں ہے شمو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ رمضان میں تم جو بھی بناؤ وہ زیادہ مقدار میں بناؤ اور ان لوگوں تک پہنچاؤ جو سارا سال ترستے ہیں۔" فلزہ نے نرمی سے کہا "جن بے چاروں کو پتا ہی نہیں کہ آلو' دال سے اوپر بھی کچھ بن سکتا ہے۔"

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" امی نے کہا۔ "اس طرح کے پکوڑے بنا کے طبیعت ویسے ہی اوبھ جاتی ہے۔ اور رمضان تو دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا کہتا ہے۔"

فلزہ کی آنکھوں میں چمک آگئی "امی جان! فروٹ چاٹ تو کھا سکتی ہیں ناں؟"

"ہاں دیکھ لو۔۔۔ بھی بنائی تو نہیں۔" امی نے اجازت دی۔

قدسیہ اور فلزہ افطاری کے لیے ظہر کی نماز کے بعد سے ہی کچن میں گھس گئیں۔ قدسیہ نے نوٹ کیا کہ فلزہ بس کچھ نہ کچھ پڑھ رہی ہے۔ آنسو پونچھ رہی ہے۔ خود بخود مسکرا رہی ہے۔ انہی جھمیلوں میں عصر کی نماز پڑھی گئی۔ اور افطاری کا وقت قریب آگیا۔ قدسیہ نے لپک جھپک دسترخوان لگایا۔

"واؤ۔۔۔ امی کی چٹنی شکل سے تو اچھی لگ رہی ہے۔" جواد نے کہا۔

"بس آلو کے پکوڑے فروٹ چاٹ اور بھلے۔"

دیکھتے ہی سب کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں۔

سب لوگ ڈشوں میں موجود اشیا کے معائنہ میں مصروف تھے جب اچانک۔۔۔ بالکل غیر متوقع طور پر فلزہ نے کہا۔

"دادا ابا' روزہ دار کی دعا اللہ کبھی رد نہیں کرتا۔ آپ دعا کروائیں گے۔" دادا ابا گڑبڑا گئے۔

"ہم۔۔۔ میں' بھئی میں تو مریض بندہ ہوں روزہ ہی نہیں رکھا۔ ایسا کرو تم خود ہی دعا کرواؤ۔ ہم بھی شریک ہوتے ہیں۔"

ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر فلزہ نے ہاتھ اٹھائے۔

پانچ منٹ اور چھبیس سیکنڈ میں اس نے اپنے رب سے کیا کیا نہ مانگ لیا۔ رحمت' ہدایت' مغفرت' جنت' عافیت' برکت۔۔۔ لفظ اس کے اپنے تھے تاثیر اوپر والے نے ڈال دی۔ روزہ کھلنے کے سائرن کی آواز پر جب اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا تو نہ صرف اس کے اپنے ہاتھ آنسوؤں کی نمی سے گیلے ہو رہے تھے بلکہ باقی سب بھی ٹشو سے منہ صاف کر رہے تھے۔

پھر اس کے بعد اس نے دیکھا کہ روزہ کھلنے کے بعد کم ہی بات ہوئی' بقول جواد اور قدسیہ کے ساری ساری رات لذت طعام کا تذکرہ جاری رہتا وہ صورت

حال نہ تھی۔ سو نماز پڑھ کے آئے تو فلزہ کھانے کے لیے دسترخوان لگا چکی تھی۔ یخنی پلاؤ، رائتہ، کمدہ گوشت اور تازہ تازہ پھلکے۔

"بہت مزے کا ہے۔" کہہ کر سب نے انصاف کیا۔

جب سب تراویح کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ دادا ابا نے جیب سے کڑکڑاتا ہوا نیلا نوٹ نکال کے اس کے حوالے کیا۔

"ارے بھئی ہمیں تو پتا ہی نہ تھا کھانوں کی لذت پر مانگنے کی لذت کیسے غالب آئی ہے۔ کل سے ہم بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کے سی ڈی پر قرآن سنا کریں گے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ اور یہ نوٹ تمہارا چھوٹا سا انعام ہے۔ اچھی ماں کی بچی ہو جس نے رب سے مانگتے ہوئے ہمیں بھی مانگنے کا ہنر سکھا دیا۔"

فلزہ کا پورا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"دادا ابا میں نے ایک پروگرام میں سنا بھی تھا اور حدیث مبارکہ بھی پڑھی تھی کہ رمضان میں جب لیلتہ القدر کی وہ مخصوص گھڑی ہوتی ہے تو اس وقت جو شخص بھی اللہ کو یاد کر رہا ہو خواہ قیام میں ہو یا ذکر اذکار میں، اس سے جبرئیل امین مصافحہ کرتے ہیں۔ دادا ابا! جبرئیل امین۔۔۔ جن کی آمد کا سلسلہ وصال نبی اکرم کے بعد بند ہو گیا تھا۔ اس کی علامتیں بھی بتائی گئی تھیں کہ مانگنے والے کے خوف خدا سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے، اردگرد کے ماحول پہ سکینت طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت جبرئیل امین مصافحہ کرتے ہیں۔"

دادا ابا گم صم سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

"بیٹا جو پورا سال رب کی بارگاہ میں حاضری کا شرف فجر کی نماز سے پہلے پاتا ہے۔ رب سے راز و نیاز کرتا ہے پورا سال کوششوں میں رہتا ہے، اسے ہی یہ نعمت ملتی ہو گی ہم جیسوں کو کہاں؟"

"لیکن دادا ابا مجھے تو۔۔۔" ایک دم فلزہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کہیں اپنی کیفیت اور انعام کا ذکر ریاکاری میں تو نہ آ جائے گا۔ لیکن دادا ابا سب سمجھ گئے۔ وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ جب اچانک ہی فلزہ کی نظر دروازے میں کھڑی قدسیہ پر پڑی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔

"فلزہ بھابھی واقعی! کیا سچ مچ آپ کو لیلتہ القدر ملی تھی؟" فلزہ کی آنکھوں سے اب جیسے سوتے پھوٹ پڑے۔

"فلزہ بھابھی۔۔۔ کیا مجھے لیلتہ القدر مل سکتی ہے؟" بے یقینی سے قدسیہ نے کہا۔ فلزہ بے ساختگی سے بولی۔

"کیوں نہیں۔۔۔؟ اگر تم بھی رمضان رب کو راضی کرنے کا مہینہ سوچ کر مناؤ۔"

"تو ٹھیک ہے، انشاء اللہ میں بھی آج رات کو آپ کے ساتھ تراویح پڑھنے جاؤں گی۔ قرآن ترجمے سے پڑھوں گی۔۔۔ اور۔۔۔ اور" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں بھی سموسے پکوڑوں کے بجائے رب کی معرفت کی لذت پاؤں گی۔"

دادا ابا بہت حیرانی سے اس کا مکالمہ سن رہے تھے اور فلزہ کو لگ رہا تھا آج اس کی وہی کیفیت ہے۔۔۔ جو دس سال پہلے تھی جب لیلتہ القدر کی بابرکت گھڑی ملی تھی۔ جب اس کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس کی عبادتوں ریاضتوں کو قبولیت کا اوپر والے نے سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ انوار و تجلیات کی جھلک دکھائی تھی۔ آج "آج اس زمین پر اس کے بندوں نے اس کی کوششوں کو سراہا۔۔۔ کیا یہ لیلتہ القدر سے کم نہیں۔ پھر اس کے بعد کا منظر بڑا سہانا تھا۔

صدف آصف

ڈھل گیا ہجر کا دن

"میم پلیز مجھے آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے۔" انا نے دفتر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی' ملاحت نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"جی۔ انا۔ آیئے نا۔ سب خیریت تو ہے؟" ملاحت نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا اور سامنے کھلے لیپ ٹاپ پر فائل کو محفوظ کیا۔

"جی۔ بس وہ ایک بات کرنی تھی۔" انا نے اس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ تو ملاحت نے جلدی سے بکھرا ہوا سارا کام سمیٹنا شروع کیا۔

"ہوں۔ اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" ملاحت نے دو منٹ بعد ہی اپنی ساری توجہ سامنے کھڑی انا کی طرف مبذول کر دی۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ساتھ گھڑی میں وقت بھی دیکھا۔

آج کا دن اس کے لیے اپنے ساتھ بڑی مصروفیت لے کر آیا۔ پہلے ٹیچرز کے ساتھ طویل میٹنگ۔ پھر ایڈمیشن والوں کے معاملات دیکھنے پڑے۔ ادارے میں ایک نئی اسسٹنٹ آئی تھی۔ اس کے لیے قریشی صاحب سے سر کھپایا۔ اب جبکہ اسے تھوڑی ہی دیر بعد ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ تو انا اپنا مسئلہ لے کر آ گئی۔ کئی سالوں بعد اس کی چھوٹی بہن شباہت آسٹریلیا سے اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ وطن لوٹ رہی تھی۔ جانا بھی ضروری تھی۔

"وہ۔ میم۔ اصل میں۔" انا کچھ بولتے بولتے

مکمل ناول



دوبارہ چپ ہوگئی' اچانک اس کی بڑی بڑی دلنشین آنکھیں کھارے پانی سے لبالب بھر گئیں' ملاحت کو اسی بات سے چڑ تھی۔ اس نے زندگی کی تلخیوں سے سبق سیکھا تھا کہ لوگوں کے سامنے آنسو بہانا فضول ہے' کسی کو روتا دیکھ کر دنیا والے اس کی کمزوری بھانپ جاتے ہیں' پھر تاعمر اس کو رلایا ہی جاتا ہے۔

"پلیز انا پہلے تو یہ آنسو پونچھو اس کے بعد مجھے آرام سے پوری بات بتاؤ۔" اس نے ٹشو پیپر کا باکس اس کے سامنے رکھ کر ہمدردی سے کہا۔

"آپ سر غفران کو جانتی ہیں نا؟" انا کے حواس درست ہوئے تو کچھ بھر بعد اس نے الٹا سوال کیا۔

ملاحت نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دیا۔

"غفران ..... وہ لڑکا جو ہمارے یہاں اسٹیٹس پڑھاتا ہے۔" اسے خاموش طبع اور بے ضرر سا سانولی رنگت والا لڑکا۔۔۔ یاد آگیا۔

"جی۔۔۔ میم۔۔۔ وہی۔" انا نے معصومیت سے سر ہلایا۔

"انا کیا اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے؟" اس نے گھبرا کر فوراً" پوچھا۔ اپنے کوچنگ کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ہمیشہ سختی برتتی تھی۔

"ارے نہیں میم۔۔۔ جیسا آپ سوچ رہی ہیں ویسی کوئی بات نہیں۔ بس انہوں نے مجھے شادی کے لیے پروپوز کیا ہے۔" ملاحت کی بدگمانی دور کرنے کے لیے وہ بات بھی اس کے منہ سے روانی سے نکل گئی۔ جسے بتانے میں اسے جھجکاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"اوہ اچھا گڈ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' مبارک ہو بھئی' مٹھائی کہاں ہے؟" ملاحت نے اطمینان بھرا سانس لیا اس کے موبائل کی تیز رنگ ٹون بجی۔

"مس کالنگ۔" ملاحت نے اپنا سیل فون اٹھا کر چیک کیا تو۔۔۔ انس کے پرانے نمبر سے کال آرہی تھی۔

"اوہ تو۔۔۔ جناب کی وطن واپسی ہوگئی ہے۔۔۔ اف۔۔۔ اب یہ مسلسل کال کرتا ہی رہے گا۔" وہ اس کی عادتوں سے باخبر تھی۔۔۔ انا کے سامنے بات کرنا مناسب نہ لگا۔ اسی لیے اس نے جلدی سے لائن کاٹ کر سیل فون کا سوئچ آف کر دیا۔

"جی مبارک باد کا شکریہ مگر میم بات کچھ اور بھی ہے۔" انا کے چہرے سے وہ خوشی مفقود تھی جو ایسے موقع پر لڑکیوں کے چہرے سے پھوٹتی نظر آتی ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔

"اچھا تو۔۔۔ تمہیں غفران پسند نہیں ہے تو پھر انکار کردو؟" ملاحت نے اس کی ہچکچاہٹ سے اندازہ لگایا۔

"نہیں میم۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے جیسے گھرانوں میں لڑکے کی شکل و صورت نہیں کمائی اور شرافت پر کھی جاتی ہے اور غفران اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔" انا کی سنجیدہ اور بالغ سوچ نے ملاحت کو خوشی فراہم کی۔

"تمہاری غفران سے پہلے کی انڈر اسٹینڈنگ ہے جو تم ان کے بارے میں اتنا جانتی ہو؟" ملاحت نے بجلدی" وہ سوال کر ہی ڈالا جو اس کی زبان پر آکر رک رہا تھا' اسے لگا کہ شاید ایک ساتھ پڑھانے کی وجہ سے اس رشتے میں دونوں کی پسندیدگی شامل ہوگی۔ ملاحت نے برسوں پہلے چند بچوں اور ایک عمارت پر مشتمل "ارفع کوچنگ سینٹر" کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کی شہر میں مزید تین شاخیں کھل چکی تھیں۔ اسی تعلیمی ادارے کی ایک بہت ہونہار ٹیچر تھی انا۔

"وہی تو۔۔۔۔ آپ بھی یہی سمجھیں بس اسی سوال سے تو میں ڈر رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ دراصل وہ میرے دور پرے کے کزن بھی لگتے ہیں' بلاوجہ کے اسکینڈل سے بچنے کے لیے میں نے کام کے اوقات میں انہیں یہاں غیر ضروری بات چیت کے لیے منع کیا ہوا تھا۔ پتا نہیں انہیں میری کون سی بات پسند آگئی جو انہوں نے اپنی امی یعنی پھپھو رضوانہ کو کل رشتے کے سلسلے میں میرے گھر بھیج دیا۔" انا نے تفصیل سے بیان کیا۔

"اچھا تو پلیز۔۔۔ اب مجھے مختصراً" یہ بتاؤ کہ اس رشتے میں قباحت کیا ہے؟ اصل میں مجھے کسی ضروری کام

سے لگتا ہے۔" ملاحت نے کاغذات دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میم۔ آپ تو میرے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ میں گھر سے کتنی مجبوری کے تحت نکلی ہوں۔ جس دن میں نے پہلی بار گھر سے باہر قدم نکالے تو میرے بیمار اور کمزور ابا نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "بیٹا۔ اس خاندان کی تم پہلی لڑکی ہو جو نوکری پر جا رہی ہو۔ یاد رکھنا اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔" میں نے ان کا مان رکھا' بہت بچ بچا کر اور محتاط طریقے سے اپنے فرائض انجام دیے۔ تب جا کر یہ نیک نامی حاصل ہوئی ہے۔ اب میں نہیں چاہتی میری ساری ریاضت اکارت ہو جائے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تو ملاحت بھی افسردہ ہو گئی۔

"ہاں۔ کبھی کبھی انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ خیر اس بات۔ کا تمہاری شادی سے کیا تعلق بنتا ہے؟" ملاحت نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"جیسا آپ نے سوچا۔ ویسا ہی دنیا بھی سوچ سکتی ہے کہ میں نے کام کے دوران عشق لڑایا ہو گا۔ یا کیونکہ غفران بھی کہیں پڑھاتے ہیں' اس لیے ان کے ساتھ میرا کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہو گا۔ میری شخصیت تو سب کی نظر میں مٹی کا ڈھیر بن جائے گی۔" اس نے جو باتیں کی' ان میں ملاحت کو اپنے ماضی کی بازگشت سنائی دی۔

"ہو سکتا ہے یہ سب تمہارا وہم ثابت ہو' کوئی ایسا نہ سوچے۔" ملاحت نے کھو کھلے انداز میں اس کو تسلی کروائی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ لوگ ان کے بارے میں بولنے سے قبل بالکل نہیں سوچتے۔ میں نہیں چاہتی یہ طالب علم جو آج مجھ سے نظریں جھکا کر بات کرتے ہیں' کل ان کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخر ہو۔" ملاحت نے ہونٹ بھینچے۔ اس کے دل میں درد سا اٹھا۔ ماضی کے دریچے سے جھانکتی ہوئی ملامتی نظر تک' زخم ہرے ہو گئے۔

"بس یا اور کچھ؟" اس نے دھیرے سے پوچھا' ثنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسا ویسا نہیں سوچا۔ دل میں ایک بات آئی تو تم سے پوچھا۔ برا جب ہوتا کہ بغیر کسی تصدیق کے میں تمہارے کردار پر انگلی اٹھاتی۔ جیسے کہ ہمارے معاشرے میں عموماً ہوتا ہے۔ خیر ایک بات جانو مجھ پر اعتبار ہے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"جی۔ میں نے جب امی سے غفران کے لیے انکار کیا تو انہوں نے اور میری چھوٹی بہن ثنا نے زور دیا کہ مجھے ایک دفعہ آپ سے اس معاملے میں مشورہ کرنا چاہیے۔ امی آپ پر بہت اعتماد کرتی ہیں اور ظاہر سی بات ہے میں بھی۔ تب ہی تو یہ مسئلہ آپ کے پاس لے کر آئی ہوں۔ اس لیے بے اعتباری کیسی؟" انعم نے افسردگی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میڈم۔ ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ دیر ہو جائے گی۔" چپڑاسی نے آفس کے دروازے پر آ کر اطلاع دی تو ملاحت نے مزید انتظار کرنے کا کہلوایا۔ وہ اس بات کو اب یوں ادھوری چھوڑ کر نہیں اٹھ سکتی تھی' جانا ضروری ہی سہی۔ پر انا کی زندگی سے زیادہ نہیں' وہ پاگل لڑکی خوشیوں بھری دستک کو نظر انداز کرنے جا رہی تھی' اسے سمجھانا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ ایک اور ملامتی تنہائی کا زہر چکھنے کے لیے تیار ہو جاتی۔

"ثنا میری بات غور سے سنو' اگر تم صرف دنیا والوں کے ڈر سے انکار کر رہی ہو تو یہ بے وقوفی بالکل مت کرنا۔" ملاحت نے کچھ سوچتے ہوئے اسے پیار سے مخاطب کیا۔ "تمہیں کوئی اور اعتراض تو نہیں' میرا مطلب اس کی شکل و صورت وغیرہ سے ہے۔" ملاحت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اپنی ٹیچرز کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"ارے نہیں۔ میم امی ہو میرے لیے جس کا بھی انتخاب کریں گے۔ وہ ہی میری لوگین پسند بن جائے

گا۔ ویسے بھی جب سے غفران کی امی نے ہمارے حالات دیکھتے ہوئے جہیز لینے سے صاف منع کیا ہے یقین جانیں ان لوگوں کی قدرو منزلت میرے دل میں بڑھ گئی ہے۔ ہاں جو بات مجھے پریشان کررہی ہے وہ یہ

ہے کہ میرے جانے کے بعد گھر کا خرچا کیسے چلے گا؟ میری تنخواہ سے گھر کے کافی مسائل حل ہو جاتے ہیں' ابو کی قلیل پنشن میں تو ان لوگوں کا گزارا مشکل ہو جائے گا۔" انا کا اعتماد لوٹ آیا۔

"گڈ۔ اچھا ہوا تم نے مجھ سے ہر بات شیئر کی۔ اب میں چاہوں گی کہ تمہیں میں گائیڈ نہ ہونے دوں امید کرتی ہوں تم بھی میرا مان رکھو گی۔ سب سے پہلے تو تم "دنیا کیا کہے گی" والی بات کو اپنے دماغ سے نکال کر شادی کے لیے ہاں کردو' کیونکہ اگر دنیا کی پروا کرتے بیٹھ جاؤ گی تو کچھ بھی نہ کرسکو گی۔" ملاحت کا شیریں انداز انا کے دل پر اثر انداز ہونے لگا۔ مگر وہ پھر بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"تھنک یو میم۔" انا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"یہ اگر' مگر' لیکن' پر۔ ایسے لفظ ہیں جو بلاوجہ کے جواز کھڑے کردیتے ہیں۔ بنتے بنائے کاموں کو بگاڑنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

مجھ سے وعدہ کرو تم انکار نہیں کرو گی۔ قدرت نے اگر تم پر اپنا کرم کیا ہے تو اس کو نظر انداز کرنے کی غلطی بالکل مت کرو۔ ایک پرمسرت زندگی تمہارا انتظار کررہی ہے۔" ملاحت نے اسے سمجھایا۔

"جی۔ جی۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔" انا بے ساختہ بولی۔

"اچھا میم آپ جائیں کہیں آپ کو دیر نہ ہو جائے۔" اس نے مسکرا کر کہا اور بلالیا۔

"ہاں۔ دیر تو ہو ہی گئی ہے۔" ملاحت کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا اس نے اپنا براؤن قیمتی لیدر بیگ کاندھے پر لٹکایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ انا نے اس کی تقلید کی' چپڑاسی نے ملاحت کا لیپ ٹاپ اٹھایا اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ "کیا کمی ہے میم میں۔ عمر بھی زیادہ نہیں ہوگی۔ پتا نہیں ان کے کیا مسائل ہیں۔ جو تنہا زندگی گزار رہی ہیں؟" انا کی نظریں ملاحت کا پیچھا کرنے لگیں "اسکن کرتا" براؤن جینز پر بہت بیچ رہا تھا۔ اس نے بڑی نفیس شال اوڑھی ہوئی تھی۔ کوریڈور میں سر جھکائے چلتے ہوئے وہ حسن کی

لواس مورت لگی۔

"تم۔ میری بات کا مان رکھنا غفران اچھا لڑکا ہے' کسی کی وجہ سے اکیلی زندگی میں قدم نہ رکھو کہ تمہارے پاس سوائے تنہائی کے کچھ نہ بچے۔ کسی بھائی' بہن یا دنیا والوں کے ڈر سے انکار مت کرنا اس بات پر یقین رکھنا کہ رزق دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔ اگر اس کی مرضی نہ ہو تو ہمارے تمہارے اختیار سے باہر کی بات ہے کہ ہم کسی کو ایک وقت کا کھانا بھی کھلا سکیں۔ اگر تم نہ ہو گی تو وہ لوگ بھوکے نہیں مریں گے۔ وہ مسبب الاسباب خود ہی سبب بنادے گا' کیونکہ رزق دینے کا وعدہ تو اس کا ہے۔" ملاحت نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اسے ایک بار پھر سمجھایا۔

"جی۔ میم یہ تو حقیقت ہے۔" انا نے دھیرے سے کہا۔ وہ ڈرائیور کی وجہ سے بات کرتے جھجک رہی تھی۔ اللہ حافظ کرتی وہاں سے فوراً" ہٹ کر دور جا کھڑی ہوئی۔

"اپنے بھائی کو میرے پاس بھیج دینا۔ اس کی تعلیم کا خرچا اٹھانے کے ساتھ میں۔ اسے یہاں کسی نوکری بھی رکھ لوں گی۔" کچھ سوچ کر گاڑی سے اتر کر اس کے قریب پہنچ کر خوش خبری دی' وہ کھل اٹھی۔

"میم شکریہ۔ آپ کے پرخلوص انداز اور محبت بھرے عمل نے مجھے صحیح فیصلہ کرنے کے لیے نئی توانائی بخش دی۔" تشکر سے انا کی آنکھیں بھر آئیں۔

ملاحت نے گاڑی میں بیٹھتے ہی گلابی ہوتی آنکھوں کو براؤن گلاسز کی اوٹ میں چھپایا' چہرے پر سرد مہری کا دبیز غلاف چڑھایا اور بے تاثر سی باہر کے نظاروں میں کھو گئی۔

اس کا موبائل ایک بار پھر تسلسل سے بجنے لگا' جے

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی آن کیا تھا۔ "انس کالنگ" اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔ ملاحت۔ کیسی ہو؟" انس کی گمبیر نرم آواز نے اس کے بے چین دل کو قرار بخشا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟" وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔ ملاحت کی آواز سن کر انس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

"ہا۔ ہا۔ جی رہے آپ کی یادوں کے سہارے۔" وہ حسب عادت شروع ہوا۔

"اچھا۔ کام کی بات کریں۔" ملاحت نے کن انکھیوں سے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے اسے ٹریک پر واپس لانا چاہا۔

"کام کی بات سے مطلب؟ تم سے ملنا ہے۔" انس نے دہونس جمائی۔ وہ ویسے کافی رسا تھا۔

"اچھا۔ آج تو۔ شاہت امریکہ سے واپس آرہی ہے' فری ہو جاؤں تو کال کر کے بتاتی ہوں۔" ملاحت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید اصرار کرتا فوری طور پر رابطہ منقطع کر دیا۔ انس کو بیرون گئے کئی سال گزر چکے تھے اس کے باوجود وہ اسے بھولا نہیں تھا۔ اس کے گریز کے باوجود وہاں سے بھی فون پر اس سے رابطہ قائم رکھا اور ہر سال ملاحت کی برتھ ڈے پر وشنگ کارڈ کے ساتھ پھول بھجوا تا رہا یہاں تک کہ ملاحت کے بھائی اعزاز سے بھی رابطہ قائم رکھا۔ اس کے خلوص میں کوئی شک نہ تھا پر ملاحت کو اپنی ذمہ داریوں کا خیال تھا۔

"پلیز۔ انس میرے پیچھے آکر کیوں اپنا رستہ کھوٹا کرتے ہو۔ ماں کی نافرمانی کر کے گناہ گار بن رہے ہو۔ وہیں کوئی اچھی لڑکی ڈھونڈ کر شادی کر لو۔" ایک دن انس کا فون آیا تو وہ سمجھانے لگی۔

"جس۔ دن تمہاری شادی ہو گئی' یقین جانو اس کے دوسرے دن میں بھی شادی رچالوں گا' چاہے میری اماں کسی بھی لڑکی کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیں۔ پر جب تک سانس ہے' تب تک آس ہے' تمہاری ہاں کا انتظار کروں گا۔" انس کی گمبیر آواز سچا لہجہ آج بھی ملاحت کے کانوں میں گونجتا تھا۔

"منہ دھو رکھو۔ وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔" وہ شرارت سے بولی' پر اس کی روح تک مسرور ہو گئی تھی۔ انس کی یہی باتیں تو ملاحت کو معتبر کرتی تھیں۔

"اف۔ چلو۔ اب میری باتوں پر سیریس نہ ہو جانا۔ یاد رکھنا شادی تو تمہاری ہوگی' پر میرے ساتھ۔" اس کا استحقاق اور جاں دار لہجہ۔ وہ مسکرا

دی۔ پرانی باتیں یاد کر کے اس کی آنکھ بھر آئی۔ اس نے گلاسز اتار کر گلابی ٹشو سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

کوثر خانم چونکیں۔ آج پرسکون ندی جیسی بی بی سمندر کی موجوں کی طرح بے چین اور بپھری ہوئی لگیں۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" اس نے سر جھٹک کر سوچا اور توجہ گاڑی چلانے پر مرکوز کر دی۔

☼ ☼ ☼

"میرے اللہ۔ یہ بال ہیں کہ جنجال بھلا بتاؤ زنجیر ایسی پھنسی ہے کہ نکل کر نہیں دے رہی۔" آمنہ خالہ نے زچ ہو کر للاں کو پکارا۔ ملائی سر جھکائے جھکائے مسکائی۔ اس کے بال تو پورے خاندان میں مشہور تھے' لمبے' گھنے' کالے' خوب صورت بال' جنہیں وہ ہمیشہ باندھ کر رکھتی کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔

"اے لو۔ بی بی یہ کیا کیا؟ دیکھو تو ذرا کیسی بدشگونی ہو گئی' پہلی دفعہ میں ہی گرہیں پڑ گئیں۔" ملاحت کی ہونے والی ساس نے دل پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی تو اسے گھٹنے دبائی ہوئی جاندنی سے انہیں' مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے فرشی نشست کا انتظام کیا تھا۔ گاؤ تکیوں اور فلور کشن پر میرون رنگ کے کور چڑھا کر ملائی نے ہر کونے پر رکھ دیے تھے' کمرا سج گیا تھا۔

"میری بچی کی خوشیوں کا معاملہ ہے' اے اللہ۔ اپنا کرم فرمانا۔" ارفع بیگم گھبرا کر ان کے پاس پہنچیں اور جلدی جلدی کھینچ کھانچ کر الجھ جانے والی نفیس سی سونے کی چین بالوں سے نکالی' جو آمنہ بوے اپنا بالوں

سے اپنی ہونے والی بہو کو پہنانا چاہ رہی تھیں۔

آمنہ نے اچھے طریقے سے ملاحت کی سلیقہ مندی اور بھولے بھالے مزاج کو جانچا پھر یہ فیصلہ کیا۔ گو کے حسن کے مقابلے میں ملاحت کی رنگت کچھ دبی دبی سی تھی۔ پر انہوں نے اس کی سیرت کو ترجیح دی۔ اپنے منہ بولے دوست کو زبانی طور پر پہلے ہی عندیہ دے دیا تھا۔

آج وہ مٹھائی کے ٹوکرے اور تینوں بیٹیوں کے ساتھ ملاحت کا باقاعدہ رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ ارفع کے پیر تو زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ البتہ عرفان صدیقی اتنی جلد بازی سے پریشان ہو گئے۔

"اتنی جلد بازی مناسب نہیں۔" دبے لفظوں میں ارفع کو سمجھانا چاہا' پر وہ تو سہیلی کو فوراً "ہاں" کا اقرار کر بیٹھیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں بھلا اس سے بہتر رشتہ کیا آتا۔ آمنہ کا گھر بار وہ دیکھ چکی تھیں۔ حسن خوش شکل ہونے کے ساتھ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ سب سے بڑھ کر آسٹریلیا میں اس کی جاب تھی۔ بیوی کو بھی اس کے ساتھ چلے جانا تھا۔ اب مزید کیا چھاننا؟ ارفع کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

"مشف منو" کرتے ان کا گلا بھی خشک نہیں ہو رہا تھا۔ دوست نے ان کا بھرم رکھ لیا ورنہ اس کے بیٹے میں بھلا کوئی کمی تھی۔ گھر سے دم اچھی سے اچھی لڑکی مل جاتی' زندگی میں پہلی بار شریک حیات کو اتنا خوش دیکھ کر عرفان صدیقی نے بھی "مجبوراً" خاموشی اختیار کر لی۔

"ایسا رشتہ تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ دیکھا میری بچی کی قسمت کتنی شان دار نکلی؟" ارفع بیٹی کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

"یہ شب ابھی تک کیوں نہیں آئی اسے تو اپنے میک اپ فیشن سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بہن کی فکر خاک کرے گی۔" انہوں نے دانت کچکچا کر گھڑی دیکھی۔

"تو بھائی صاحب! بس طے ہو گیا اب کی بار جب حسن وطن لوٹے گا تو ہم دونوں کا نکاح کر دیں گے' تاکہ وہ ملاحت کے باہر جانے کا کیس اپلائی کر دے۔ اسی دوران ملاحت کا گریجویشن بھی مکمل ہو جائے گا۔ رخصتی اس کے بعد ہی کریں گے۔" آمنہ نے امیگریشن کے معاملات کو اپنے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"جی ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔" عرفان صدیقی نے مسکرا کر نیم رضامندی دی۔ انہیں یہ سوچ کر تسلی ہوئی' باقی معاملات اس وقت ہی مکمل ہوں گے' جب خیر سے ان کا بیٹا وطن لوٹے گا۔ اس دوران حسن کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

"جی۔ ابھی تو ہم اپنی سونے کی زنجیر پہنا کر بس یہ رشتہ پکا کر رہے ہیں' باقی دھوم دھام بعد میں ہوتی رہے گی۔" آمنہ دل کے ساتھ بولیں۔ ان کی بیٹیاں ایک طرف منہ بنائے بیٹھی ناگواری سے ماں کی جلد بازی کے نظارے دیکھنے میں مصروف تھیں۔

"جی۔ وہ تو ٹھیک ہے' پر ہم نے ابھی حسن میاں کے لیے کچھ خریدا بھی نہیں۔ سب کچھ اتنا اچانک طے پایا۔" عرفان صدیقی کی خوددار طبیعت تھوڑا گھبرائی۔

"ارے بھائی صاحب۔ ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں جو آپ تکلفات میں پڑ رہے ہیں۔ اللہ رکھے تو بہت موقع آئیں گے۔ پر یہ یاد رکھیے گا' ہمیں اپنی بچی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ہماری تو بس ایک ہی شرط ہے۔" انہوں نے ڈرامائی انداز اختیار کیا اور سب لوگوں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے لیا۔ ارفع نے پہلے گھبرا کر سہیلی کو دیکھا' پھر برابر میں بیٹھے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ انہوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بیوی کو تسلی دی۔ ملاحت الگ شرم و حیا بھول کر آمنہ خالہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی بہن بولیے اچھا ہے آج ہی۔ ہر بات صاف ہو جائے۔" عرفان صدیقی نے اطمینان سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ارفع کی جان جیسے حلق میں اٹک گئی

کہ ان کی طرف سے کیا فرمائش آئی ہے؟

"بس ہماری بہو شادی کے بعد سال میں ایک مہینہ ہمارے ساتھ یہاں آکر گزارے۔" آمنہ کی آواز گلوگیر ہوگئی' لہجہ چیخ چیخ کر اپنی تنہائی کی داستان سنانے لگا۔ ملاحت سمیت باقی لوگ ان کی محبت بھری فرمائش پر مسکرا دیے۔ آمنہ کی بڑی بیٹی نرمین کو اپنی ماں کے محبت بھرے سمین زہر سے بھی بدتر لگ رہے تھے۔ اس نے باقی بہنوں کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ اعزاز ان کی ساری حرکات مسکرا' مسکرا کر نوٹ کر رہا تھا۔ اسے بعد میں ہر چیز کا ریکارڈ جو لگانا تھا۔

"اے شازمین بھائی کا وہ کارڈ تو دینا جس میں اس کے آفس کا پتا اور نمبر وغیرہ ہے' بھائی صاحب آپ لڑکی والے ہیں ہم سمجھتے ہیں آپ کی تسلی بھی ضروری ہے۔" انہوں نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجئے۔ مما۔" شازمین نے ماں کو ایک کارڈ پکڑا دیا۔

"یہ کارڈ لے لیں اور جس سے چاہیں حسن کے بارے میں معلومات کروالیں۔ ان شاء اللہ مایوسی نہیں ہوگی۔" انہوں نے شازمین کے ہاتھ سے سفید چکنا چمک دار کارڈ لے کر عزیز احمد کو تھمایا۔ وہ چشمہ لگا کر اسے پڑھنے لگے۔

"ایک منٹ۔ حاضرین۔ بھئی کی ایک ہی بہن ہے۔ اس کے بغیر یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔" شباہت نے اندر داخل ہوتے ہوئے فلمی انداز میں بڑھک ماری۔ دھانی شرٹ پر فیروزی ٹراؤزر اور تین گز کا دو... ہر نگوں کے امتزاج سے رنگا شیفون کا دوپٹا' جدید انداز میں سنورے ہوئے بال۔ وہ جھل مل کرتی کمرے میں کیا داخل ہوئی ایک منٹ کے لیے سکوت سا چھا گیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے آمنہ اور ان کی تینوں بیٹیاں بھی اسی کو دیکھنے لگیں' شباہت کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ چپک سی گئی۔ لمبا قد' گوری رنگت' نشیلی آنکھیں "اس پر بلا کی تیاری" آمنہ کی تینوں چڑھی بیٹیاں بھی مبہوت سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ نرمین نے مسکرا کر شباہت کو خوش آمدید کہا اور ہاتھ بڑھا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ لمحوں میں ملاحت پس منظر میں چلی گئی۔ ابیہہ ہمیشہ کی طرح چھوٹی بیٹی کی پذیرائی پر خوش نہیں ہوئیں۔ ان کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

"واہ آنٹی آپ نے یہ چاند کہاں چھپا رکھا تھا؟" شازمین نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

"اے میرا بچہ۔ چھپایا تھوڑی' اس کے کالج کی چھٹیاں ہوئیں' تو یہ حیدر آباد اپنی پھوپھی کے گھر رہنے چلی گئی۔" ابیہہ نے انگوٹ کا اظہار کرتے ہوئے بچی بات بتائی۔

"حیرت ہے' ویسے آپ کی دونوں بیٹیاں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔" نرمین نے بھی جملہ کسا۔ ملاحت کا سر مزید جھک گیا۔

"بس بیٹے' پانچوں انگلیاں بھی تو الگ الگ ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک ہی ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔" انہوں نے تھوڑا ناگواری کا اظہار کیا تو آمنہ نے بھی بیٹیوں کو آنکھ دکھائی وہ اب شباہت کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ جو ان مکالموں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ویسے تو بہن کے مقابلے میں ہمیشہ سے تعریف اس کا ہی مقدر بنی' پر جب اسے ماں سے بہن کا رشتہ اتنے کھاتے پیتے گھرانے میں طے ہونے کا پتا چلا اور اس نے حسن کی تصویر دیکھی تو جانے کیوں خوشی کی جگہ بے چینیوں نے اس کے دل پر ڈیرہ جمالیا۔ گھر میں آنے والی ہر چیز پر قبضہ جمانے والی شب کو بالکل امید نہ تھی کہ اس کی قسمت کا ستارہ چھلانگ مار کر اتنا اوپر چلا جائے گا۔

"چلو نا منہ میٹھا کرنا شروع ہو رہا ہے۔ کچھ تصاویر کھنچوا لیتے ہیں۔" انہوں نے آمنہ کی توجہ دوبارہ ملاحت کی طرف کروائی تو وہ بھی چونک کر شباہت کے سحر سے باہر نکل آئیں اور مسکرا کر اس طرف بڑھیں۔ یہ آمنہ کی ہی خواہش تھی کہ ملاحت کی ایک' دو تصویریں بنالی جائیں' تاکہ حسن کو میل کی جاسکیں۔ البتہ ان کی بیٹیوں نے ملاحت کو لفٹ نہ کروائی' شب بھی بہن کو

فراموش کیے۔ حسن کی بہنوں سے خوش اخلاقی برت رہی تھی۔ ارفع نے چھوٹی بیٹی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے بھی کیے۔ پر وہ نرمین سے باتوں میں لگی رہی۔ شب کے اندر خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پہلے ماں کے منع کرنے کے باوجود۔ اپنی پوزیشن لاست سے تیار ہونے چل دی' اب بھی سنی ان سنی کیے بیٹھی تھی۔ نرمین اور شازمین نے ملاحت کے معاملے میں جتنی سرد مہری دکھائی' اتنی ہی گرمجوشی سے انہوں نے شباہت کو لفٹ کروائی۔ عازمین البتہ ماں کے ساتھ ہونے والی بھابھی کی ڈیٹیل کیمرے سے فوٹو اتارنے میں مصروف ہو گئی اسے۔ بھولی بھالی سی پرکشش سی ملائی بہت پسند آئی تھی۔

"شب بیٹا ذرا کچن میں کھانے کا انتظام تو دیکھنا۔" ارفع سے بیٹی کے ڈھنگ زیادہ دیر برداشت نہ ہوئے تو دانت کچکچا کر بیٹی کو پکارا۔ اعزاز کو بھی شباہت کے اسٹائل ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے۔ مہمانوں کے لحاظ میں چپ تھے ورنہ گہرا ایلی ہیٹ کا سیدھا ان لین بنتا ہوتا۔ باپ کے بگڑے تیور دیکھ کر شب منہ بناتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ عرفان صدیقی پہلے ہی عشاء کی نماز پڑھنے مسجد جا چکے تھے۔ ارفع کی ذرا سی مشکل سے زنجیر کی گرہ تو کھل گئی تھی پر کمرے کا ماحول شب کی آمد سے جس طرح بدلا۔ یہ بات ان کے لیے پریشان کن تھی۔ ایسا لگا جیسے کہ زنجیر کی گانٹھ تو کھل گئی پر ان لوگوں کے دلوں میں ایک نئی گرہ لگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو ہماری ممانی بہت ہی سیدھی ہیں۔ بچپن کی سہیلی کو دیکھا اور پھسل گئیں' دیکھے بھالے بغیر اور پہلی ملاقات میں رشتہ دے بیٹھیں۔" نرمین گاڑی میں بیٹھتے ہی شروع ہو گئی' جب سے اس کی شادی ہوئی' خود کو بہت معتبر سمجھ کر' ہر معاملے میں وہ ٹوک دلائے دینا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو بجیا۔ ارفع آنٹی کو دیکھ لو۔ کتنی چالاک ہیں۔ کالی والی اٹھا کر ہمارے متھے مار دی اور وہ جو سفید ریشم جیسی ہے۔ اس کو چھپائے رکھا' حالانکہ ہمارے اسمارٹ سے بھائی کا صحیح جوڑ تو چھوٹی والی سے بنتا ہے۔" شازمین نے بہن کا ساتھ دیتے ہوئے گل پھندے لگائے۔

"نہیں۔ بیٹا! ارفع ایسی نہیں۔ اس نے تو کئی بار ہمارے سامنے چھوٹی بیٹی شباہت کا تذکرہ کیا تھا' یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اپنی پھپھو کے یہاں رہنے گئی ہوئی ہے۔ مگر ہم نے اس کے بارے میں زیادہ کریدا نہیں' ویسے بھی۔ جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس کیا گننا۔ ہمیں ملائی کی عادت اطوار بھائے تو اسی کے لیے بات کرلی۔ ویسے بھی بچی کی شکل و صورت کی اتنی بری نہیں' تم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا کتنی پرکشش ہے۔"

آمنہ نے بھرپور طریقے سے سہیلی اور ہونے والی بہو کا دفاع کیا۔

"واہ۔ واہ کوئی اور خیال ہو نہ ہو ان لوگوں کی حس مزاح بڑی شاندار ہے۔ جسے ملائی کہنا چاہیے' اسے شب کہتے ہیں' جو رات سی ہے' اسے ملائی پکارا جاتا ہے بھائی کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" نرمین نے مذاق اڑایا تو آمنہ کو بہت برا لگا۔

"بری بات ہے بیٹا۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں میں نقص نکالنا اچھے نہیں کرتے۔" آمنہ نے بیٹیوں کو سمجھانے کی لاحاصل کوشش کی۔

"مما آپ جو بھی کہیں مجھے اپنے ہینڈسم بھائی کے لیے ملاحت کہیں سے بھی مناسب نہیں لگی' پھر ان کا گھرانہ دیکھا' کتنا دقیانوسی' میرے سسرال والوں کا پتا ہے نا آپ کو۔ کتنے مین میخی ہیں۔ سوال کر کر کے میرا جینا محال کر دیں گے۔ چلو شباہت ہوتی تو اور بات ہوتی۔ اس کا حسن ہر سوال کا جواب بن جاتا۔" نرمین کا وہی متکبرانہ انداز' عازمین چپ تھی

آمنہ سر جھکائے بیٹیوں کے تبصرے سن کر افسردہ سی ہو گئیں' جمال صاحب کو اپنی تینوں بیٹیوں سے جنونی محبت تھی۔ کیوں کہ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔

آمنہ کو اجازت نہ تھی کہ وہ بیٹیوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کر سکیں۔ حسن اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے بیٹیوں پر ترجیح نہ دیتے تھے اسی لیے وہ شوہر کے بے حد قریب رہا۔ بیٹیوں کو پر اعتماد بنانے کے چکر میں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ آمنہ خاموشی سے پورے راستے منہ جیسے باہر کے نظاروں میں گم رہیں۔

"یہ ساری باتیں حسن کے کانوں تک دبی دبی ہو کر پہنچیں گی۔" انہیں ایک دم سے فکر ہوئی۔ ماں تھیں، نرمین اور شانزمین کی عادتوں کو اچھے طریقے سے پہچانتی تھیں۔ باپ کے گزر جانے کے بعد دونوں بڑی بیٹیوں نے جیسے ایکا کرلیا تھا۔ اپنی مرضی چلاتیں، اکثر بھائی کو بھی مس گائیڈ کرتیں۔ حسن الجھ جاتا تو پریشان ہو کر ماں کو فون گھماتا۔ آمنہ بیٹے سے بھی دل کا درد چھپا جاتیں۔

"اگر حسن نے بھی بہنوں کے دباؤ میں آکر ہمارے فیصلے پر اعتراض کیا تو ہم ارفع کو کیا منہ دکھائیں گے؟" وہ ایک دم گھبرا گئیں۔

"امی آپ پریشان نہ ہوں اس سے پہلے کہ آپی اور بجیا بھائی سے بات کریں، آپ خود بھائی کو سب بتا دیجیے، اگر ان میں ذرا بھی عقل ہوگی تو سیرت پر صورت کو کبھی ترجیح نہیں دیں گے۔" عانزمین ماں کی اتری صورت دیکھ کر دھیمے سے سمجھانے لگی۔

"ہوں۔ کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔ وہاں تو صبح ہو چکی ہوگی، ہمارے کمرے میں چلو اور ذرا حسن کا نمبر تو ملا کر بات کراؤ۔" چھوٹی بیٹی کی بات نے ان کے اندر توانائی سی بھر دی۔ وہ جلدی سے کمرے کی طرف چل دیں۔

☼ ☼ ☼

آمنہ اور ارفع کا تعلق ایک ہی گلی سے تھا۔ وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ بیاہ کر ایک ہی شہر میں آئیں، شروع شروع میں تو خوب آنا جانا ہوا، پھر دونوں بڑے سسرال اور بڑھتے ہوئے خاندان کے جھمیلوں میں الجھ گئیں، ملنا ملانا کم ہو گیا مگر محبتیں کم نہ ہوئیں، ارفع اپنے گھر میں منو کا اتنا ذکر کرتیں کہ ان کے بچوں کو آمنہ خالہ کی ہربات ازبر ہو گئی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ارفع کو زندگی میں تھوڑی فراغت محسوس ہوئی تو آمنہ کی یاد بڑھ کر دوبارہ جاگ اٹھی۔

ایک دن چھوٹے بیٹے کو ساتھ لیا اور پتا ڈھونڈتی ہوئی پرانی سہیلی کے یہاں جا پہنچیں، پتا وہی تھا مگر پرانے انداز میں بنا ہوا گھر چمکتے دمکتے جدید انداز کے بنگلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

آمنہ بہت محبت سے ملیں۔ ارفع جو ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھیں، پرانی یادوں میں ایسے گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ اعزاز منہ بناتا رہ گیا۔

اب ارفع گھر جانے کو بے چین ہوئیں تو آمنہ نے اصرار سے کہہ کر کھانا لگوا لیا۔ بیٹیوں کو بھی کھانے کے لیے بلایا گیا۔ ان کی دونوں بیٹیاں شانزمین اور عانزمین آئیں، رسمی طور پر سلام دعا کرکے جلدی سے ہاٹ پاٹوں میں کھانا نکالا اور یہ جا وہ جا ۔۔۔۔ ارفع کو بہت برا لگا۔ پر بولیں کچھ نہیں۔

"ارے وہ پڑھ رہی ہیں، ورنہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتیں امتحان قریب ہے نا۔" آمنہ نے لڑکھڑاتی زبان سے صفائی دینا چاہی۔

"کوئی بات نہیں۔ خیر ہے۔" ارفع نے سنبھالا دیا۔ ہر گھر کا الگ الگ ماحول ہوتا ہے۔ وہ شیریں صلح جو۔ کھانے کے بعد بصد اصرار آمنہ نے انہیں اپنے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیجا تاکہ وہ گھر بھی دیکھ لے۔ برسوں بعد ہمجولی سے ملنا بہت اچھا لگا، سوچا اس کے یہاں جاتے آتے رہنے سے دل بہلا رہے گا ورنہ بچوں کی تو اپنی دنیا تھی۔

☼ ☼ ☼

"آمنہ خالہ۔ امی کی دوست نہیں۔ چھوٹی بہن لگ رہی تھیں۔" اعزاز نے اگلے دن گھر والوں کے درمیان بیٹھ کر اچانک شوشا چھوڑا۔

"واقعی۔ ایسی ہیں منو خالہ؟" ملاحت نے چائے کی ٹرے بیچ میں دھری ٹیبل پر رکھتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا۔ اس گھر کا معمول تھا کہ سب شام کی چائے صحن میں بیٹھ کر ایک ساتھ پیتے تھے۔

"تو اور کیا۔ بھلا۔ میں کیا جھوٹ بولوں گا؟۔ امی سچ بتائیں نا۔ وہ آپ سے کتنی چھوٹی ہیں' کیسے کالے بال تھے' بلکے آسمانی جوڑے میں خوب تیار بیٹھی تھیں۔" اعزاز نے ماں کو چھیڑا۔ اس کا ماں سے اس طرح سوال کرنا ملائی کو اچھا نہیں لگا' اسے تو اپنی امی ابو سے زیادہ دنیا میں کوئی حسین ہی نہیں لگتا تھا۔

"ہونہہ۔ رہنے دو۔ امی سے زیادہ دنیا میں کوئی اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔" ملاحت نے ماں کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھا تو چائے چھوڑ کر ان کے پاس آگئی۔ کام کی زیادتی سے کھردرے ہو جانے والے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگالیا۔ ارفع بیٹی کی محبت پر کھل اٹھیں۔ اعزاز نے شرارت سے ان دونوں کی محبت کا سین دیکھا۔

"بیٹا جی یہ پیسہ بھی نا۔ بڑی عجیب چیز ہے صرف بینک میں رکھا ہو تب بھی انسان کو اتنا پر اعتماد بنا دیتا ہے کہ اس کے چہرے پر الگ ہی چمک پھوٹ رہی ہوتی ہے۔" عرفان صدیقی نے اخبار سائیڈ میں رکھ دیا اور چشمہ اتار کر بیٹے کو دیتے ہوئے فلسفہ جھاڑا۔ شریک حیات کو آزردگی سے دیکھا جو ان کی کم آمدنی میں ساری عمر جوڑ توڑ کرنے میں لگی رہیں۔

"آپ کی محبت ہی میری زندگی کا سرمایہ ہے' مجھے پیسے کا کیا غم۔" ارفع نے سر اٹھا کر شریک حیات کو دیکھا' ان کی اداسی بھری کیفیت صرف' وہی محسوس کر سکتی تھیں' اسی لیے بند ہونٹوں سے اپنا پیغام ان تک پہنچایا۔ اتنے سالوں کے ساتھ نے دونوں کو یہ

توانائی بخشی تھی کہ بعض اوقات زبان سے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ بہت سی باتیں بن کہے ہی سمجھی جاتیں۔ محسوس کرلی جاتیں۔

"ابو جی کہتے تو آپ ٹھیک ہیں' آمنہ خالہ واقعی چمک رہی تھیں۔" اعزاز نے باپ کا چشمہ اپنے کرتے کے دامن سے صاف کر کے اس کے کور میں رکھتے ہوئے تائید کی۔ ارفع نے ہمیشہ سے بچوں کو باپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کی عادت ڈالی تھی تاکہ باپ سے ان کی قربت میں کمی نہ ہونے پائے۔

"بات یہ ہے میرے بچے کہ آمنہ بہن کا تعلق امیر گھرانے سے ہے۔ بیٹے کا باہر جانا سونے پہ سہاگا ہوگیا' ان کی زندگی آسودگی میں گزری۔ جبکہ ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ تم اس گھر کے اکلوتے سپوت ہو' ابھی تعلیمی مراحل سے گزر رہے ہو' یہ تو تمہاری امی کا ہی کمال ہے کہ گھر کا نظام خوش اسلوبی سے چلا رہی ہیں۔ ورنہ گھر کے سو خرچے اور میری ایک سوکھی تنخواہ اور چند ٹیوشن۔ مہنگائی میں اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ انہوں نے ہمیشہ کم وسائل میں کتر بیونت کرتے ہوئے گھر کے بجٹ میں توازن رکھا' اسی لیے تو ہم ان کے مداح ہیں۔" عرفان صدیقی نے پیار سے ارفع کو دیکھا اور لفظوں سے خراج تحسین پیش کیا۔ ملاحت اور اعزاز کھلکھلا کر ہنس پڑے' شباہت تو حیدر آباد اپنی چھوٹی پھوپھو کے یہاں چھٹیاں گزارنے گئی ہوئی تھی' ورنہ وہ بھی اس وقت ان کے ساتھ بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی۔

"کاش میں کچھ کر سکوں۔ جلدی سے گریجویشن مکمل ہو جائے تو کوئی نوکری ہی ڈھونڈ لوں۔ آمنہ خالہ کے بیٹے کی طرح اپنے ابو کا سہارا بن جاؤں تاکہ میری امی بھی فکروں سے آزاد ہو جائیں۔" ملائی نے معصوم سے دل کی خواہش اعزاز سے شیئر کی تو وہ پیٹ پکڑ کر دیر تک ہنستا رہا۔

"پیا۔ اکیلے باہر نکلتے تو تمہاری جان جاتی ہے اتنی ڈرپوک ہو کہ کالج تک تو مجھے ساتھ چھوڑنے جانا پڑتا ہے۔ باہر نکل کر نوکری کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔" اعزاز کے انداز پر اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ بہت ہی حساس تھی' باپ کو اتنی محنت کرتا دیکھتی تو اس کے

دل پر گھونسا پڑتا' باپ کے کمزور سے چہرے پر نگاہیں جیسے جم ہی گئیں۔ وہ لب اعزاز سے مسکراتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے' عرفان احمد ایک کالج میں انگلش پڑھاتے تھے مگر مہنگائی کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے شام کو بچوں کو گھر پر ٹیوشن بھی دیتے تھے۔

"کل سے ابو کو روزانہ رات میں دودھ کا گلاس میں دوں گی۔" اسے ابو کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت پر تشویش ہوئی' خاص طور پر جب سے عرفان احمد کو دل کا مرض ہوا تو وہ ان کا بہت زیادہ خیال کرنے لگی۔ باپ پہ زور دے کر کچھ ٹیوشن کم کروائیں۔ محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خود پڑھا کر اپنی کالج کی فیس نکالنے لگی۔

شباہت اسی گھرانے کی فرد ہونے کے باوجود سب سے مختلف تھی۔ اس کو اگر فکر تھی تو بس اپنی ذات کی۔ اس میں اور ملاحت میں سال بھر کا فرق ہوگا۔ وہ ہر وقت بجھی بجھی رہتی۔ اعزاز جو سب سے چھوٹا تھا اکثر شب کی ناانصافیاں دیکھ کر اس سے لڑنے بیٹھ جاتا' کیونکہ شب بند کیے بس اس بات پر ہی عمل کیے جاتی کہ "اپنا من چنگا' کٹوتی میں گنگا۔"

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔ ارفع۔ ہم آمنہ بول رہے ہیں۔" ملاحت نے اس کو اپنا موبائل لا کر تھمایا جس پر آمنہ کا فون آیا تھا۔

"اپیا۔ پلیز۔ میں آپ کی سونے کی یہ چین کل کالج پہن کر چلی جاؤں؟ اف کتنی خوبصورت اور نفیس ہے۔" شب نے بڑے پیار سے ملاحت کے گلے میں پڑی زنجیر پر ہاتھ پھیرا اور حسرت سے بولی۔ اس کے چہرے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔

"ہاں۔ پہن لو۔ مگر احتیاط سے رکھنا" ملاحت نے نہ چاہتے ہوئے بھی بہن کی خوشی کے لیے سسرال سے آئی ہوئی زنجیر اتار کر اسے تھمادی۔ اسے انکار کرنا مشکل لگا۔

"اوہ۔ یہ تو مجھ پر ہی سجے گی۔" شب خوشی خوشی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ زنجیر کو گلے لگا کر دیکھتے ہوئے تفاخر سے سوچا۔ ابھی اس نے پہننے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ کمرے میں داخل ہوتی ارفع نے اسے گھورا اور دو ڈگ بھر کر ہاتھوں سے جھپٹ لی۔ انہیں ہمیشہ سے چھوٹی کی یہ عادت بہت ناگوار گزرتی تھی کہ وہ گھر میں آنے والی ہر اچھی چیز پر قبضہ جماتی' چیزوں کی تو خیر تھی مگر یہاں بات ملاحت کے سسرال سے آئے ہوئے زیور کی تھی' اس بار وہ اس کا بچپنا نظر انداز نہ کرسکیں۔

"شکر ہے میرے اللہ۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گئی' ورنہ اس لڑکی نے تو ستیاناس کردیا تھا' کچھ عقل و قل ہے کہ نہیں۔ بہن کے سسرال سے آئی ہوئی چیز ہے۔ اگر چھو' ادھر ادھر ہو جاتے تو۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی؟" وہ بیٹیوں کو سونے کی تاکید کرتے ان کے کمرے میں



آئیں تو نیا تماشا دیکھ کر دونوں پر برس پڑیں۔

"تم ملائی تمہیں کچھ سمجھ بھی ہے کہ نہیں۔ خیر سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ کل کو سسرال چلی جاؤ گی۔ ایسی لاپروائی دکھائی۔ تو ماں کا نام روشن ہو گا خوب۔"

ہمیشہ کی طرح توپوں کا رخ بیٹی کی طرف موڑا۔ وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"امی کیا ہے؟ میں نے ایسا سے پوچھ کر لی ہے نا۔ ویسے بھی ذرا سا پہننے سے قمیص تھوڑی جائے گی' سونے کی بنی ہوئی ہے۔ سونے کی۔" ماں کے غصے سے شب کے دل پر چوٹ لگی' ویسے بھی وہ بچپن سے گھر بھر کی لاڈلی تھی' اب ملاحت کی اتنی اہمیت۔ وہ چڑ گئی اس پر اتنے لوگے خاندان میں رشتہ طے پانا اسے لگا جیسے اس کی حق تلفی کی گئی ہو۔ نگاہیں جیسے زنجیر پر جم گئیں۔ رشک و حسد کی تپش ارفع تک بھی جا پہنچی۔ انہوں نے چونک کر چھوٹی کو دیکھا' رسم کے بعد سے شب کے بدلے بدلے تیور انہیں سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس نے بہنوں والے کوئی ارمان دکھائے نہ ہی بہن کے برابر میں بیٹھ کر فوٹو کھنچوائی۔ ان لوگوں کے جاتے ہی وہ سارے کام کاج چھوڑ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ انہوں نے مصروفیت میں ان باتوں کو اہمیت نہ دی۔ پر ابھی ابھی جو لہو ان پر ہوا' وہ بیگانہ تھیں۔

"تیرا دماغ تو ٹھیک ہے' جب دیکھو کوئی نہ کوئی شوشہ ہی اٹھا کر دے رہتا ہے' حالات پہلے ہی خراب ہیں' کسی نے چھین چھان لی تو مصیبت ہو جائے گی۔" ارفع بظاہر ملائی کو جھاڑ پلاتے ہوئے شباہت کو سمجھانے لگیں۔ ان کا یوں ٹوکنا اس کے دل میں آگ لگا گیا۔ ارفع نے مڑ کر زنجیر ایک کیس میں رکھ کر الماری میں ملاحت کے خانے میں اندر کی طرف چھپانا چاہی تو شباہت تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

"پلیز۔ امی۔ ایک دن پہننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں چھینتا" شباہت نے قریب پہنچ کر التجا کی۔ وہ بھی جیسے اڑ گئیں۔

"ایک دفعہ منع کر دیا۔ بس اب کوئی اور بات نہیں ہو گی۔ ویسے بھی اس کے سسرال سے آئی ہے۔"

انہوں نے چھوٹی کو جتلایا۔ وہ بری طریقے سے جل گئی۔

"آپ تو بس ایسا کا ہی سوچتی ہیں۔ میری خوشیوں کی ذرا بھی پروا نہیں۔" شب نے آگے بڑھ کر ماں کے ہاتھ سے وہ کیس چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے عمل سے زیادہ لہجے اور لفظوں نے ملاحت کو دکھوں کے سمندر میں دھکیلا' ارفع کی ہستی بھی بیٹی کی بات پر اندر تک ہل کر رہ گئی۔

"شب تو کیا کہہ رہی ہے بیٹا؟" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا' اس نے بے رخی سے ہاتھ چھڑوایا۔ ملائی نے ماں بہن کی بات کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کی' ورنہ شب کے انداز اسے غصہ دلا رہے تھے۔ جو ایک چھوٹی سی بات کو ربڑ کی طرح کھینچتی جا رہی تھی۔

"یا اللہ۔ میں نے تو کبھی اپنے بچوں میں فرق نہیں کیا؟ امیری قربانیوں کا مجھے یہی صلہ ملنا تھا؟ ارے میں پوچھتی ہوں یہ خناس تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟" ارفع نے بیٹی کو جھنجوڑ ڈالا۔

"امی بس۔ رہنے دیں' یہ فرق نہیں تو کیا ہے؟ سب پتا ہے' آپ لوگوں نے اسی لیے چھٹیوں کا بہانہ بنا کر مجھے حیدر آباد بھجوایا۔ تاکہ اپنی امیر دوست کے بیٹے سے ایسا کا رشتہ طے کر سکیں۔" اس کے اندر پلنے والی بدگمانیاں لاوے کی شکل میں زبان سے نکلنے لگی۔ یہ جانے بغیر کے تباہی دور دور تک پھیلے گی۔ ملاحت جھلنے لگی' اس کی محبتوں کے صلے میں چھوٹی اور عزیز بہن کا یہ رویہ ناقابل برداشت تھا۔ آنسو قطار در قطار بہتے چلے گئے۔

"اگر خیر ہوتی کہ یہ رشتہ ہمارے گھر میں ایسی دراڑیں ڈال دے گا۔ تو میں خود سے انکار کر دیتی۔" ملاحت نے روتے ہوئے بہن کو صفائی دی' جس کے تنے ہوئے اجنبی نقوش نے اسے بہت اذیت پہنچائی۔

"بس۔ بس۔ ایسا۔ پلیز میں نے آپ کی محبت بھری باتیں سن لیں' ویسے دل میں تو لڈو ہی پھوٹ رہے ہوں گے نا' شہزادہ گلفام جو مل رہا ہے۔" اس نے بہن کا بڑھا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ بہن جسے ملائی

نے ہمیشہ اپنی ساری پسندیدہ چیزیں بھی چنتے چنتے پیش کیں' زندگی کے اس اہم معاملے میں بھی ایسی ہی خواہش کر بیٹھی مگر یہاں اسے مات ہو گئی۔ یہ بے جان چیزوں اور کپڑوں کا معاملہ نہ تھا۔ یہ زندگی کی حقیقتیں تھیں۔ ملاحت اور ارفع کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مسئلے پر شباہت کے دل میں پیدا شدہ بدگمانیوں کو کیسے جھٹلائیں۔

"پلیز۔ شب ایسے نہ کہو۔ میری بات تو سنو" وہ بہن کو منانے لگی۔ ماں کے آنسوؤں نے بڑی تکلیف پہنچائی۔ ایک نیا رشتہ جڑنے سے' پرانے رشتے مشکوک ٹھہرے۔ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا سر جھک گیا۔ سخت اور ضدی لہجہ۔ چہرے پر پھیلی اجنبیت۔ ارفع چھوٹی کو قابو ہی نہیں کر پا رہی تھیں۔

"اگر آنٹی نے تمہیں سوئی کی طرح چھپا کر نہیں رکھا ہوتا تو اس وقت تم اپنی بہن کی جگہ بیٹھی ہوتیں کیوں آپی؟" ثمانہ بن نے تو مذاق ہی مذاق میں سرگوشی کی اور بڑی بہن کو پکارا۔ شباہت کے کانوں میں تو حسن کی بہنوں کی تعریفوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

"ہونہہ۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے بھی یہ اسے پہنانا۔ ملاحت ہے تو تمہاری سگی بہن! میں صاف کہتی ہوں۔ اسی لیے کسی رہتی ہوں' حسن کے ساتھ تمہارا جوڑ بنتا ہے۔" ناپختہ ذہن پر تعریفوں کا نشہ ایسا چھایا کہ اسے کچھ اور یاد ہی نہ رہا سوائے ان لوگوں کی مصنوعی باتوں کے۔

ماں کے بلبلانے پر سوچوں کی مالا بکھر گئی۔

"ہائے ہائے۔ چھوٹی کیا ہو گیا ہے؟ کچھ تو شرم کرو۔ کیوں بے بات کی بات بنا رہی ہو' ایسی کوئی بات نہیں آمنہ نے کچھ دن پہلے ہی تو ملائی کو پسند کیا' پھر اتنی جلدی مچائی' تب ہی تمہیں فوراً" بلوا بھیجا۔ اب تم اپنی ماں پر ایسے بیہودہ الزام لگا رہی ہو' میرے مولا۔ میں کیا کروں' تو ہی اس لڑکی کو عقل دے۔" ارفع کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس کا دل کیسے صاف کریں؟

"رہنے دیں امی آپ کو بس ان کا ہی خیال تھا۔ جانتی تھیں نہ ملائی نام رکھنے سے یہ گوری نہیں

ہو جائیں۔ ان کی سانولی رنگت کی وجہ سے اچھے رشتے آنا مشکل ہیں۔ جب ہی تو اتنے بڑے گھر کا رشتہ آتے ہی ہاں کرنے میں دیر نہ لگائی۔ مجھے بتانے کی زحمت بھی نہ کی۔ میرے پیچھے ہی سب طے پا گیا۔ ڈر گئی ہوں گی نا کہ مجھے دیکھ کر کہیں وہ لوگ آپی کے لیے انکار نہ کر دیں۔" اس کا لہجہ خود غرضی کے عجیب رنگوں سے لپٹا ہوا تھا۔ ملاحت نے ماں کی حالت پر بہن کو نادیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم کیا اس گھر کی سب سے بڑی ہو جو تمہارا انتظار کیا جاتا۔ ہم والدین ہیں۔ ہم نے جو بہتر سمجھا فیصلہ کر دیا۔" ارفع نے دانت کچکچا کر کہا۔ ان کا ضبط جواب دے رہا تھا۔

"آپ کو پتا بھی ہے ایسے رشتے بار بار نہیں آتے پھر میرے لیے کیوں نہیں سوچا؟ دونوں بیٹیوں کو دکھاتیں' پھر ہماری قسمت۔ جو فیصلہ ہوتا میں اسے مان لیتی" اس نے سارے لحاظ ایک طرف رکھ دیے' زبان کے گھاؤ تلوار سے بھی تیز ہوتے ہیں' ملاحت نے دل پر ہاتھ رکھا۔ ارفع کا بس چلتا تو چپل اٹھا کر بیٹی کو مارنا شروع کر دیتیں' مگر رات کے اس پہر شور شرابا ہوتا تو پاس پڑوس میں آوازیں جاتیں۔ عرفان صدیقی کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ اس وجہ سے بھی وہ معاملہ دبا دینے کی خواہش مند تھیں۔

"شباہت۔ بس چپ ہو جاؤ" ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو ہاتھ لگاؤں گی۔ ماں بہن پر ایسے بے بنیاد الزام لگاتے تمہیں شرم نہیں آئی' ٹھہر جاؤ تمہارے ابو کو جگاتی ہوں وہ ہی تمہارا دماغ درست کریں گے۔" وہ چھوٹی کی باتوں سے ڈھے گئیں۔ پیروں نے مزید جسم ناتواں کا بوجھ نہیں سہارا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ ان کے سر میں شدید دھمک ہونے لگی تھی' ملاحت نے ماں کی طبیعت خراب دیکھی تو دوڑ کر انہیں اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

ماں طبیعت اس سے بڑھ کر باپ کی دھمکی کام آئی شب بھی گھبرا گئی جا کر ان سے لپٹ گئی' ملاحت جو ماں کو چپ کروا رہی تھی' چھوٹی بہن کو بھی گلے لگانے

کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے بے اعتنائی دکھائی۔

"یہ کیا ہوا؟" تھوڑی دیر قبل دل میں جو خوشیوں بھری گدگدی ہوئی تھی شباہت کی بدگمانی کے دھوئیں میں سب کافور ہوگئی۔ ملاحت کا دل دکھوں سے لبریز ہوا تو دکھ آنکھوں سے بہہ نکلے۔

عرفان صدیقی چائے کی شدید طلب پر بیوی کو ڈھونڈتے ہوئے اس طرف نکل آئے تو چھوٹی بیٹی کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ دل چھلنی ہوگیا۔ دنیا کے بچوں کو اخلاقیات کا درس دینے والے کی اپنی اولاد ایسی سطحی سوچ رکھ سکتی ہے۔ انہوں نے ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ دل جو پہلے ہی کمزور ہوچکا تھا۔ اس میں درد کی لہر جاگی۔ دیوار کا سہارا لینا چاہا۔ پر تیورا کر گر پڑے۔ وہیں ڈھیر ہوگئے۔

"دھڑام" گرنے کی آواز پر تینوں باہر دوڑیں۔ دروازے کے باہر عرفان صدیقی آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔

"یا اللہ۔ انہیں۔ کیا ہوگیا؟ ایزی۔ ایزی۔ بھائی تم آؤ۔ ارے باپ کو اٹھاؤ۔" ان سب کی آوازیں سن کر اعزاز کے ساتھ ساتھ پاس پڑوس والے بھی بھاگ اٹھے۔ پڑوسی کی گاڑی میں ڈال کر عرفان صدیقی کو قریبی اسپتال پہنچایا گیا۔

"سوری۔ انہیں ختم ہوئے۔ موت ہوچکی ہے۔" ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں ہمدردی دکھاتے ہوئے اعزاز کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ بری خبر سنائی۔

"ابو جی۔ آپ ہمیں ایسے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔" نوعمر اعزاز پر غموں کا اتنا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ اسپتال کے فرش پر بیٹھ کر رونے لگا۔

عرفان صدیقی کے بیمار دل نے اب اور بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا۔ مزید چلنے سے انکار کردیا۔ بند ہوگیا۔ اپنے پیاروں کو روتا دھوتا چھوڑ کر وہ پرسکون نیند سوگئے۔

✡ ✡ ✡

"ملائی۔ چندا۔ شادی کی تقریب میں پہننے کے لیے کوئی بھاری جوڑا خرید لیتی نا۔ یہ کیا اتنا سادہ سا سوٹ نکالا ہے۔" ارفع نے ملاحت کو سادہ شیفون کا سرمئی جوڑا استری کرتے دیکھا تو دکھ سے بولیں۔

"بس۔ امی اپنی شاپنگ کا وقت ہی نہیں ملا۔ ایک طرف شادی کی تیاریاں۔ پھر امتحانات کے نزدیک ہونے کی وجہ سے شدید مصروفیت۔ جلدی میں یہ ہی ملا۔" اس نے دل کا درد چھپا کر بہانہ بنایا۔ ارفع بیٹی کا دکھ سمجھتی تھیں۔ عرفان صاحب کے گزر جانے کے بعد اس نے جیسے گھر کو سنبھالا وہ قابل تحسین تھا۔ گھر سے ایک قدم بھی باہر نہ نکالنے والی ملائی مس ملاحت بن گئی۔ صبح کوچنگ سینٹر میں جا کر کلاسز لیتی اور رات کو دیر تک بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی۔ اعزاز اپنے چھچھلے پن سے پیچھا چھڑا کر بہن کے شانہ بشانہ مشقت کرنے لگا تھا۔

شوہر کی رفاقت کا یوں پل میں ختم ہوجانا۔ ارفع تو اس غم سے کرچی کرچی ہو کے بکھر گئیں۔ شباہت کی تو شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ پر ملاحت کا ہی دم تھا۔ جو اس نے پورے گھر کو جوڑے رکھا۔ باپ کی موت کے بعد بہن کو بڑھ کر خود گلے لگایا۔ شباہت نے بھی ماں بہن سے رو رو کر معافیاں مانگیں۔ پر ارفع اس کے معاملے میں پتھر ہوگئیں۔ اس سرد جنگ کا خاتمہ بھی آخر ملائی کی سرتوڑ کوششوں سے انجام پایا۔

"امی کچھ کہنا تھا؟" استری کرکے وہ مڑی تو ماں کو سوچ میں گم پایا۔ کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پوچھا۔ ارفع ماضی کے دو برسوں کا سفر لمحوں میں کرکے واپس حال میں لوٹیں۔

"ہاں۔ آ۔ نہیں۔ کچھ بھی۔ نہیں۔" ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ بچا ہی کہاں تھا۔ یہاں تو سگی بیٹی سے نظریں ملانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ زندگی میں ایک اور جانگسل لمحہ سامنے آگیا۔ مگر بہ حالت مجبوری انہیں اپنا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ ارفع کے گلے میں جھولتی سونے کی زنجیر پر ان کی نگاہیں جم سی گئیں۔ واحد بچی تھی۔

"کیا بات ہے امی! آپ کہیں پھر شب سے کسی بات پر

تکرار تو نہیں ہو گئی۔" اس نے ماں کو گومگو میں دیکھا تو پریشانی سے پوچھا۔ زندگی میں جو کچھ سہا۔ دل توڑنے والا ہی تھا۔ اب اس میں کچھ نیا سہنے کی سکت نہ تھی۔ اسی لیے گھبرا اٹھی۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یہ ہی کہنے آئی ہوں کہ ہم لڑکی والے ہیں۔ بارات آنے سے قبل تیار ہو جائیں تو اچھا ہے۔ تم بھی جلدی سے کپڑے بدل لو۔" رافع نے سر جھٹکا۔ جو سوچا۔ وہ کہنے کا ارادہ ملتوی کرکے بات مناتی ہوئی وہاں سے چل دیں۔

ملاحت سے سونے کی چین کی واپسی کا تقاضا کوئی ضروری تو نہیں۔ میری بچی کا دل پہلے ہی اتنا دکھا ہوا ہے۔ اب اس وقت دنیا داری نبھانے کے لیے کیا جانے والا یہ عمل "مرے پر سو درے ہوں گے" جب آمنہ ہی کو کوئی فکر نہیں تو میں کیوں ہلکان ہو رہی ہوں' ویسے بھی شباہت اتنی ضدی ہے کہ تن پر مٹی کے زیور سجا لے گی پر اب اس زنجیر کو نہیں پہنے گی۔ رافع نے بے تکے خیالات سے پیچھا چھڑاتے ہوئے خود کو بھی جھاڑا۔ اصلی قیمتی ساڑھی میں وہ بہت باوقار لگ رہی تھیں' جو ملاحت کل ہی خرید کر لائی تھی اور بصد اصرار انہیں پہننے پر مجبور کیا۔ انہوں نے بیٹی کو گردن موڑ کر دیکھا۔ ملاحت باتھ روم سے سر نکالے سوچوں میں گم بہت ٹوٹی پھوٹی سی لگی۔

"امی۔ ایک منٹ۔" ماں سے نظریں ٹکرائیں تو اس نے انہیں روکا۔

"کیا ہوا ملاتی؟" وہ وہیں رک گئیں۔

"یہ۔ لیجیے آپ۔ آمنہ خالہ کو واپس کر دیجیے گا۔ اب اس پر میرا کوئی حق نہیں۔" ملاحت نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکتے ہوئے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کر ماں کی مٹھی میں دبا دی۔ رافع بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔ جو خالی گلے پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ ان کا دل چیخ گیا۔ شباہت کی بھی ماں تھیں۔ چپ ہو گئیں۔ کوئی اور یہ ظلم ڈھاتا تو اسے جھولی بھر بھر کر بددعا دیتیں۔

"میری صابر بچی۔ اللہ تو ہمیشہ اس کی حفاظت فرمانا۔ شباہت تو نے بڑا ظلم کمایا۔ اتنے دلوں کو توڑنے کے بعد تیرا دل خوش رہے گا' میرا دل اس کی گواہی نہیں دیتا۔" وہ اداس سی بڑے کمرے کی طرف بڑھیں' جہاں قریبی خاندان کے افراد کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خالہ جی۔ میں تو چھوٹی کی شادی کا کارڈ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سنا تو تھا کہ حسن میاں کی بات بڑی سے ٹھہری ہے۔ پر شادی شباہت سے ہو رہی ہے؟ ان باتوں میں کتنی سچائی ہے؟" ملاحت کی پھوپھی زاد بہن رضوانہ کو کرید لگی ہوئی تھی۔

"اے لو۔ تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے اس خاندان میں نئی آئی ہو۔ کیا اپنی اسرع ممانی کو جانتی نہیں ہو؟ اپنے بھیا کے مرنے کے بعد سے تو جیسے ہمیں غیر کر دیا ہے۔ کوئی صلح نہ کوئی مشورہ غیروں کی طرح کارڈ بھجوا دیا۔ ارے انہوں نے اپنے گھر کی باتیں ہمیشہ ڈھکن ڈھانک کر رکھیں۔ ہمیں تمہیں کیسے خبر ہونے دیتیں؟" انوری ہاتھ نچاتے ہوئے جوش میں آگئیں۔ "اسرع ان خاندان والوں سے کیا مشورہ کرتیں' جنہوں نے عرفان صدیقی کے بعد پلٹ کر پوچھا نہیں کہ یہ لوگ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔"

"یہ بات تو آپ نے سولہ آنے ٹھیک کہی۔ پر آپ تو حیدر آباد میں تھیں۔ ہماری امی تو یہیں تھیں۔ کون سا ان کو پہلے سے صلح مشورے کے لیے بلا لیا۔" رضوانہ نے سر ہلا کر تائید کی۔ ملاحت کی بڑی پھوپھو اکبری کو بھی بھاوج سے ایسے ہی گلے شکوے تھے۔

"میں۔ تو جانوں کہ ملاحت جو اتنے بڑے سینٹر میں نوکری کرنے لگی ہے نا' تو اس نے خود ہی شادی سے انکار کر دیا ہو گا۔ خوب کما رہی ہے۔ دیکھنا کوئی دوسرا پھانس لیا ہو گا' جب ہی تو بہن کو اپنا منگیتر دان کر دیا۔" سروری نے پان دان کا ڈھکن کھٹ سے بند کیا اور بولیں۔

ملاحت جو دل کڑا کر کے دنیا کا سامنا کرنے کے لیے بڑے ہال میں داخل ہوئی۔ اتفاق سے ان لوگوں

کے پیچھے ہی آکھڑی ہوئی تھی۔ ان کو خبر نہ ہوئی۔ اس پلٹ سے بے خبر کے ذرا سی دیر کو زبان کے چٹخارے کے لیے کی جانے والی بڑی بڑی باتوں کا بھگتان بڑا سخت ادا کرنا پڑتا ہے۔

پہلے قدم پر ہی ایسی زہریلی باتیں سننے کے بعد وہ دکھ سے لمحے بھر کو منجمد ہوئی۔ مزید سننے کا یارا نہ تھا۔ فوراً" پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

"ابو۔ آپ مجھے کیوں چھوڑ گئے۔ میں تنہا رہ گئی ہوں۔ مجھ سے دنیا کا تنہا مقابلہ نہیں ہو گا۔ میں ٹوٹ رہی ہوں۔" وہ بے قراری سے روتے ہوئے باپ کو پکارنے لگی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو اس کو یہ دن کیوں دیکھنے پڑتے ان کی جگہ وہ گھر کی بڑی بنی تو اسے دل بھی بڑا کرنا پڑا مگر آنکھیں چھوٹی پڑ گئیں، بہنے لگیں۔ باپ کے ساتھ ساتھ اس نے بہن کی سنگ دلی کا بھی ماتم کرلیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی عرفان احمد کے جانے کا دل بھر کر غم بھی نہ منا پائے تھے کہ وہ لوگ زندگی کی بنیادی ضرورتوں نے ایک ایک کرکے سر اٹھانا شروع کردیا۔

ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے ملاحت نے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے۔ کالج والوں نے عرفان صدیقی کی شرافت اور لیاقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اعزاز کو کالج میں اسسٹنٹ لائبریرین کی نوکری دے دی۔ کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ نوکری بھی غنیمت تھی۔ اس نے ملاحت سے مشورہ کرکے فوراً" ہی شام کے کالج میں اپنا ٹرانسفر کروالیا۔ تاکہ پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ مگر اس کی قلیل تنخواہ میں گزارا بہت مشکل تھا۔ وہ قریبی رشتے دار جو باپ کی زندگی میں ان کے یہاں دعوتیں اڑانے آتے تھے، اب یوں بھاگتے جیسے وہ ادھار مانگنے والے ہوں، حالانکہ اس وقت انہیں صرف اخلاقی مدد کی ضرورت تھی۔

اگر مزاج نہیں بدلا تو وہ آمنہ کا۔ ان کے خلوص میں ذرا کمی واقع نہ آئی۔ ایسی غم زدہ فضاؤں میں ان کی آمد بہار بن جاتی۔ اچھے وقت میں ساتھ نبھانے والے تو ہزار۔ پر دکھ میں اگر ایک ہاتھ بھی آنسو پونچھنے کو بڑھے تو وہ تاعمر یاد رہتا ہے۔ بھلائے نہیں بھولتا۔

وہ ارفع کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اکثر ڈرائیور کے ساتھ کھانے پینے کی چیزوں سے لدی پھندی ان کے یہاں پہنچ جاتیں۔ ہنسی مذاق کرکے سب کا دل بہلاتیں۔ بچپن کی یادیں تازہ کرتیں۔ ماں کو بہلتا دیکھ کر ملاحت سکون کا سانس لیتی۔ اس کے دل سے ہونے والی ساس کے لیے دعائیں نکلتیں۔ اعزاز صبح کالج، رات کو کھپتا۔ شباہت کے اپنے غم۔ ارفع اس سے بُری طرح خفا تھیں۔ دونوں میں کافی عرصے سے بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ تنگ آکر شباہت نے قریبی پرائیویٹ اسکول میں جاب کرلی۔ اس طرح دن کا وقت اچھا گزرنے لگا اور وہ اپنا چھوٹا موٹا خرچہ خود اٹھانے کے قابل بھی ہو گئی۔

"امی۔ یہ رکھ لیجیے۔" شباہت نے اپنی پہلی تنخواہ ڈرتے ڈرتے ماں کی طرف بڑھائی۔

"ملاحت اس سے کہہ دے مجھے اس کی کمائی سے ایک کوڑی بھی نہیں چاہیے۔ نہ آج۔ نہ ہی کل۔" انہوں نے اس کی مٹھی میں دبا تنخواہ کا لفافہ دیکھا اور غصے سے ملاحت کو مخاطب کیا جو کمرے میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ ملاحت نے ماں کو سمجھانا چاہا۔ الٹا وہ رونے بیٹھ گئیں۔

یوں شباہت مزید بدگمان ہوتی چلی گئی۔ اسکول سے واپس آکر سب سے کٹی کونے کھدرے میں چھپی جانے کون سے کاموں میں الجھی رہتی۔

"یہ وہی آنگن ہے نا۔ جہاں ہم سب کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ ہائے۔ اب کہاں سے میں ان پیارے لمحوں کو واپس لاؤں جو میرے دل میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے ہیں۔" ملاحت صحن میں بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ پرانی یادوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر ڈالا۔ یادیں۔ آنسو بن کر ٹپ ٹپ بہنے لگیں۔

وہ خود پریشان تھی۔ گھر کا ماحول عجیب ہو کر رہ گیا۔

پیسے کی تنگی تھی۔ حالانکہ وہ کمر کس کر میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ اس کی انگلش بہت اچھی تھی۔ آخر عرفان صدیقی کی شاگرد وہ رہ چکی تھی۔ گرامر پڑھانے کا انداز اتنا سادہ اور سہل تھا کہ شہر بھر میں اس کے پڑھانے کے انداز کی شہرت پھیل گئی۔ کئی مشہور اداروں نے اسے اپنے یہاں پڑھانے کی آفر کر دی۔ ملاحت نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ پر جان توڑ مشقت کے بعد بھی محنت کا وہ معاوضہ ہاتھ نہیں آتا جس کی وہ حق دار تھی۔ گھر پر پڑھنے والے اسٹوڈنٹس کی تعداد بھی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ ان سب کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جن کو منع کرتی۔ ان کے والدین کا دباؤ ہوتا کہ ہمارے بچے کو تو آپ سے ہی پڑھنا ہے۔ یہیں سے اس کے دماغ میں ارفع کوچنگ سینٹر کھولنے کا سودا سمایا۔ وہ ابھی اس بارے میں پلاننگ ہی کر رہی تھی کہ حسن کی اچانک آمد نے اس کی زندگی میں ہلچل سی مچا دی۔ آمنہ نے یہ خبر سناتے ہوئے ملاحت کو گلے لگا لیا۔ شباہت جو کسی کام سے اس طرف آئی تھی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ملاحت کیا بات ہے۔ میری آمد سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟" حسن کی گہری نظریں کچھ کھوجتی ہوئی اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ کلاس لے کر تھکی ہاری شام ڈھلے گھر میں داخل ہوئی تو حسن سے سامنا ہوا۔

"نہیں ایسا تو نہیں آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟" وہ جلدی سے بیگ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں جب بھی یہاں آتا ہوں۔ آپ غائب ہو جاتی ہیں۔" اس کا انداز شرارتی سا تھا۔ وہ مسکرا دی اور معذرت کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"اف۔ اتنی سنجیدہ مزاج کی ہے۔ باقی زندگی کیسے گزرے گی حسن میاں؟" وہ وہیں کھڑا اس کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ پر شباہت نے اسے زیادہ سوچ بچار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ چائے کے بہانے اندر لے گئی۔

جلدی جلدی پانی کے چھپاکے مار کر منہ پونچھتی، بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ شباہت نے مزید اشیا سے میز بھر دی تھی۔ خود بھی نکھری نکھری تھی خوشبوؤں میں بسی بہت تازہ دم اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ملاحت اس وقت سوکھا پھول بنی کھڑی تھی۔ حسن نے دونوں کا موازنہ کیا۔ "آپ۔ کبھی مسکرائی بھی ہیں؟ یا ہر وقت ایسے ہی منہ بسورے رکھتی ہیں۔" ملاحت کو متوحش سا دیکھ کر حسن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ منگیتر تو وہی تھی نا۔ اپنا ہونے والا تھا۔ ارفع نے ملاحت کو آتے دیکھا تو شکر ادا کیا۔ نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "نہیں۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔ بس وہ امتحانات کا سیزن ہے۔ اس وجہ سے مصروفیت عام دنوں سے کچھ زیادہ ہے۔ تو۔" اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ حسن بلیک جینز اور کیمل کلر کی ٹی شرٹ میں بہت شاندار لگ رہا تھا۔ وہ اپنی تصویر سے بھی زیادہ اسمارٹ اور فریش تھا۔ پاس سے اٹھنے والی مسحور کن مردانہ خوشبو۔ ملاحت نے زوردار سانس بھری۔

ایک اس کا حلیہ تھا۔ اپنا جائزہ لیتی ہوئی وہ شرمندہ ہو گئی پر آج کل تو اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ ماں نے فون پر حسن کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے اسے جلدی گھر لوٹنے کی تاکید کی تو وہ کلاس آف کر کے جلدی آ گئی۔ شباہت کی شوخیاں، حسن کی آمد پر ناگواری میں بدل گئیں۔ حسن کو آسٹریلیا سے لوٹے پندرہ دن ہی ہوئے تھے۔ پہلی دفعہ میں وہ عرفان صدیقی کی موت کا پرسہ دینے آمنہ کے ساتھ اطلاع دے کر آیا۔ ارفع نے زبردستی ملاحت کی چھٹی کرائی۔ اس کو ڈھنگ کے کپڑے پہنائے۔ نک سک سے درست کروایا۔ حسن نے ملاحت کو دیکھنے کے بعد جب کوئی اعتراض نہیں اٹھایا تھا تو۔ آمنہ کی جان میں جان آئی۔ نرمین اور شاذمین نے البتہ بھائی سے خوب بحث مباحثہ کیا۔ پر وہ صرف ماں کے چہرے پر اترتے سکون کو دیکھ رہی

خوش ہو گیا۔

"ملائی۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے۔ جلد کتنی بے رونق ہو رہی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، سوا یہ چشمہ بھی پرانا ہو گیا ہے۔ حسن میاں آئے ہوئے ہیں کچھ نہیں تو شباہت کی طرح چار لر کا چکر ہی لگا آؤ، چہرے پر کچھ تو تازگی آئے گی۔" انہوں نے اسے کچھ سمجھانا چاہا، مگر وہ انجان بنی کتابوں میں منہ دیے رہی۔ ارفع سے اور کچھ نہ ہوا تو زبردستی پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا، سر دباتے ہوئے بالوں میں تیل بھی لگایا، ماں کی نرم پوروں سے جیسے سکون کی لہریں نکل کر اس میں جذب ہو گئیں، وہ کب بے خبر سوئی اسے پتا نہیں چلا، سو کر اٹھی تو بال دھونے کا ٹائم نہیں ملا ایسے ہی جلدی جلدی چٹیا بنائی اور پڑھانے چل دی، واپس لوٹی تو حسن موجود تھا مجبوراً "اسی برے حلیے میں منگیتر کے سامنے پیش ہو گئی۔ حسن کو پہلی ملاقات کے مقابلے میں آج وہ بڑی خستہ حال لگی "تیل زدہ بال، چہرہ پر بھی چکنائی، مسلے ہوئے کالے لباس میں وہ کچھ زیادہ ہی اکھڑی لگی" حسن نے گھبرا کر نگاہ اس پر سے ہٹائی۔ "وہ نوں وہ اللہ! نے ملاحت کا نقشہ ایسا غلط تو نہیں کھینچا تھا۔" حسن نے جھرجھری لے کر سوچا۔ نشتن اور شاہ تمین کی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ جو وہ گاہے بگاہے ملاحت کے خلاف اس کے کانوں میں انڈیلتی رہتی تھیں۔ مگر اسے بھی اپنی ماں کی زبان کا بہت پاس تھا۔ اس لیے بہنوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

"یہ شباہت، ملاحت سے کتنی الگ ہے۔"

اس نے سامنے سے ٹرے میں چائے کا کپ لیے شباہت کو آتے دیکھا، وہ سبز لباس میں سراپا سنگ، بالوں کو اونچا کر کے چھوٹی سی پونی بنائے، سحر انگیز آنکھوں کی خوب صورتی کاجل سے لائنر سے بڑھائے، ہونٹوں کا گداز سا گلابی پن، سفید، شفاف رنگت۔ حسن نے دلوں بہنوں کا موازنہ کیا۔ شباہت کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا کہ دماغ نے اچانک جھاڑ پلائی، ماں کے بندھے ہاتھ خیالوں میں چلے آئے، جو ملاحت سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے انہوں نے اس کے آگے جوڑے تھے۔ حسن نے سر جھٹکا، ملاحت سے بات چیت شروع کی تو اسے خوشگوار حیرانی ہوئی۔ اس کا لاجواب انداز گفتگو اور ہر موضوع پر قابل رشک معلومات اور انگلش پر گرفت حسن کافی خوش نظر آنے لگا، قابل لوگ اسے ہمیشہ سے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ ملاحت کی لیاقت نے اسے چاروں شانے چت کر دیا۔

اب وہ دونوں بڑے عالم انداز میں عالمی سیاست پر بحث کرنے لگے۔ شباہت تھوڑی دیر وہاں بیٹھی ان دونوں کی باتیں سنتی رہی، پھر بور ہو کر برے برے منہ بنانے لگی۔ اس کے باوجود حسن نے اس کا نوٹس نہ لیا تو پیر پٹختی وہاں سے چل دی۔ ارفع نے ان دونوں کو محو گفتگو دیکھا تو سر ہلایا۔ ورنہ شباہت کے رنگ ڈھنگ سے تو انہیں رشتہ ٹوٹ جانے کے خوف میں مبتلا کیے جا رہے تھے۔

"وہ آپ نے ٹی وی پر کوئی گیم شو دیکھنے کا کہا تھا۔"

شباہت نے اپنے شیفون کے دوپٹے کا لٹکتا پلو اٹھاتے ہوئے اسے پکارا "تھوڑی دیر میں ہی ڈرائنگ روم میں اس کی واپسی ہوئی تھی۔ ارفع اور اعزاز بھی وہاں بیٹھے چائے پیتے ہوئے حسن کو کمپنی دے رہے تھے۔ انہوں نے شب کے یوں حسن کو مخاطب کرنے پر تنبیہی اور اعزاز نے ملامتی نظروں سے دیکھا، تاہم اس نے چہرہ پر "پروا نہیں" کا بورڈ لگا لیا۔

"نہیں پھر کبھی دیکھیں گے۔ آج بہت دیر ہو گئی ہے۔ بس اب مجھے گھر جانا ہے۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" حسن نے نرمی سے جواب دیا اور اجازت چاہی۔

شباہت نے حسن اور ملاحت کو کسی بات پر مسکراتے دیکھا تو عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ارفع جوان دونوں کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ حسن کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دینے لگیں۔

✡ ✡ ✡

"یا اللہ۔ میں کیا کروں؟ کیا اتنی خود غرض ہو جاؤں کہ صرف اپنے بارے میں سوچوں؟ میرے جانے کے بعد گھر والوں کا کیا ہو گا؟" ملاحت رات کو کتابیں کھول

کر پڑھنے بیٹھی تو کئی سوالات اس کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ اریفع نے بتایا تھا کہ آمنہ نکاح کا کہہ رہی ہیں۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ابھی حسن سے کچھ وقت مانگ لوں گی' پہلے شباہت کی شادی کروں گی' اس کے بعد اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچوں گی۔" اس نے عزم سے سوچا' ذہن دوڑایا تو اسے اپنے ساتھ پڑھانے والے ایک کولیگ انس کا خیال آیا۔ گو کہ وہ اپنے ساتھ پڑھانے والے مرد ٹیچرز کے ساتھ بالکل بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک فاصلے پر رہتی تھی۔ لیکن انس کا بے ریا اب ولہجہ۔ پرخلوص انداز۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اس کی طرف بڑھا۔ اب تو دونوں میں اچھی خاصی بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ کئی بار انس نے مذاق ہی مذاق میں اس سے اپنے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا بھی کہا۔

"انس۔ اچھے خاندان کا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ خوش شکل بھی ہے۔ یقیناً" شباہت کے ساتھ بہت سوٹ کرے گا۔" ملاحت نے خود ہی کڑی سے کڑیاں ملا کر زنجیر تیار کرلی۔

"اعزی۔ ذرا بیٹھنا۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے اعزاز کو بلا کر ساری بات بتائی۔ چھوٹا ہی سہی' پر اب وہ اس گھر کا اکلوتا مرد تھا' جو اہم معاملے میں اس کی رائے جاننا ضروری تھی۔ تاہم اس نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ اسے ابھی شباہت اور ماں کو اس رشتے کے بارے میں بتانے سے منع کر دیا۔

"آپا۔ یہ تو اچھی بات ہو جائے گی۔" اعزاز نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اگر انس نے انکار کر دیا تو شب کی بدگمانیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔" اس نے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"انس کو ایک' دو دن میں گھر لے کر آتی ہوں۔ اگر اسے شب پسند آگئی۔ تب ہی یہ بات منہ سے نکالوں گی۔" ملاحت نے منصوبہ بندی کی اور پھر بھائی سے اس بارے میں مشورہ مانگا۔

"جیسا۔ مناسب سمجھیں۔ مگر دیکھ لیں۔ شب آپا کا مزاج تھوڑا مختلف ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ خود انکار کر بیٹھیں۔ انس بھائی کے سامنے آپ کی بات خراب ہو۔" اعزاز نے بہن کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔

"شب کیوں انکار کرے گی۔ اتنا اچھا تو ہے' پڑھا لکھا قابل۔ وہ اپنے ماموں کے پاس جلد ہی دبئی چلا جائے گا۔ جہاں انہوں نے اس کی بینک میں بہت اچھی جاب کا انتظام کیا ہوا ہے۔ یہاں تو وہ عارضی طور پر پڑھاتا ہے۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھری دنیا میں اس کی ایک ماں ہی تو ہیں۔ جیسا ہماری بہن کا مزاج ہے اسے ایسا ہی گھرانہ سوٹ کرے گا۔" ملاحت نے اعزاز کو تفصیلات بتائیں۔

"ٹھیک ہے۔ آپ نے انس بھائی میں کچھ اچھائی دیکھی ہو گی۔ حسن بھائی بھی آئے ہوئے ہیں۔ آپ یہ نیک کام جلدی نمٹا دیں تاکہ دونوں تقریب ایک دن ہی ہو جائیں۔ میرے لیے اس سے اچھی کیا بات ہو گی۔" اعزاز نے نرمی سے بڑی بہن کا ہاتھ تھاما اور محبت سے بولا۔ ملاحت' حسن کے نام پر سرخ ہو گئی' بھائی کی کمر پر ایک دھپ لگائی۔

"واہ میرا اعزی تو بہت بڑا اور ذمہ دار ہو گیا ہے۔" ملاحت کو اس پر بہت پیار آیا۔

"ابو کے بعد۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پر میں اپنی دونوں بہنوں کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔" اعزاز افسردگی سے بولا تو ملاحت کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ دونوں بھائی' بہنوں کی بھلا جو بھی پلاننگ کر رہی ہو' پر اوپر والے کی پلاننگ۔ انسانوں سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہی اصل پلانر ہے' وہ کرتا ہے۔ جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"ارے بیٹا۔ کیا بات ہے؟ بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔ منو بھی کافی دنوں سے نہیں آئی۔" ماں کی پرشفقت آواز نے کانوں میں رس گھولا۔ وہ حسن کا پرتپاک استقبال کرنے میں مصروف تھیں۔ ملاحت کے کان کھڑے ہوئے۔ امتحانات کیا ختم ہوئے اس کی

مصروف زندگی میں ایک دم ٹھہراؤ سا آگیا۔ وہ صحن میں موجود نیم کے درخت کے نیچے بیٹھی پسندیدہ کتاب ہاتھ میں تھامے فارغ لمحوں کا لطف اٹھا رہی تھی۔ حسن کی آمد پر۔ معصوم سی مسکراہٹ۔ ملاحت کے لبوں کو چھو گئی۔

"بس۔ خالہ جی کچھ۔ خاص نہیں بس مصروف رہا۔" اس کا لہجہ اور انداز ارفع کو کچھ اکھڑا سا لگا۔ وہ پہلے ہی واہموں کا شکار ہو رہی تھیں۔ ہر دوسرے روز فون کرنے والی آمنہ کا ایک ہفتے سے فون نہیں آیا تھا۔ نہ حسن نے چکر لگایا۔ ارفع نے فون بھی کیا تو عائزین نے ماں کی طبیعت خرابی کا بتایا اور معذرت کرلی۔ ارفع نے آج اعزاز کے ساتھ جاکر ملنے کا پروگرام بنایا تھا کہ حسن آگیا۔ پر وہ بھی کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیا۔

"اچھا۔ تم بیٹھو میں ملاحت کو چائے کا کہتی ہوں۔" انہوں نے جان بوجھ کر بیٹی کا نام لیا' تاکہ اس کی موجودگی کی خبر ہو جائے۔

"ارے نہیں خالہ۔ ملاحت کے پاس میرے لیے کہاں وقت ہوگا؟ وہ بہت مصروف ہستی ہیں۔ آپ ایسا کریں شباہت کو چائے کا کہہ دیں' مجھے اس کے ہاتھ کی چائے اچھی لگنے لگی ہے۔" حسن نے کر اندر لانے ایک نئی کہانی سنائی۔ ارفع کا ماتھا ٹھنکا' پر یہ۔ تھوڑے لے داماد کو تو کتنا مناسب نہ لگا۔ اس کی آمد پر پیدا ہونے والی ان کی گرمجوشی ایک دم سرد مہری میں ڈھل گئی۔ ملاحت کے کانوں تک بھی ساری باتیں پہنچ رہی تھیں۔ عجیب سی گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ دل بجھ کر رہ گیا۔ ارفع نے حسن کو اندر بٹھایا اور پھر اسے آواز دے کر حسن کی آمد سے مطلع کیا۔

"لگتا ہے بہت ناراض ہیں۔ پچھلے دنوں کی مصروفیت میں اکثور بھی بہت ہوئے ہیں۔" اس نے دل کی اداسی دور کرنے کے بہانے تراشے۔ ہوا بھی کچھ یوں ہی تھا۔ حسن نے اسے دو دفعہ۔ فون بھی کیا' مگر وہ زیادہ بات نہ کرپائی۔ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ منہ ہاتھ دھو کر بال بنائے۔ کپڑوں پر نظر ڈالی۔ پنک اور وائٹ کاٹن کا سوٹ کافی بہتر حالت میں تھا۔ مسکرا کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تو۔ شباہت کی چہکتی آواز باہر تک آرہی تھی۔

"شاید حسن کو کمپنی دینے میں مصروف ہے۔ بس انس ہاں کردے تو اس کی بھی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔" ملاحت کا وہی مثبت انداز۔ مگر شباہت بھی ایسا سوچتی تب بات بنتی نہ' وہ تو کچھ اور ٹھانے ہوئے تھی۔

ملاحت پچھلے ہفتے انس کو اپنے ساتھ گھر لے کر آئی تھی۔ کولیگ کہہ کر ملوایا۔ اعزاز کو اس ملاقات کے بارے میں پہلے سے خبر تھی۔ اسی لیے وہ مسکراتا رہا۔ انس سے اس کی فوراً ہی دوستی ہوگئی۔ چٹکلے چھوڑتا وہ یہاں بھی چھا گیا۔

"بڑا ہی نیک بچہ تھا۔ کسی اچھے خاندان کا لگتا ہے۔" ارفع کو انس بہت پسند آیا۔ انہوں نے دو تین بار۔ ان شباہت کو دیکھتے ہوئے ملاحت سے پوچھا' تو وہ سر ہلا کر مسکرا دی۔

اتفاق سے دوسرے دن سے ہی وہ چھٹیوں پر چلا گیا۔ باہر جانے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ جو کر رہا تھا۔ اسی لیے ملاحت کی اس سے بات نہ ہو سکی۔ وہ بے خبر۔ بہن کی زندگی میں خوشیوں بھرا اجالا بکھیرنے کے لیے تانے بانے بننے میں مصروف تھی۔ یہاں تو اس کی اپنی دنیا۔ اندھیر ہونے لگی تھی۔

"آج میں حسن کی ساری شکایات دور کردوں گی۔" خیالات کی رو کو اپنی طرف موڑتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے لگی تھی کہ اچانک اپنی جگہ پر ٹھٹک گئی۔ وہ دونوں اس کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔

"سچ پوچھو تو مجھے ملاحت اس لحاظ سے کبھی اچھی نہیں لگی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میری بہنوں نے ہمیشہ تم دونوں کا ذکر اس انداز میں کیا کہ میرا جھکاؤ تمہاری طرف ہوگیا۔ مگر میں اپنی امی سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ آنکھ بند کرکے ان کی پسند کو اپنا لیتا' اگر مجھے وہ بات پتا نہیں چلتی۔" حسن کے لفظوں نے اس کے دل کو جیسے چھید کے رکھ دیا۔

اس کی آنکھوں نے ملال کو ڈھونڈا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارفع کے کانوں میں بھی یہ دکھ بھری باتیں پہنچیں۔

"کون سی بات؟ پلیز بتائیے نا۔" شباہت نے بالوں کو بڑی ادا سے کانوں کے پیچھے اڑسا۔ کانوں میں پڑا سنہری بالیوں کا نگ بھی اٹھلایا۔

"کچھ نہیں چھوڑو۔" حسن جھجکا۔ ملاحت پر یہ لمحے بہت بھاری گزرے۔

"پلیز۔ بتا بھی دیں نا۔" شباہت کا انداز موم کردینے والا ہوا۔

"اصل میں۔ ملاحت کا کسی۔ انس نامی لڑکے سے افیئر چل رہا ہے۔ وہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا ہے جہاں محترمہ شام کی کلاسز لیتی ہیں۔" حسن کی آواز تھی یا تیزاب۔ ملاحت جھلستی چلی گئی۔

"اللہ اپا اتنا گر جائیں گی۔ جب ہی تو ایک ہفتے پہلے اسے ہم سب سے ملوانے لائی تھیں۔ ویسے اچھا خاصا چندے ہم بندہ ہے۔" شباہت کے الفاظ نے جلے پر نمک چھڑکا۔

"یااللہ۔" ملاحت نے دیوار کا سہارا لے کر آسمان کی طرف شکوہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ملاحت کو لگا کہ اس کا دل بس اب بند ہی ہوجائے گا۔

"اصل میں۔ میرے دوست ارحم کا بھائی اسی کوچنگ میں پڑھتا ہے۔ جہاں یہ دونوں پڑھاتے ہیں۔ دو دن قبل جب میں اس سے ملنے گیا تو اتفاق سے باتوں کے درمیان ملاحت کا ذکر نکلا۔ تب اس نے جھجکتے ہوئے ان دونوں کے حوالے سے وہاں پھیلی ساری کہانی سنائی۔ بقول اس کے آج کل مس ملاحت اور سر انس ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سارے اسٹوڈنٹس میں اسی قسم کی باتیں گردش کررہی ہیں۔" حسن کا لہجہ افسردگی سے معمور ہوا۔

"میں خود اتنے سال باہر رہا ہوں۔ اسی لیے ان باتوں پر یقین کرنے کے بجائے اسے جھٹلا دیا۔ پر وہ مجھے اپنے ساتھ۔ اسی کوچنگ سینٹر میں لے گیا۔ وہاں جاکر دوسرے لڑکوں کی زبانی بھی ان دونوں کی داستان سنی۔ میرا سر تو دوست اور اس کے بھائی کے سامنے شرم سے جھک گیا۔ اگر ملاحت مجھے پسند نہیں کرتی تو انکار کردیتی۔ میری بھولی بھالی ماں کو بھی بے وقوف بنایا۔"

حسن کا لہجہ تیز ہوا۔ بجائے اس کے کہ شباہت بہن کی طرف داری کرتی اس کی دلی خوشی میں لگ گئی شاید اس کے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔

"چھوڑیں۔ دفع کریں۔ آپ کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔" اس نے ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ جلدی سے حسن کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں مگر کردار کی کمزوری ناممکن ہے۔ اتنے آزاد ملک میں رہتے ہوئے بھی میں نے ایک شفاف زندگی گزاری ہے۔ ملاحت بہت خوب صورت نہ سہی، تاہم کردار کی پکی ہوتی تو بھی میں اسی کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی بہنوں کے سامنے اس کے لیے اسٹینڈ لے لیتا۔ مگر اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ اب چاہے وہ سونے کی بھی بن جائے میرا دل اسے قبول نہیں کرے گا۔" ملاحت جو حسن کو سچائی بتانے جارہی تھی۔ یہ سب سننے کے بعد اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ جس کو اعتبار نہیں۔ اس سے تعلق رکھنے کا کیا فائدہ۔ اب وہاں مزید کھڑا رہنا بے کار لگا۔ جاتے جاتے حسن کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ اتنا نازک معاملہ تھا اس لیے میں نے خود جاکر تحقیقات کی۔ اس لیے اب ملاحت سے شادی کرنا مشکل ہے۔ ایک ہفتے سے ہمارے گھر میں یہی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ دونوں بہنیں میرے ساتھ ہیں پر امی اپنی دوستی خراب نہیں کرنا چاہتیں۔ بھلے بیٹے کی زندگی خراب ہوجائے۔ ابھی بھی ان سے لڑ کر آیا ہوں کیونکہ ان کو میری باتوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے ہی غلط ٹھہرا رہی ہیں۔" ملاحت کو آمنہ خالہ کے خلوص پر شبہ نہیں تھا۔ وقت نے ان کی اچھائی کا ایک اور ثبوت

پیش کر دیا۔

"اچھا۔ تو آپ نے جواب میں ان سے کیا کہا؟" ایک سوچ بڑی بی بی رلو کا کانتا بنی ہوئی ہیں۔ شباہت نے بظاہر فکر مندی سے پوچھا۔ مگر دل ہی دل میں دانت کچکچا کر سوچا۔

"میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر بات ارفع خالہ کی بیٹی سے شادی کرنے کی ہی ٹھہری۔ تو شب بھی تو ان کی بیٹی ہے ٹھیک ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگ نکاح کی تاریخ طے کر آئیں۔" حسن نے بتایا تو شباہت کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پر حسن کے فیصلے سے ان کے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

"جب بڑی نہیں۔ تو چھوٹی بھی کیوں؟" ارفع نے آمنہ کو ہری جھنڈی دکھائی۔ جو بیٹے کے مجبور کرنے پر ایک بار پھر ان کے آگے دامن پھیلائے کھڑی تھیں۔ پر اس بار وہ شباہت کی طلب گار بنیں۔ ملاحت نے ماں اور اعزاز کو بڑی دقتوں سے منا کر... صبر کر بھی سر کیا۔

"صرف نکاح نہیں ہو گا بلکہ شب کی رخصتی بھی ساتھ ہی کر دی جائے گی۔ اس کے بعد ا... کا ہم سب سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔" ارفع نے مذمت کے مجبور کرنے پر ایک فیصلہ سنا دیا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان بات اتنی خراب ہو چکی تھی کہ حسن نے اسی میں عافیت جانی۔

"فی الحال۔ شادی تو ہو جائے۔ اماں کو بعد میں منا ہی لوں گی۔" شباہت نے خوشیوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے سوچا۔ آمنہ نے چند قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا۔ نکاح مسجد میں سادگی سے ہو گیا۔ شادی کی تقریب ایک ہفتے بعد کی رکھی گئی۔

جس دن شباہت کا حسن سے نکاح ہوا۔ ملاحت نے بڑا حوصلہ دکھایا۔ پر وہ رات اس پر بہت بھاری گزری۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کس کی بے وفائی کا ماتم کرے۔ اپنے، پرائے، کس کس کو۔ اپنی آرزوؤں کا قاتل سمجھے۔

☼ ☼ ☼

دروازہ پر اچانک ہونے والی دھڑ دھڑ پر وہ چونک اٹھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے اعزاز ایک شاپر لیے کھڑا تھا۔ "آپیا۔ یہ میں آپ کے لیے شباہت باجی کی شادی میں پہننے کے لیے ریڈی میڈ سوٹ لایا ہوں۔" اعزاز نے بڑے اشتیاق سے شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاپر کھولا۔ میرون رنگ کا قیمتی شیفون کا کامدار سوٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"بڑی۔ تمہیں کب سے۔ خواتین کی شاپنگ کا تجربہ ہو گیا؟" اس نے چھوٹے بھائی کا ہاتھ چومتے ہوئے پوچھا۔ دل جو دکھوں سے چور ہو رہا تھا۔ بھائی کی محبت کے چھوٹے سے اظہار نے وحشتوں میں کمی کر دی۔

"مجھے پتا تھا۔ ساری دنیا کا خیال رکھنے والی۔ میری پیاری آپیا اپنے معاملے میں لاپروا ثابت ہوں گی۔ اسی لیے پھپو خالہ کو لے کر بازار نکل گیا۔ ان کی پسند اچھی ہے۔" اعزاز نے بہن کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہا۔ ملاحت نے غور سے جوان بھائی کو دیکھا۔ اچانک اس کا قد ان دونوں بہنوں سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دم بلائیں لے ڈالیں۔

حسن نے ولیمہ کی تقریب بڑے ہوٹل میں منعقد کی۔ دلہن بنی شباہت کا حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ مشہور ڈیزائنر کے تیار کردہ گلابی سنہری بھاری عروسی لباس میں حسن کے پہلو میں بیٹھی وہ مغرور لگ رہی تھی۔ نرمین اور شائستین دونوں حسین بھاوج کے ساتھ تصاویر بنواتے ہوئے خوب اترا رہی تھیں۔ عائشین الگ تھلگ سی رہی۔ اس کی ہمدردیاں ملاحت اور ارفع خالہ کے ساتھ تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آج کل کہاں چھپتی پھر رہی ہو ملاحت؟" انس نے موقع ملتے ہی ملاحت کو جا پکڑا، جو ایک ہفتے سے

اسے دیکھ کر کنی کترا جاتی۔ آج وہ جیسے ہی کلاس سے لے کر نکلی انس اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیوں چھپوں گی؟" ملاحت کے خشک لہجے اور استفسار پہ انس کچھ گڑبڑایا۔

"بات یہ ہے کہ میرا دبئی جانے کا معاملہ سیٹ ہو گیا ہے۔ اگلے مہینے میں جا رہا ہوں۔ اس لیے امی کو تمہارے گھر رشتے کے سلسلے میں بھیجنا چاہ رہا تھا۔" انس نے اس کو اکھڑا دیکھا تو جلدی سے مدعا بیان کر دیا۔

"اب کیا فائدہ۔ شباہت کی تو شادی ہو گئی۔" ملاحت کو لگا کہ وہ اس کی بہن کے سلسلے میں بات کر رہا ہے۔

"اوہ۔ میڈم کہاں کھو گئیں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں امی کافی دنوں سے تمہارے گھر آنا چاہ رہی ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں انہیں آج شام لے کر آجاؤں؟" انس نے اسے تفصیل سے سمجھایا۔

"تمہیں شاید خبر نہیں۔ ایک ہفتے پہلے ہی ہم نے شب کی شادی کی ہے اور یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ میں کسی کو انوائٹ بھی نہ کر سکی۔" ادھر اگر انس ہونق ہوا۔ تو ملاحت کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اس نے جلدی جلدی بات بنائی اور اپنی جان چھڑانی چاہی۔ اسے خود پر بہت بھروسا تھا۔ مگر دنیا کی کمی زبان سے بہت خوف آنے لگا تھا۔ انس کے ساتھ بلاوجہ بننے والے اسکینڈل نے۔ اس کا اپنی ذات پر سے یقین کم کر دیا۔ اسی لیے وہ بات کو جلد ختم کرنے کے موڈ میں تھی۔

"بات طویل ہو رہی ہے۔ یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں۔ قریب ہی کافی شاپ واقع ہے وہاں تک چلتے ہیں۔" انس نے اس کے گھبرائے ہوئے انداز کو دیکھ کر آفر کی۔

"شاید۔ یہ ہی مناسب رہے گا۔" ملاحت نے سنجیدگی سے کہا اور قدم بڑھا لیے۔ اتنی باتیں بننے کے بعد اسے انس کے ساتھ کافی شاپ تک جانا بھی بہت کھل رہا تھا۔ پر آخری بار ساری باتیں کلیئر کرنے کے لیے اس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا۔

"یہاں بیٹھ کر آرام سے بات چیت ہو سکے گی۔ سر راہ یوں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا کافی نامناسب لگ رہا تھا۔" وہ شاپ کے پر سکون ماحول میں داخل ہوئے تو انس نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھالی اور نوروں سے بولا۔ اس نے گردن ہلا کر تائید کی۔

"ملاحت! ایک بات یاد رکھنا۔ تمہارے متعلق کوئی بات میرے لیے بریکنگ نیوز نہیں ہوتی کیونکہ شاید تم خود اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتیں۔ جتنا کہ میں [illegible] خبر رکھتا ہوں۔ تو یقین رکھو مجھے تمہاری بہن کی شادی کی اطلاع بھی پہلے سے تھی اور چونکہ میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے مبارک باد دینے نہیں آسکا۔" انس کے انداز گفتگو نے ملاحت کی جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ بدلا انداز۔ اس کی نگاہوں میں چھپی حیرانی نے انس کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"بھئی خدا خدا کر کے تو میری مشکل آسان ہوئی" کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جب تک تم شب کی شادی نہیں کرو گی۔ اپنی طرف توجہ بھی نہیں دو گی خیر اب تو معاملہ بھی حل ہو گیا نا۔ اب تو تمہیں شادی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے؟" انس مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا جانے کیوں وہ ان باتوں پر انس کو ایک ٹکا سا جواب بھی نہیں دے پائی۔ شاید اس کی آنکھوں سے بہتی محبت کی دھار نے ملاحت کو سختی اختیار کرنے سے روک دیا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ پلیز مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" ملاحت نے اس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی" شفاف شیشے کے پار سے جھانکتے ہوئے سرسبز نظاروں نے۔ آنکھوں کو تراوٹ بخشی۔

"دیکھو۔ اللہ نے انسان کو بے شک انسان کے لیے ہی پیدا کیا اور جو کچھ تم نے اپنی فیملی کے لیے کیا۔ وہ تمہاری نیکی اور ذمہ داری بھی تھی۔ لیکن اب وہ

وقت آگیا ہے کہ تم کچھ اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تمہارے دماغ میں چل رہا ہوگا کہ یا اللہ ویٹر جلدی سے کافی لے آئے اور میں گرم گرم کافی پیوں اور یہاں سے نکلوں۔" انس نے اس طرح منہ بنا کر کہا کہ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جسے چھپانے کے لیے۔ اس نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی جانب آتا ہے اور انسان کی موت آتی ہے تو اسے تمہارے جیسی کسی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔" انس نے اسے مسکراتے دیکھ کر جل کر کہا۔ ملاحت لفظ "محبت" پر ایک دم شاک رہ گئی۔ اتنا کھلم کھلا اظہار۔

"دیکھو ملاحت! جانے تمہیں۔ اس بات کی خبر ہے یا نہیں۔ پر میں جانے کب سے تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے کافی میں چمچہ چلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ملاحت نے نگاہیں اٹھائیں۔ بلاشبہ اس کی شاندار شخصیت کسی کو بھی اپنا دیوانہ بنا سکتی تھی۔

"پلیز۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔ ویسے بھی یہ میرے نزدیک یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔" وہ چڑ گئی۔ اس کا بے لچک لہجہ۔ انس کو دکھی کر گیا۔ وہ ایک دم اپنی محبت کے لیے جذباتی ہو اٹھا۔

"پلیز! میں نے تمہیں اپنے انتہائی خالص لمحوں میں چاہا ہے۔ میری محبت بس اظہار کا نام نہیں' بلکہ اس کے پیچھے اخلاص چھپا ہوا ہے۔ اتنا یقین دلاتا ہوں کہ جس دن تمہیں اپنا بنا کر لے جاؤں گا۔ تمہیں خوش رکھنے کی تاعمر کوشش کروں گا۔" انس کی جذبے لٹاتی آنکھیں' جذبات لٹاتا لہجہ اور دل کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی آواز ملاحت کو کسی اور ہی دنیا میں لے گئی' لیکن وہ بہت محتاط لڑکی تھی۔ فوراً" ہی حقیقی دنیا میں واپس ہوئی۔

"کیا مطلب ہے۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔" وہ سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنا چاہتی تھی۔ انس کے بدلے بدلے انداز نے محتاط کر دیا تھا اور جب انس کی نگاہ اس سے ملی تو وہ چور سی ہو گئی۔

"کیا ہے یار۔ اب بھی مطلب پوچھا جا رہا ہے۔ میں اپنے سر پہ کافی کی پیالی مار لوں گا۔ جبھی کتنی دفعہ تو دبی زبان میں اپنے دل کا عندیہ دینے کی کوشش کی اور اب منہ کھول کر شادی کا کہہ رہا ہوں تو بھی سمجھ نہیں آرہی۔ کیا تم کسی اور کے دل کی کہی بھی سن سکتی ہو۔ پہلے بھی تمہیں شادی کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا کہہ کر اشارے کنایوں میں اپنے دل کی بات سمجھانا چاہا۔ پر اس وقت بھی۔ تم پر اپنی چھوٹی بہن سوار تھی۔ جب دیکھو اس کے ذکر خیر میں مصروف ہو جاتیں۔ میں اس وقت ہی سمجھ گیا کہ تم اپنی چھوٹی بہن سے پہلے شادی کے لیے راضی نہیں ہو گی۔ اسی لیے اتنا وقت چپ سادھے رکھی۔ بس اب [illegible] نے گرم کیا۔ یہ فریضہ بھی بہ حسن و خوبی ادا ہو گیا تو اب صرف یہ بتا دو کہ میں اپنی امی کو کب [illegible] کر تمہارے گھر لاؤں؟ میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا ہوا ہے۔ ذرا امپریشن جمانے کے لیے کچھ تعریفیں بھی کر دی ہیں۔ باقی تم سنبھال لینا۔ آخر وہ اپنے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کے سر پہ سہرا سجانے کے لیے بے تاب ہیں۔" اس نے بڑے مان سے اس پر اپنا حق سمجھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ مگر ملاحت کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس کے تو جیسے پیروں تلے زمین ہی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ ایسا تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

ملاحت کا ایسا اترا چہرہ دیکھ کر انس کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ کتنے عرصے سے ملاحت سے متاثر تھا۔ اس کے کردار کی پختگی۔ ہمدردانہ طبیعت اور نرم مزاجی۔ اسے اپنی ماں کے ساتھ گزارہ کرنے کے لیے ایسی ہی کسی سمجھ دار لڑکی کے ساتھ کی خواہش تھی۔ ویسے بھی وہ ظاہری شخصیت کی جگہ باطنی خوبیوں کا شیدائی تھا اور ملاحت میں یہ دو خوبیاں تھیں۔

"سوری انس۔ شاید تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابا کے بعد میں نے ہی اپنے گھر کی ذمہ داری اٹھائی' مجھے قسمت نے بڑا بنایا سو

واقعی بڑی بن گئی۔ بہن کی شادی ہونے کے باوجود میری ذمہ داریاں ختم نہیں ہوئیں۔ میری بیوہ ماں ہے۔ مجھے چھوٹے بھائی کو اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجنا ہے۔ ان حالات میں تم خود ہی سوچو اپنے بارے میں سوچنے کا وقت کہاں ہے؟" ملاحت نے سلیقے سے تمہید باندھی۔ اسے آج احساس ہوا کہ انکار کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر جب کوئی آپ سے شدید محبت کرتا ہو۔

"کوئی بات نہیں۔ تم کہو تو۔ میں زندگی کے آخری موڑ تک تمہارا انتظار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔" انس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ملاحت کو پیش کش کی۔ وہ ایک دم دکھی لگنے لگا۔ "ایک بات اور ہے۔ اگر میں شادی کا سوچوں بھی تو وہ شخص تم ہرگز نہیں ہو سکتے کیونکہ تم میرے کولیگ ہو۔ یہ بات سب جانتے ہیں اور تم سے کسی طرح کے تعلق کا مطلب لوگوں کو موقع دینا کہ وہ اس بات کو غلط رنگ دیں۔ تم سے شادی کا مطلب دنیا کی جھوٹی باتوں کو سچ ثابت کرنا ہوگا۔ ویسے تم نے میری بے تکلفی کو بہت ہی غلط رنگ دیا۔" اس سے پہلے کہ وہ بکھر جاتی بجلی سے کیوں۔ اس نے خود کو پھر اسی خول میں بند کر لیا۔ جس کو کچھ دیر پہلے انس کی باتوں نے توڑ دیا تھا۔ وہ انس کو افسردہ چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

انس کو انکار کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ مصروف کر لیا۔ اس کی محنت اور لیاقت کے بل پر قائم اس کے کوچنگ سینٹرز۔ طالب علموں کا مرکز بن گئے۔ اس کا نام معتبر ٹھہرا روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کا خالی پن نہ گیا۔ دنیا کا تنہا مقابلہ کرتے کرتے وہ کئی بار روئی، تڑپی، کتنی بار ہارے تو انس۔ کسی ہمدرد کو پکارا مگر پھر سنبھل گئی اچانک زندگی نے ایک اور بڑا دکھ اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ امی۔ اس کی شادی کی حسرت لیے دنیا سے ہی چلی گئیں۔ اعزاز پہلے ہی تعلیم کے حصول کے لیے آسٹریلیا جا چکا تھا۔ شباہت سے رسمی رابطہ۔ وہ جیسے دنیا میں ایک دم تنہا رہ گئی۔ انس ہر اچھے

برے وقت میں اسے فون کرتا" پھر اسے احساس ہوا" زندگی تنہا نہیں کٹ سکتی" کوئی ہمدم غمگسار ہو تو کٹھن لمحے بھی گلاب بن جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"میڈم جی۔ ایئرپورٹ آگیا ہے۔" ڈرائیور نے بہت دیر تک ملاحت میں جنبش نہیں دیکھی تو بجبوراً" اسے پکارا۔ وہ چونک کر ماضی کے سفر سے حال میں واپس چلی آئی۔ بیگ کاندھے پر لٹکایا" چشمہ بالوں پر ٹکایا اور ایئرپورٹ کے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ آدم خان نے دور جاتی بی بی کو دیکھا۔

"بی بی۔ بھی بالکل اخروٹ جیسا ہے۔ اوپر سے سخت پر اندر سے کتنا نرم۔" آدم خان کی نگاہوں میں احترام ابھر آیا۔ ملاحت نے ہمیشہ بغیر تقاضا کیے اس کی مالی امداد کی۔ وہ اپنی محسن کو دعائیں دیتے نہیں تھکتا۔

کتنے سالوں بعد دونوں بہنیں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ شباہت اس کی شاندار شخصیت دیکھ کر جھجک سی گئی۔ ملاحت بہن کی زرد صورت اور چہرے پر چھائی بے رونقی سے حیران۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ ویسے بھی اب اس کے اندر بہت ٹھہراؤ آچکا تھا۔ وقت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ شباہت سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ دوڑ کر بہن سے لپٹ کر رو دی۔ ملاحت بھی ملائی بن گئی۔ بہن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلاسا دیا۔ ماں کا رونا دیکھ کر اس کے دونوں بھانجے حیران ہوئے" پھر خود بھی رو پڑے۔ ملاحت کو ان دونوں گپلو سے بچوں پر بہت پیار آیا۔ بڑھ کر انہیں اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ ان کے گالوں کو چومتے ہوئے وہ سرشار ہو گئی۔ حسن سلمان کی نرالی کھسکتا" بہت ہی بے زار لگا۔ تو ملاحت کو احساس ہوا کہ یہ لوگ بہت لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔ اس نے فوراً" سلمان گاڑی میں رکھوانا شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"واؤ۔ بھنو خالہ۔ مزا آگیا۔ کھانا بہت مزیدار

تھا۔" شباہت نے بڑے دنوں بعد سیر ہو کر کھایا تو پروین خالہ کی تعریف کی۔ وہ سب کو قہوہ پیش کرتے ہوئے متانت سے مسکرا دیں۔ ماں کے گزر جانے کے بعد تنہا رہ جانے کے خیال سے پھر ملاحت ان کو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آئی۔ یوں دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔

"بیٹا۔ اب آئی ہو تو۔ ملائی کی شادی کر کے ہی جانا۔ بچی نے اس گھر کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اب کچھ تم لوگوں کا فرض ہے۔ ایزی میاں سے بھی بات کرو۔ اس معاملے میں مزید دیر۔ مناسب نہیں۔" شباہت کچن میں جھوٹے مگ رکھنے آئی تو۔ کچن صاف کرتی پروین خالہ نے شباہت کو چپکے چپکے سمجھایا۔ اس کو لگا کہ زخموں کے منہ کھل گئے۔ پہلی بار اپنے اوپر غصہ اور بہن پر پیار آیا۔

"میں ہی تو ہوں۔ سارے حالات کی ذمہ دار۔ یہ جس محبت کو جنون بنا کر خود پر سوار کیا۔ اس کے حصول کے بعد بھی دل خالی ہی رہا۔" شباہت کو پچھتاووں نے آگھیرا۔ اس نے بڑی بہن سے بات کرنے کی ٹھانی۔ وہ سب رات کے کھانے کے بعد بڑے کمرے میں جمع ہو کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ حسن کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھا۔

"آپا۔ میں آج آپ کے ساتھ سونا چاہ رہی ہوں۔ آپ ڈسٹرب تو نہیں ہو رہی گی؟" شباہت نے فوراً "ہی بہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر فرمائش کی۔ اس کے رویے کی اتنی تبدیلی۔ ملاحت کو ناقابل یقین سی لگتی۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ملاحت شب سے بات کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ ایک یہ وقت آیا کہ شباہت کو ڈر ہوا کہ بہن نے انکار کر دیا تو شوہر کے سامنے سبکی ہو گی۔ اسی لیے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ شاید یہ وقت ہی ہے جو اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا ہے۔

"شب۔ ڈسٹرب ہونے کا کیا سوال؟ چلو اسی بہانے مل کر ابو کی یادوں کو تازہ کریں گے۔ جانے پھر کب تمہارا پاکستان آنا ہو۔" ملاحت کے چہرے پر دکھ کے بادل چھائے تو شباہت کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

حسن نے گھوم پھر کر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ اسے ملاحت کا یہ نیا۔ شاندار سا گھر بہت پسند آیا۔ حسن تو ملاحت کی ترقی اور شخصیت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ "یہ پہلے بھی اتنی پیاری تھی کیا۔ اب اتنی خوب صورت لگنے لگی ہے۔" اس نے شیشے کے پار سے فیضان کو گدگدی کرتی ملائی کو بغور دیکھا۔ جس کے چہرے پر پھیلے اطمینان نے اس میں جاذبیت اور نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ مبہوت سا دیکھے گیا۔ وہ جس سے اب رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی۔

"اف اس لڑکی نے خود کو کتنا گروم کیا ہے۔" حسن کا تجزیہ خاصی حد تک درست تھا۔ صاف و شفاف چمک دار جلد۔ سیاہ آنکھوں کی خوب صورتی جو چشمے میں گم ہو گئی تھی۔ اب لینس لگانے کی وجہ سے ابھر آئی۔ نئے انداز سے تراشے ہوئے بال اس پر غضب کے جچ رہے تھے۔ قابلیت کا تو وہ پہلے ہی مداح تھا۔ یہ وہی ملائی ہے جسے اس نے بلاوجہ کی باتوں میں آکر ٹھکرا دیا۔ پچھتاوے کے بادل دل پر چھانے لگے۔

"اونہہ۔ مجھے کیا ملا؟ شباہت جیسی بد زبان اور ست الوجود عورت۔" حسن نے عام مردوں کی طرح بیوی کا موازنہ کیا۔

"اللہ کی پناہ۔ میں کس طرح سے سوچ رہا ہوں۔" اس نے اپنی بھٹکتی نگاہوں پر اخلاقیات کا جال پھینک کر قابو کیا۔ اور اپنی غلط سوچ پر خود کو جھڑکا اور چھوٹے بیٹے کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔ جو اسے ڈھونڈتا ہوا باہر آگیا تھا۔ وقت نے ملاحت پر اچھے اثرات مرتب کیے تو شباہت کے ساتھ اس کا الٹ ہوا۔ اس کی وہ خوب صورتی جس پر وہ ناز کرتی تھی جیسے کسی نے نچوڑ لی ہو۔ زردی مائل پتلا سا چہرہ جس کی شادابی کہیں کھو گئی تھی۔ گھنے بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے۔ جسے وہ باقاعدگی سے ڈائی کرنے لگی تھی۔ باہر کی تیز رفتار زندگی نے شاید اسے وقت سے

پہلے تھکا دیا۔ ویسے بھی اسے تو شروع سے ہی خدمت کروانے کی عادت تھی۔ اب وہاں جو سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرنے پڑے تو مہینوں میں ہی عشق ہوا ہو گیا۔ سرد ملک، مشینی لوگ اور مشینی سی زندگی، وہ پہلے تو بہت ہی گھبرائی۔ کس سے شکوہ کرتی، اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ خود ہی بھگتنا پڑے گا۔ اس کے سارے خواب ادھورے رہ گئے۔

"دور کے ڈھول سہانے۔" اس بات پر شباہت کو آسٹریلیا پہنچ کر یقین آیا۔ اس کی آنکھوں میں حسن کے ساتھ زندگی گزارنے کے جو سپنے سجے، وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ لوگ جو اپنے ملک میں غربت کے باوجود عیاشی سے رہتے تھے۔ بیرون ملک جا کر انہیں ڈالرز دانتوں سے پکڑنا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا۔ جس سے وہ نا آشنا تھی۔ حسن ایک اچھی جاب پر ہونے کے باوجود پریشان رہتا۔ اسے ماں کو گھر خرچے کے پیسے بھیجنے پڑتے تھے۔ آئے دن بہنوں کے فرمائشی پروگرام یا دباؤ سے بھی انہیں اپنی بہت سی ضرورتوں کا گلا گھونٹنا پڑتا۔ ان حالات میں سپنوں کے تعمیر شدہ سارے محلات دھڑ دھڑ کر کے زمیں بوس ہو گئے۔

شکوہ کرتی بھی تو کس سے؟ اپنے پیروں پر تو آپ کلہاڑی مار بیٹھی تھی۔ اب اسے اپنا پیارا وطن، گلی محلہ، گھر سبھی اپنے، یہاں تک کہ اپیا کی یاد بھی شدت سے آنے لگی تھی۔ دل بھر آتا تو رونے بیٹھ جاتی۔ حسن مقدور بھر کمپنی دینے کی کوشش کرتا، پر اس کی جاب بہت ٹف تھی۔ سو لوگ گھومنے پھرنے کے لیے بھی ویک اینڈ کا انتظار کرتے۔ کبھی کبھی تو تنہائی سے بیزار ہو جاتی۔

یہ وہ من تھا جسے پانے کے لیے اس نے کتنے دل توڑے۔ پر خوشی کہاں تھی؟ وہ اکثر خود سے سوال کر بیٹھتی۔ اسے لگتا کہ وہ پیاسی روح بن کر ریگستانوں میں بھٹک رہی ہو۔ کام کاج میں بھی دل نہیں لگتا۔ حسن بھی اکثر چڑنے لگا۔ کب تک اس کی ناز برداریاں اٹھاتا۔ چھ مہینے میں ہی ایک دوسرے سے بیزار نظر آنے لگے۔ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔

ہر وقت کی چخ چخ اور فرسٹریشن کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی کہ اچانک ماں بننے کی نوید سنائی دی۔ دونوں بہت خوش ہوئے، پر ایک اور مشکل دور شروع ہو گیا۔

فیضان کے ایک سال بعد ہی ذیشان بھی آ گیا۔ تو وہ ان کے کاموں میں الجھ کر رہ گئی۔

بڑھتے ہوئے اخراجات اور مہنگائی نے سب کو متاثر کیا۔ حسن بھی پریشان رہنے لگا۔ اچانک ہی پاکستان سے آمنہ خالہ کی وفات کی خبر آئی۔ حالات ایسے نہ تھے کہ وہ سب جاتے۔ حسن خود ہی ایک مہینہ وہاں رہ کر پاکستان میں اپنی جائیداد بیچ کر بہنوں کو ان کا حق دے دلا کر واپس آیا۔ اپنے حصے کے پیسوں سے اس نے میلبورن میں الیکٹرونکس سامان کی شاپ کھول لی۔ سارا سرمایہ شاپ پر لگانے کے بعد وہ دونوں خالی ہاتھ رہ گئے۔ ایک اور کٹھن دور شروع ہوا۔ نیا نیا بزنس شروع کیا تھا۔ بڑی جان ماری کرنی پڑتی تھی۔ دکان کے لیے سیلز مین افورڈ کرنا مشکل تھا۔ حسن کو ڈیلیوری دینے آؤٹ ڈور جانا پڑتا۔ مجبوراً اسٹور کی دیکھ بھال کے لیے اسے ہی شوہر کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا پڑا۔

اب زندگی کی مشقتیں بڑھ گئیں۔ سارا دن شاپ کا کام سنبھالتی۔ گھر آ کر بچوں کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ شوگر کا مرض ہو گیا۔ وزن کم ہونے لگا تو سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ پیلی رنگت، اب تو حسن بھی اس کی روتی صورت سے چڑنے لگا۔

"یہاں کی زیادہ تر عورتیں کام کرتی ہیں اور خوش خرم بھی رہتی ہیں۔ ایک تم ہی انوکھی ہو جو ہر وقت منہ بسورے پڑی رہتی ہو۔"

"کبھی اپنا حلیہ دیکھا ہے۔ عجیب اجڑی سی صورت بنی رہتی ہو۔" حسن اکثر اسے سخت سست سناتا۔ پر وہ

خاموش رہتی۔ جب دل ہی مردہ ہوگیا ہو تو پھر کچھ کرنے کا دل نہیں چاہتا۔ وہ شباہت تو کہیں گم ہو گئی۔ جو ہر وقت نک سک سے درست رہتی۔ وہ جسے اپنے حسن پر ناز تھا۔ جو سمجھتی تھی کہ ساری دنیا اس کے پیروں تلے ہے۔ پر جب آنکھ کھلی تو حقیقت پتا چلی۔ وہ تو خسارے میں رہی۔ قسمت سے لڑ کر اس نے وہ سب چھیننا چاہا۔ جو اس کا مقدر نہ تھا۔ کاروبار کچھ سیٹ ہوا اور انہوں نے ایک جاننے والا سیلز مین رکھ لیا تو وہ لوگ بچوں کی چھٹیوں پر یہاں آ گئے۔

"آج ہم دونوں بہنوں کا ساتھ سونے کا پروگرام ہے۔ پلیز حسن! آپ ذیشان اور فیضان کو اپنے ساتھ سلا لیں۔ ہماری باتوں سے یہ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔" شباہت نے شوہر کا بازو تھام کر کہا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بچوں کی انگلی تھامے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"آپا پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی تھی کہ انس کو آپ نے میرے لیے پسند کیا تھا۔ مگر میری خود غرضی مجھے لے ڈوبی۔ میں جو اس وقت نفس کی غلام بنی ہوئی تھی۔ حسن سے یہ بات چھپا گئی۔ اگر ان کو حقیقت پتا دیتی تو پھر وہ کبھی بھی مجھ سے شادی نہ کرتے۔" شباہت بہن کا ہاتھ پکڑ کر رو دی۔ ملاحت ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی جیسے بہن کو پانی پلایا۔

یہ حقیقت جان کر اسے دکھ تو ہوا۔ پر اتنے سال گزرنے کے بعد ان باتوں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حسن اس کا بہنوئی تھا۔ اس کی چھوٹی بہن کا شوہر، ملاحت کی زندگی میں اس کی بس اتنی ہی حیثیت تھی۔

"شب تمہیں انس والی بات کیسے پتا چلی؟ یہ بات تو صرف میرے اور امی کے بیچ میں تھی۔" اسے ایک دم خیال آیا تو سوال کیا۔

"جب آپ انس کو گھر لائی تھیں۔ اس کے دوسرے دن ہی امی نے مجھے چھیڑتے ہوئے یہ بات بتا دی اور وعدہ لیا کہ میں کسی سے اس بات کا ذکر نہ کروں میں تو خوش ہو گئی مگر امی کو اس بات کی ہوا بھی لگ جاتی تو وہ میرا ہاتھ فوراً" ہی اسے تھما دیتیں۔ یوں حسن کے سامنے بھی میں انجان بنی رہی۔ میں نے اپنی بہن کے ساتھ دغا بازی کی جس کا صلہ مجھے یہ ملا کہ امی اور تم سب سے دور وہاں اکیلے تڑپتی رہی۔ تم خوش قسمت تھیں جو امی کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کی خدمت کر کے تم نے جنت کمائی۔ میں بدقسمت اولاد ٹھہری۔ جو ماں کے آخری دیدار سے بھی محروم ہو گئی۔ کسی کے لیے اس سے بڑی سزا بھلا کیا ہو سکتی ہے؟" شباہت نے اپنے دل کے زخم بہن کے سامنے ادھیڑ کے رکھ دیے۔ ملاحت کو بھی بہن کی حالت پر ترس آیا۔ دونوں بہنیں ماں باپ کو یاد کر کے گلے مل کر خوب روئیں۔ شاید دونوں کو یوں ساتھ دیکھ کر ان کی روح بھی پرسکون ہو گئی ہوگی۔

☼ ☼ ☼

"آپا۔ یہ گیٹ۔ کس لیے بھئی؟" انا نے مسکراتے ہوئے ٹیبل پر بلیک فاریسٹ کیک کا ڈبہ رکھا۔ ملاحت نے کام چھوڑ کر حیرانی سے پوچھا۔ شباہت کی دھونس اور دھمکی کی وجہ سے وہ پورے دس دن بعد اسکول جوائن کر سکی تو کاموں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ سچ کرنے کی بھی فرصت نہ ملی۔ اب مزیدار کیک دیکھ کر اس کی بھوک جیسے مچل گئی۔

"میم۔ آپی کی بات طے ہونے کی خوشی میں امی نے خاص طور پر یہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔" انا کی چھوٹی بہن ثنا بھی ساتھ آئی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ انا کے چہرے پر بھی شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واؤ بھئی۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے شادی کب ہے؟" ملاحت نے کیک کا وہ سلائس کانٹے سے کھاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا، جو ثنا نے بڑے سلیقے سے کاٹ کر اسے پیش کیا تھا۔

"اگلے مہینے، اسی لیے میں ریزائن کرنا چاہ رہی تھی۔" انا نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

"ہوں۔ کوئی ایشو نہیں۔ تم ریزائن جمع کروا دینا۔ میں قریشی صاحب سے بات کر لوں گی۔ ہاں کل

اپنے بھائی کو بھی بھیج دینا۔ میں نے اس کی جاب کے سلسلے میں قریشی صاحب کو بتا دیا تھا۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" ملاحت نے کیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے تاکید کی۔ رسمی بات چیت کے بعد دونوں بہنوں نے شکریہ ادا کرکے جانے کی اجازت مانگی۔ تو اس نے سر ہلا دیا۔ ابھی اسے کافی سارے کام کرنے تھے۔ ملاحت نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا۔

"ثنا' ایزی کے ساتھ چلتی' کتنی اچھی لگے گی۔" دبلی پتلی سرو قد ثنا بسمن کی کسی بات پر مسکراتی ہوئی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دم سے جھماکا ہوا۔ چند دنوں بعد اعزاز کی بھی وطن واپسی تھی۔ اس کے دونوں بھائی' بسمن پاکستان میں موجود ہیں۔ ان یادگار لمحوں کو کیوں نہ خوشیوں بھری گھڑی میں بدل دیا جائے۔

"شباہت کی موجودگی میں ہی ایزی کی شادی کا پلان۔۔۔ مزہ آجائے گا۔" اس نے آنکھیں بند کرکے سوچا اور خوش ہو کر سیل فون پر شباہت کا نمبر ملانے لگی۔ تاکہ شام کو ان کے گھر جاکر اسے ثنا سے ملوا سکے۔ ملاحت کو یقین تھا کہ ان کی امی اس کے ہیئل اور ہینڈسم بھائی کو انکار نہیں کریں گی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی سے اتر کر وہ آہستہ روش پر چلنے لگی۔ ہرے بھرے پارک میں داخل ہوتے ہی تازگی کے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ موسم بہار نے ماحول کو قدرتی رنگوں سے سجا دیا تھا۔ فطرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ ہر گوشے نے جیسے ہریالی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ملاحت کو شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے بلیک شوز اتارے اور زمین پر بچھی سبزے کی چادر پر ننگے پاؤں چلنے لگی۔ گیلی گھاس نے تلووں پر گدگدی کیا کی۔ ایک تسکین آمیز راحت نے اس کی روح تک کو مسرور کر دیا۔ چہرے پر انوکھی سی خوشی دوڑ گئی۔ جب دل خوش ہو تو سارے منظر آنکھوں کو بھاتے ہیں۔ سو وہ بھی آج کل بہت خوش تھی۔

انس بھی اچانک کہیں سے نکل کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ملاحت نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی جینز کا پائنچہ موڑے۔ ننگے پاؤں ہری ہری گھاس پر چل رہا تھا۔ خوشبودار پھولوں' پودوں اور لہلہاتے درختوں کو دیکھتے ہوئے دونوں مسکرا دیے۔ دونوں شوق سے سبزے پر قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ ملاحت نے اس کے ہاتھ میں جوتے دیکھے تو ہنس دی۔

گزرے ماہ و سالوں میں۔۔۔ انس کی وجاہت میں اضافہ ہوا تھا' جسم پہلے سے بھر گیا تھا۔ اسکائی بلیو شرٹ اور بلیک جینز پہنے' آنکھوں پر سن گلاسز لگائے۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھوں کا اضافہ۔۔۔ شخصیت پر وقار لگ رہی تھی۔ انس کے نزدیک آنے پر اس کی مخصوص خوشبو ملاحت کی ناک سے کیا ٹکرائی۔ وہ ملاحت سے تو عمر بلائی میں ڈھل گئی۔ دل ایک بار نہیں کئی بار دھڑکا۔

انس کی پیاسی نگاہیں ملاحت کو دیکھنے لگیں۔ بلیو جینز پر پنک کرتے گلے میں بلیو اسکارف۔۔۔ کھلے بالوں کا جوڑا بنائے' کانوں میں سونے کے ٹاپس' لائنر لگی سنہری چمکتی آنکھیں۔ شفاف لپ جیل نے ہونٹوں کو مزید دل آویزی بخشتے ہوئے جیسے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بالوں پر اسٹائلش سن گلاسز لگائے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت اسٹائلش لگی۔ انس کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ ملاحت مسکرائی۔

دونوں پارک میں نصب۔۔۔ سنگ مرمر کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ان کی خاموشی بھی محسوس کی جانے والی تھی۔ آخر انس نے اس خاموشی کو توڑا۔

"ملاحت۔۔۔ تم جانتی ہو کہ آج میں نے تمہیں فون کرکے خاص طور پر یہاں ملنے کے لیے کیوں بلایا ہے۔" یہ وہ سوال تھا جس کا جواب دونوں کو آتا تھا۔ پھر بھی ملاحت نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تم مجھے جانتی ہو۔ میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔ امی آج کل بہت بیمار رہنے لگی ہیں۔" وہ دکھی ہو کر بولا۔ تو اسے بھی افسوس ہوا۔

"وہ اپنی زندگی میں مجھے آباد دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے شادی کے لیے دوبارہ مجبور کرنا شروع کر دیا۔" اس کے چوڑے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا۔

"ہاں۔ تو اس میں برائی کیا ہے؟ نیک کام میں کیسی دیر۔" ملاحت نے مسکرا کر چھیڑا۔ تو وہ جل بھن گیا۔

"پلیز ملاحت پلیز۔ اب میری محبت اور صبر کو مزید مت آزماؤ۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔"

"مگر اب تو میں۔ ایزی کی شادی کرنے جا رہی ہوں۔ ایسے میں اپنی شادی کا سوچتی کیسی لگوں گی؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"بات سنو۔ تم نے اپنے اوپر بزرگی کا جو خول چڑھا



لیا ہے پلیز اسے اتار پھینکو۔ اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی ہو جتنا بنتی ہو؟" انس بری طرح سے چڑ گیا۔ تو ایک دلکش سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جھانکنے لگی۔ کبھی کسی کا حق جتانا۔ ہم سے ہمارے لیے ہی لڑنا۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔ ملاحت کے محسوسات کچھ ایسے ہی ہو گئے۔

"اچھا۔ دیکھو میرے دونوں چھوٹے بھائی بہن کی اس معاملے میں کیا رائے ہوتی ہے۔" وہ نیم رضامند دکھائی دی تو انس کی باچھیں کھل گئیں۔

"ایزی کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ان فیکٹ اسی کی یقین دہانی پر۔ میں نے پاکستان کا ٹکٹ کٹوا لیا ہے۔" انس کا انداز شرارتی ہو چلا۔

"کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں؟" ملاحت نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جو بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

"ایان نے مجھے کال کی تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس لوٹ رہا ہے۔ اور سب سے پہلے تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ بقول اس کے۔ تمہاری زندگی ان لوگوں کے لیے قربانیاں دیتے گزری ہے۔ اس لیے تمہیں بھی خوشگوار طریقے سے جینے کا حق ملنا چاہیے۔" انس نے ملاحت تک بھائی کے جذبات پہنچائے تو اس کی آنکھ بھر آئی۔

"ویسے ملاحت۔ ایک راز کی بات بتاؤں۔ اعزاز تو بہت غصے میں تھا۔ کہہ رہا تھا کہ فون پر تم سے شادی کے لیے بول بول کر تھک چکا ہے۔ اب پاکستان آکر تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈولی میں ڈال کر میرے ساتھ رخصت کروے گا۔" اس نے اعزاز کی باتوں میں مطلب کی آمیزش کی تو ملاحت نے اسے گھور کر دیکھا۔ انس کا قہقہہ اتنا بلند ہوا تو جوگنگ کرنے والے ایک جوڑے نے مسکرا ان دونوں کو نوٹس کیا۔

"پلیز تم اپنی اس جناتی ہنسی پر قابو رکھو یہ پبلک پارک ہے کیوں تماشا بنا رہے ہو اور میرے بھائی کی باتوں کا مطلب اپنے حساب سے تبدیل کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔" ملاحت لوگوں کو دیکھ کر شرمندہ سی ہوئی۔ وہ پیار سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا حق جتاتا انداز۔ کتنا بھلا لگ رہا تھا۔

"جی۔ اس نے ایسے ہی کہا تھا یقین نہیں آیا تو کال ملاؤں؟ ویسے بھی وہ سوچتا ہو گا اپنی بیوی کے لیے راستے کے خار چن دے۔" وہ مکمل طور پر شرارت پر آمادہ اسے مسلسل چھیڑے جا رہا تھا۔

"اچھا۔ خیر آگے کی سنو۔ سالی صاحب سے تو ریڈی میڈ مانگ چکا ہوں۔ جب ہی تو اس نے تمہیں اتنا سجا سنوار کر یہاں بھیجا ہے۔" انس بالا ہی بالا سب کچھ طے کر کے آیا تھا۔ جب ہی تو۔ شباہت نے کرید کرید کر انس کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ فون نمبر تک مانگ لیا تھا اور اس سے ملنے پر مجبور بھی کیا۔

"تم۔ بڑی کمال کی چیز ہو۔ سب کو اپنی طرف کر لیا۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے بچا ہی کیا ہے؟" ملاحت نے تھک کر ہار مان لی۔ تو وہ تو لب بجالایا۔

"جی۔ جناب۔ پھر مانتی ہو نا مجھے۔ شبانہ نے شباہت اور حسن بھائی سے تمہاری غیر موجودگی میں ملاقات کی اور بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے پر تیار ہوئے کیونکہ تمہاری بہن اور بھائی شادی کے معاملے میں تم سے بات کرنے میں جھجک رہے تھے۔

یوں جانو اب سارے وارث میری طرف ہو چکے ہیں۔ باقی فکریں میرے لیے چھوڑ کر۔ بس۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ گاجے باجے کے ساتھ لینے آؤں گا ڈولی میں بٹھا کر۔ اوہو۔ غلط بول دیا۔ ہوائی جہاز میں بٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔" انس گنگنایا۔ کافی دیر ہو چکی تھی دونوں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ملاحت نے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے سر اٹھا کر تازہ ہوا۔ اپنے اندر اتاری۔ رنج والم کی یہ ان دیکھی زنجیریں جیسے کٹ گئیں۔ ان کے دل ایک ہی لے پر آزادی کے گیت گنگنانے لگے۔ سب کچھ ایک دم انوکھا سا لگنے لگا۔ ملاحت نے سرخ ہوتے افق کو دیکھا۔ انس کو بھی اشارہ کیا۔ وہ دونوں مبہوت ہو کر فطرت کے نظاروں میں گم ہو گئے۔ سورج ڈوبنے کی تیاریوں میں مصروف۔ سرخ گولا بنا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ بغیر چھوئے محسوس کیا۔ دکھ بھرے دن طویل سہی گزر ہی جاتے ہیں۔ ہجر کا سورج بھی ڈوبنے کو تھا ملن کا چاند جو چمکنے والا تھا۔

☼

حنا یاسمین

بارش کے بعد

سوں سوں کرتی آواز کے ساتھ اس نے کوئی تیسری دفعہ سسکی بھری تھی۔

"لو تسولس بیٹا! مریض کے پاس بیٹھ کر رونا بدشگونی ہوتی ہے۔" گلزار پھپھو نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے تنبیہ کی۔

"کیا کروں پھپھو! امی کی طبیعت ہے کہ بگڑتی ہی جارہی ہے۔"

"بس بیٹا! پتا نہیں کس بدفطرت کی نظر کھا گئی تمنہ کو۔" پھپھو نے سارے جہاں کی افسردگی لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔

"زین نہیں آیا ابھی کیا؟"

"پھپھو! اس کے ایگزامز ہونے والے ہیں، اکیڈمی جاتا ہے اس لیے لیٹ ہوجاتا ہے۔" وہ ٹیبل سے کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔

پھپھو نے اطمینان سے دونوں ٹانگیں پلنگ پر رکھ کر کمرے کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کردیا۔

"بیٹا! یہ دیواریں دیکھو کتنی میلی میلی سی ہو رہی ہیں۔ ذرا یہ صاف کرلیا کرو۔"

اس نے گھبرا کر دیواروں کو دیکھا۔ اسے پتا تھا کہ آج پھپھو نے آنا ہے اسی لیے صبح سے گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ امی کی تیمارداری کے علاوہ صفائی، کھانا پکانا، اضافی کاموں کا بوجھ۔ پھر بھی پھپھو کو موقع مل گیا۔

"پھپھو! چائے بناؤں۔" وہ نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ بناؤں۔ میری تو کمر میں بھی درد ہو رہا ہے۔" پھپھو گول تکیہ کمر کے پیچھے رکھ کر لیٹتے ہوئے بولیں۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں آگئی۔ پتی کا ڈبا کھولا تو وہ خالی تھا۔

"اوفو! پھپھو کے ہاتھ ایک اور ایشو لگ جائے گا۔ زین بھی پتا نہیں کب آئے گا۔ اکیڈمی سے سیدھا دوستوں کی طرف نکل جاتا ہے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

شکر ہے، پھپھو امی کے کمرے میں تھیں۔ وہ چپکے چپکے سے کچن والی سیڑھی لے کر دبے قدموں باہر اپنے پچھواڑے کے صحن میں آئی۔ ساتھ والوں کی دیوار کے ساتھ لگا کر کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر دیوار کے اوپر سے دیکھنے کے قابل ہوئی۔

"اوئے عفان۔ کیا کررہے ہو؟" کرسی پر بیٹھے عفان کو دزے مارتے دیکھ کر وہ بولی۔

"تم کسی دن اپنی ٹانگ تڑواؤں گی۔" وہ دانت کچکچا کر بولا۔

"اور تم میرے ہاتھوں اپنی پکوڑے جیسی ناک مزید سجاؤ گے۔ یہیں سے وہ پھینکوں گی۔ سیدھی طرح ادھر آکر بات سنو۔"

"امی کو بلاتا ہوں —— وہی اچھی طرح بات سمجھیں گی۔ روز ہی بندریا کی طرح دیوار پر چڑھ جاتی ہو انٹرنیشنل فقیرنی! کوئی چیز ہی مانگنے آئی ہوگی۔"

"تم بولتے ہوئے کالے حبشی لگتے ہو۔ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میرے جیسی نازک اور کمزور دل لڑکی کو اونچی آواز سے نہ ڈرایا کرو۔ مانگنی تو میں نے پتی تھی مگر تم نے کمینگی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"اور تم نے ڈھیٹ پن کے۔ جو مرضی کہہ لو۔ پتی

لیے بغیر تو تم شکل بھی نہ گم کروگی۔"

"میرے ناپا کا گھر ہے تی لوں یا چنگی۔"

"اچھا! اس سے پہلے کہ میں مزید تمہیں برداشت کروں۔ تپی لا ہی دیتا ہوں۔" وہ اس کے تپے تپے انداز سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔

جبکہ وہ ــــــ وہاں پر تھی تھی پیچھے مڑ کر بار بار دیکھ رہی تھی کہ مبادا پھپھو نہ آجائیں۔ پھپھو تو نہ آئیں۔ مگر سائی کے مخصوص اسٹائل پر کھنکھنو ڈالے سے طریقے سے اچھلتا کودتا زین ضرور گیٹ سے اندر آگیا تھا۔

"کیا ہوا زین! ٹیسٹ تو ٹھیک ہوا ہے نا۔" وہ وہیں سے اونچی آواز میں بولی۔

"دیکھو آپا! میرے فزکس کے ٹیسٹ میں پورے مارکس۔" وہ دوبارہ سائی بن گیا۔ وہ سیڑھیوں سے پیچھا تے آئی۔

"یہاں اوپر سے ایک موٹا تازہ نظر آئے گا اس



کے ہاتھ سے پتی لے کر کچن میں مجھے لا دینا۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔

"پہلے ٹیسٹ پر تو مبارک باد دے دیں۔" وہ اس کے نوٹس نہ لینے پر بڑبڑاتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔

"تب مبارک باد دوں گی۔ جب سالانہ میں اچھے نمبرز آئیں گے۔" وہ پیار سے اس کا کان کھینچ کر بولی۔

"اوہ اب اس بچارے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔" عفان نے ہاتھ میں پکڑا پتی کا ڈبا نیچے کی طرف لٹکاتے دیوار سے گردن نکالتے ہوئے کہا۔

"عفان بھائی! میرے ٹیسٹ میں فل مارکس آئے ہیں۔ ان شاء اللہ ایف ایس سی میں آپ کو بھی کاٹ دوں گا۔"

"ضرور ضرور یار! اللہ تمہیں مزید کامیاب کرے۔" عفان نے بغیر کسی حسد کے انتہائی محبت سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جبکہ وہ سوچ رہی تھی کہ عفان اور سمیرا آپی کی شخصیت میں کتنا اپنا پن اور اعلیٰ ظرفی جھلکتی ہے۔

✿ ✿ ✿

وہ اور زین دو ہی بہن بھائی تھے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد امی کی اچانک بگڑتی طبیعت کے پیش نظر اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر گھرداری سنبھال لی۔

ابو شام کو لوٹتے تو امی کو مختلف ڈاکٹرز کے پاس لیے پھرتے۔ طرح طرح کے ٹیسٹ کرواتے۔ پھر بھی امی کی بیماری ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

رشتوں کے نام پر ایک تایا اور ایک پھپھو تھیں۔

تایا کے گھر کی دیوار سانجھی ہونے کے باوجود رشتوں میں اتنی بڑی خلیج تھی کہ برسوں کی ناراضی ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ بڑے تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ صرف بچے ایک دوسرے سے اپنے ماں باپ سے چھپ کر مل جل لیتے۔ البتہ پھپھو گلزار کی تو وہ دل سے قدرداں تھی۔ کم از کم انہیں اس کے اماں ابا کا خیال تھا۔

پھپھو کی زبانی ہی اسے بڑوں کی ناراضی کی وجہ معلوم ہوئی تھی۔ امی اور تائی امی سگی بہنیں تھیں۔ مطلب تائی امی اس کی خالہ بھی تھیں۔ ابو کی نسبت پہلے تائی امی سے طے تھی لیکن انہوں نے اپنی بچپن کی طے کی ہوئی نسبت توڑ کر امی کو پسند کرکے شادی کرلی۔ پھر تایا ابا سے تائی امی کی شادی کردی گئی۔ تائی امی اور باقی دونوں ماموؤں کو امی سے نفرت ہوگئی۔ البتہ پھپھو کا رویہ ٹھیک ہی تھا۔ جائیداد کے جھگڑے نے اور کچھ تائی اماں کی تعصب پرست شخصیت نے دونوں گھروں میں دراڑیں ڈال دیں۔ بات اتنی بڑھی کہ نوبت قطع تعلق تک آگئی۔

وہ اور زین رشتوں کی کمی کے باوجود خوش رہ لیتے اگر امی ٹھیک رہتیں۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کی مسلسل نہ سمجھ میں آنے والی بیماری نے دونوں بہن بھائی کو آزردہ اور ملول سا کر دیا تھا۔ ابو کے حوصلے بھی پست ہونے لگے تھے۔ بس ہر دوسرے دن پھپھو گلزار رکی ہوئی ہوا میں آکسیجن بھرنے آجاتیں تو سانسیں پھر سے رواں دواں ہو جاتیں۔

وہ انہیں ماں کے ٹھیک ہونے کے دلاسے دیتی رہتیں۔ کبھی زین کی یونیفارم دھو دی۔ تو کبھی علیزہ کے سر میں تیل ڈال دیا۔ بس اتنی سی محبت پر ہی وہ دونوں بہن بھائی خوش ہو جاتے۔

✿ ✿ ✿

آج چھٹی تھی۔ وہ صبح فجر کی اذانوں پر ہی اٹھ گئی۔ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے اس نے اسی وقت مشین لگا کر سارے کپڑے دھوئے۔ امی کے کپڑے تبدیل کروا کر انہیں وضو کروایا۔ اور کچن میں آٹا گوندھنے چلی گئی۔

زین اور ابو کے اٹھنے سے پہلے پہلے وہ صفائی اور دھلائی سے فارغ ہو چکی تھی۔ ساتھ والے گھر کے ٹیرس پر بیٹھا عفان جو بی۔ اے کے فائنل کی تیاری میں مشغول تھا۔ آج کے دور میں اس لمبی سی چٹیا والی لڑکی کو اتنی پھرتی سے کام کرتے دیکھ کر حیرت زدہ ہی ہوئے جا رہا تھا۔ اس نے سیڑھی لگا کر دیوار سے گردن

نکل کر جھانکا۔

"ارے نان عفان۔ تم!" وہ اسے چھیڑنے کے لیے ہمیشہ نان عفان کہتی تھی۔

"میں نے تمہیں آج پہلی دفعہ اتنا مصروف دیکھا ہے۔ تم کتنے کام کرلیتی ہو؟"

"پہلی بات تو یہ کہ میں روز ہی اتنی مصروف ہوتی ہوں۔ اور میں جتنے بھی کام کروں تم سے مطلب؟" وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"دراصل میں کچھ دن سے ہماری کام والی نہیں آرہی۔ اسی لیے ہمیں بھی برتن دھونے والی اور صفائی کرنے والی چاہیے۔" بڑی مہارت سے مسکراہٹ چھپاتے کہا گیا۔

"میری امی اور تمہاری خالہ۔ پس چچی کافی عرصے سے بیمار ہیں اور میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ جسے سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ تم لوگوں سے اتنا تو ہو نہ سکا کہ آکر پتا ہی کرلو۔ آگئے ہو طنز کرنے۔" بلاوجہ ہی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"او نہیں یار! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ خالہ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہے۔ میں ضمیرا آپی سے کہوں گا کہ پتا کریں۔"

"تم لوگوں کا ہمارے ہاں اور ہمارا تم لوگوں کے ہاں داخلہ بند ہے۔" اس نے تماس انداز میں جتایا جیسے وہ اس بات کو بھول رہا ہو۔ وہ سر جھٹک کر مسکرادیا۔

"بیٹی! مجھے تمہارا یوں یہ عفان اور ضمیرا سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں، تمہاری ماں کو پتا چل گیا تو غصہ کرے گی۔" پھپھو نے ڈبے سے گاجر کا مربہ نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھپھو! امی کو پتا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا! پتا نہیں کس طرح اجازت دے دی۔" پھپھو کی بات اسے کچھ بری تو لگی مگر کیا کہہ سکتی تھی۔ وہ امی کی مالش کرنے کے لیے تیل لینے باہر چلی گئی۔

"ارے آمنہ! تمہیں پتا ہے کہ علیو! عفان اور ضمیرا میں بات چیت ہوتی ہے؟" پھپھو امی سے یوں مخاطب تھیں جیسے کوئی بڑا راز افشا کر رہی ہوں۔

"ہاں! میں نے خود ہی اجازت دی ہے۔ بڑوں کے جھگڑوں میں بھلا بچوں کا کیا قصور؟ سارا دن میرے ساتھ گھلی رہتی ہے۔ میری تو تکلیف ایسی ہے کہ نہ زیادہ بولنے کو دل کرتا ہے اور نہ ہی کچھ کھانے کو۔" ابھی وہ اتنا ہی بول پائی تھیں کہ ان کی سانس پھولنے لگی۔

"امی! یہ پانی پئیں۔" عفیرا نے دو گھونٹ پانی ان کے حلق سے اتارا۔

"بیٹا! گرمی لگ رہی ہے۔ یہ چادر میرے اوپر سے ہٹادو۔" مارچ کے معتدل درجہ حرارت میں بھی ان کو جون کی گرمی گھیرے ہوئے تھی۔

"ہائے۔ ہائے۔ میری ٹانگیں۔" اچانک ان کی ٹانگوں میں درد شروع ہوجاتا۔ وہ جھٹ سے ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔ گلزار پھپھو بھی ان کی ٹانگیں دبانے لگیں۔

"پتا نہیں میری بھابھی کو کیا ہوتا جارہا ہے۔" ایک بے بسی سی فکر چہرے پر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

علیو! کی آنکھیں تو بن بادل کے برسات کی طرح منٹ منٹ بعد ہی بھر آتیں۔ چپ چاپ ہوگئے تھے امی کو یوں بستر سے لگے۔

"بیٹی! ہمت سے کام لو۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔" پھپھو کے دلاسے لے اندھیرے میں جگنو کی طرح لگتے۔

"جاؤ تم جاکے کھانے کا انتظام کرو۔ زین آنے ہی والا ہوگا میں آمنہ کے پاس بیٹھی ہوں۔"

وہ تشکر سے پھپھو کو دیکھتی ہوئی کچن میں آگئی۔ کریلے چھیل کر نمک لگا کے وہ دھوپ میں رکھنے آئی ہی تھی کہ ضمیرا آپی کی آواز سن کر جھٹ سیڑھی لگا کر چڑھ گئی۔

"کیسی ہو علیو! خالہ کیسی ہیں؟" ضمیرا ابھی اس پر نظر پڑتے ہی خوش ہو کر بولیں۔

"امی کی طبیعت بس سمجھ سے باہر ہے۔" وہ مایوس کن انداز میں بولی۔

"مولڑکی! مایوسی کفر ہے۔ تمہارے جیسی چڑیل کو تو

بہادر ہونا چاہیے۔ زندگی اگر تکلیفوں کی اسپیڈ بڑھاتی ہے تو ان کو ختم کرنے کا بریکر بھی فراہم کرتی ہے۔" وہ لاؤنج سے نکل کر سیدھا لان کے بغلی حصے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

"ہاں عفیرا! عفان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم مضبوط رہو۔ بلکہ ہوسکے تو پڑھائی کا سلسلہ بھی دوبارہ شروع کرلو۔ ویسے خالہ کو میری طرف سے پوچھنا۔ میں امی سے بات کروں گی کہ خالہ کی خیریت لیں۔ ورنہ میں خود ہی آنے کی کوشش کروں گی۔"

وہ یہ بھی نہ کہتیں تو تب بھی عفیرا کو ان دونوں بہن بھائیوں کے خلوص کا اندازا تھا۔ وہ دونوں تائی اماں کا الٹ تھے۔ جتنا وہ ان لوگوں سے نفرت کرتی آتی ان کے بچے محبت جتاتے۔

سعید ماموں اور معین ماموں اور ان کے بچوں کی خبریں ضمیرا آپی کے ذریعے اس تک پہنچتیں۔ ورنہ تائی اماں نے پتا نہیں کیا سمجھ ہوتا تھا کہ انہوں نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی۔ وہ اور زین بھی انہیں خالہ کہتے تو کبھی تائی اماں۔

☼ ☼ ☼

زین کے پیپرز شروع ہوگئے تھے۔ ابا بھی آج کل لکڑی کے کاروبار کی وجہ سے کبھی فیصل آباد کبھی اوکاڑہ تو کبھی کہاں ہوتے۔ انہیں پیوقت کے ساتھ ساتھ عفیرا کی بھی فکر ستاتی۔ پر مجبوری کاروبار کی۔ امی کی طبیعت تو پل میں تولہ پل میں ماشہ والی تھی۔

آج بھی ابا کا فیصل آباد کا کانٹریکٹ تھا۔ مغرب کے وقت سے ہی بادل امڈ آئے تھے۔ اس نے زین کو فون کرکے جلدی گھر آنے کا کہا تھا۔ گلزار پھپھو کا بھی کافی دن سے کوئی چکر نہ لگ رہا تھا۔ وہ نماز کی نیت باندھنے ابھی کھڑی ہی ہوئی تھی کہ ماں کی کراہ اور چیخ پر الٹے پاؤں بھاگی۔ امی دہری ہوتی ہوئی بستر سے نیچے تھیں۔ اس کی اپنی بھی چیخیں نکل گئیں۔ باہر کن من شروع ہوگئی تھی۔ اندر اس کا دل لرز رہا تھا۔ امی کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا جیسے لہو ٹپک رہا ہو۔

"امی! کیا ہوگیا ہے آپ کو۔" وہ روئے جارہی تھی۔ اتنے میں زین آگیا۔ زین ماں کی حالت دیکھ کر رکشا لینے دوڑا۔ جبکہ وہ ہاتھ پاؤں سہلانے لگی۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا اور باہر کن من بوندوں نے موسلادھار بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ زین ابھی تک رکشا لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ ماں کو تسلی دے کر تیز بوندوں کی پروا کیے بغیر تائی اماں کے گھر بھاگی۔

گیٹ تایا ابو نے کھولا تھا۔ ضمیرا آپی نے لاؤنج کی کھڑکی سے اسے دیکھا۔ اس نے روتے ہوئے تایا ابو کو امی کی حالت بتائی تھی۔ ان کی سرد مہری جوں کی توں قائم تھی۔

"میں تو ابھی دفتر سے لوٹا ہوں۔ اتنی بارش میں تمہاری ماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو تمہاری خالہ ویسے ہی شہید ہو جائے گی۔" وہ ناگواری سے بولے۔

وہ روتی ہوئی واپس گھر آئی ہی تھی کہ پیچھے عفان اور ضمیرا آپی بھی آگئے۔ عفان نے اپنی گاڑی نکالی اور ضمیرا آپی کی مدد سے تنا "فانا" خالہ کو گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔

"تم گھر میں رہو۔ زین آیا تو اکیلا پریشان ہوگا۔" بھیگی پلکوں والی ڈری سہمی لڑکی کو وہ تسلی دیتا چلا گیا۔

رات کو ابو بھی آگئے اور عفان سے بات کرکے اسپتال پہنچے۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ کانٹوں بھرا تھا۔ زین بھی اس کے گلے لگ کے سسکتا تو کبھی وہ زین کے گلے لگ کے روتی۔

"کیا ہوا تھا تمہاری ماں کو۔" کچھ دیر بعد تائی اماں چلی آئیں۔ عفیرا نے مختصراً" ان کی طبیعت بتائی۔ تائی تو شاید وہ جھگڑنے کے موڈ میں تھیں۔ پھر نجانے روتے بچوں کو دیکھ کر یا بہن کے خون کی ہلکی سی کشش نے ان کے لبوں کو خاموش کروا دیا۔

کچھ دیر بعد عفان، ضمیرا آپی، ابا اور اماں سب ہی آگئے۔

"کہاں تھے تم دونوں؟" تائی اماں نے پژمردہ بہن کے چہرے کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔

"وہاں جہاں آپ کو ہونا چاہیے تھا۔" عفان کے ناگواری سے کہنے پر وہاں کھڑے سارے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

"مجھے تو بتا کر جاتے۔ ویسے تم دونوں کا جانا ضروری تھا؟" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولیں۔

"چھوٹو عفیو! اپنی تائی کے لیے کچھ چائے 'پانی کا انتظام کرو۔" عفان نے ان کی بات کے جواب میں عفیرا کو مخاطب کیا۔

"شکریہ! جب خالہ کی خدمت پوری ہو جائے تو گھر آ جانا۔" وہ غصے سے انہیں گھورتی فوراً چلی گئیں۔

"پتا نہیں سلمٰی کا مزاج کب نرم ہو گا۔" ابا نے کھسیا کر کہا تھا۔

"ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔ یہ خالہ جان کی ادویات ہیں۔ ان کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر گیا تھا۔ آج انہوں نے کیا کھایا تھا؟" وہ دوائیاں چچا کو پکڑا کر عفیرا کی طرف دیکھ کے بولا۔

"امی نے دلیہ کھایا تھا۔"

"دلیے سے تو بی پی شوٹ نہیں کرتا۔" ضمیرہ آپی حیران ہو کے بولیں۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ابا نے پریشانی سے پیشانی مسلی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! آپ اللہ سے دعا کریں۔" عفان نے ان کا کندھا تھام کر کہا۔

بھتیجے کی محبت پر وہ نہال ہو گئے۔ "کیا ہے اگر تھوڑی سی گنجائش تمہارے اماں ابا بھی پیدا کر لیں۔"

"چچا! آپ ہمیں بتائیے کہ آخر کیا مسئلہ ہے جو امی ابو حتیٰ کہ ماموں وغیرہ بھی آپ سے اتنے ناراض ہیں؟" ضمیرا ان کا کندھا تھام کر لجاجت سے بولیں۔

"بیٹا! بس ہمارے ہاں یہ رواج تھا کہ نسبت بچوں کی بچپن میں طے کر دی جاتی تھی۔ میں تمہاری ماں سے منسوب تھا۔ میری غلطی یہ تھی کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی مجھے تمہاری چچی بھا گئیں۔ میں نے بچپن کی منگنی کو اپنی مرضی کے خلاف سمجھ کر اس رشتے سے بے اعتنائی برتی۔ تمہاری ماں بچپن سے میرے خواب دیکھتے تئی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں آمنہ کو پسند کرتا ہوں۔ وہ آمنہ سے حسد کرنے لگی۔ حسد کی آگ اتنی پھیلی کہ بہن کا رشتہ بھی لپیٹ میں آ گیا۔ بڑی منت سماجت سے تمہاری دادی میرے لیے آمنہ کا رشتہ لینے پر راضی ہوئیں۔ سلمٰی نے سعید اور معین کو بھی بھڑکا دیا۔ بس اب کیا کیسی بات میں جاؤں۔ شادی بخیر و عافیت ہو گئی۔ اماں جان نے تمہاری نانی اور ماموؤں کا غصہ کم کرنے کے لیے بڑے بھائی کے لیے سلمٰی کا رشتہ مانگ لیا۔ غصہ تو کم ہو گیا پر دل جدا ہو گئے۔ آمنہ کی خدمت گزاری اور میری طبیعت کی وجہ سے۔ تمہارے دادا نے مرتے وقت جائیداد کی بھی منصفانہ تقسیم نہ کی اور زیادہ حصہ میرے پاس آ گیا۔ تمہاری پھپھو تو صبر کر گئیں مگر تمہارے تایا بگڑ گئے۔ میں نے ابا کے مرنے کے بعد اضافی حصہ دوبارہ بھائی جان کو دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر ان کی انا کا مسئلہ بن گیا۔ نسبت بگڑتی ہے تو پھر سمیٹنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔

وہ تھک کر چپ ہوئے تو عفیرا آنسو پیتی خاموش لیٹی ماں پر ایک نظر ڈال کر کچن کی طرف چلی گئی جبکہ ضمیرا آپی اور عفان بھی ابا سے اجازت لے کر گھر آ گئے۔

"خالہ اور چاچو کی غلطی اتنی بڑی تو نہیں کہ ہم ان سے قطع تعلق کر لیں۔" عفان نے دکھ سے ضمیرا آپی سے کہا۔

"انسان کی جبلت میں معافی کا عنصر بڑی دیر سے آتا ہے۔ جب رشتے تھک جائیں یا جب رشتوں کی ڈور میں بے حسی کی گانٹھ لگ جائے۔" ضمیرا نے گیلے دوپٹے کو نچوڑتے ہوئے کہا۔

"ہمیں امی اور ابو کو احساس دلانا ہو گا۔" عفان کا لہجہ پر عزم تھا۔

"دونوں ادھر ہی رک جاتے؟" ابو نے دروازہ کھولتے ہی طنز کیا۔

"اگر خالہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو یقیناً رک جاتے۔" ضمیرا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ابا کی

گھر کیاں لاؤنج میں آکر بھی نہ تھمی تھیں۔

"خالہ تمہاری بیمار ہی ہوئی ہے۔ کوئی اللہ کو پیاری نہیں ہو گئی جو تم لوگوں کو اتنی ٹینشن ہو گئی ہے۔" ماں نے بھی بے نقط سنائی تھیں۔ ضمیرا نے عفان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ انہیں دلاتا ہے احساس۔

"خدا کا خوف کریں امی! وہ آپ کی بہن بھی ہے۔" عفان بھڑک گیا۔

"ہاں ساری عمر اپنے لیے سوچنے والی۔ دوسروں کے جذبات سے کھیلنے والی۔" اماں نے نفرت کا مزید مظاہرہ کیا۔

"پسند کرنا اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ بندہ نفرت کے مینار پر ہی چڑھ جائے۔" عفان نے ماں کو تاسف سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہو! تو وہ دونوں تم لوگوں کو ماضی کے قصے سنا چکے ہیں۔" ابو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابو! جو دادا ابو نے کیا اس میں بھلا چچا کا کیا قصور؟" ضمیرا نے بھی بات کی۔

"تم دونوں بہن بھائی یہاں سے چلے جاؤ۔" سلمیٰ نے غصے سے کہا جبکہ ابو کچھ خاموش ہو گئے۔ وہ دونوں اپنے ماں باپ کی ضد ہی طبیعت پر افسردہ ہوتے وہاں سے اٹھ آئے۔

☼ ☼ ☼

"ہائے ہائے! مجھے تو تم لوگوں نے اطلاع نہ دی کہ آمنہ کی طبیعت اتنی خراب ہے۔" دوسرے دن گلزار پھپھو نے آکر دہائی دینا شروع کر دی۔

"عفیرا بیٹی ذرا چائے تو بنا کر لانا۔ آج میرا بھی سر دکھا جا رہا ہے۔" پھپھو نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی۔ وہ کچن میں چلی گئی۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ گھی بندھی روٹین۔ صبح سے شام سے صبح۔ گھر کے کام۔ امی کی تیمارداری۔ خود کو تو وہ یکسر بھول گئی تھی۔

اچانک کچھ یاد آنے پر وہ چائے ہلکی آنچ پر رکھ کر اپنے کمرے میں آکے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"میں تم سے ریحان کے لیے عفیرا کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔ باپ تو پردیس بیٹھا ہے۔ خرچہ بھیج کر مطمئن ہے۔ مجال ہے جو بھول کر بھی پاکستان کا رخ کرے۔

دلوا دلوی کے سہارے میرا پنپتا پلتا رہا۔ ابا نے مجھے چنڈووں میں دے ڈالا۔ بیٹا بھی انہی کی نسل پر چلا گیا۔ اب تو دل کرتا ہے کہ کسی سلجھی ہوئی لڑکی کو بہو بناؤں۔ عفیرا سے بڑھ کر مجھے کوئی لڑکی نظر ہی نہیں آئی۔"

پھپھو کی بات پر وہ آئینہ دیکھنا بھول گئی۔

"لیکن باجی! ریحان تو کوئی کاروبار نہیں کرتا۔ پھر بقول تمہارے صرف سو پڑھا ہے۔"

"اوہو بھلا آج کل کی تعلیم کون دیکھتا ہے۔ رہی کمائی کی بات تو ماشاء اللہ عفیرا کے نام کافی بینک بیلنس ہے۔ دولوں گھر کے ہی بچے ہیں۔ وہ کوئی کاروبار شروع کر دے گا۔" پھپھو کی بات سے آمنہ کے دل کو دھکا سا لگا بلکہ عفیرا بھی سن سی ہو گئی۔

"سلمیٰ نے تو تمہیں پوچھا نہیں۔ تمہارے بھائی بھی شاید کیا بلکہ یقیناً" تمہیں کبھی گلے نہ لگائیں۔ بیمار بہن کی خیریت معلوم کرنا انہیں گوارا نہیں۔ تو کیا وہ تمہاری بیٹی کا رشتہ لیں گے۔ رشتے کے نام پر تمہارا میرا ساتھ رہا ہے۔ اگر مجھے بھی انکار ہوا تو سمجھو یہ بھی رشتہ ختم۔ پھر میں عمر بھر تمہیں شکل نہ دکھاؤں گی۔ غیروں پر بھروسا کرنا چاہو تو جہاں مرضی بیٹی کو بیاہ دینا۔"

امی کی مسلسل خاموشی نے گلزار پھپھو کی وضاحت کو حوصلہ افزائی بخشی تھی۔ اور عفیرا مقدر کی بھول بھلیوں میں گم ہوتے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر کرتے گنگرنے اس کے ارتکاز کو توڑا تھا۔ وہ جلدی سے پھپھو کو چائے تھما کر سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھ آئی۔

"ہم نے سوچا کہ اتنے اچھے موسم میں کوئی چڑیل اپنا ابھی تک دیدار کیوں نہیں کروا رہی۔ سو خود ہی متوجہ کر لیا جائے۔" ضمیرا آپی نے خوشگوار موڈ میں

اسٹرابیری منہ میں ڈال کر اس کے طرف دیکھا۔

"آج کوئی چیز نہیں مانگی ہوگی۔" عفان نے شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب مانگوں گی تو شاید تمہارے پاس دینے کے لیے بھی کچھ نہ ہو۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"او ہو۔ ہاہاہا۔" وہ بلاوجہ ہنسنے لگا۔ "لگتا ہے آج خالہ سے مار پڑی ہے۔ منہ پر اسی لیے کافی رونق نظر آرہی ہے۔ ویسے بائی داوے میں کون سی چیز تمہیں نہیں دیتا۔"

"تم صرف چٹنی پٹی دے سکتے ہو۔ اتنی او قات نہیں ہے تمہاری۔ کہ کچھ اور دو۔" اس کے بلاوجہ کے قہقہے اسے سخت برے لگ رہے تھے۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ضمیرا آپی نے اس کا ساتھ دینے کے لیے کہا۔

"اچھا جی۔ ان شاء اللہ کچھ ہی دنوں میں جب مجھے جاب ملے گی تو تمہیں اور ضمیرا کو ایک آئس کریم آفر کروں گا۔"

"رہنے دو اپنی آئس کریم۔ میں نے سوٹ لینا ہے اور سینڈل بھی۔ بلکہ تم علیزا کو بھی لے کر دینا ہے۔" ضمیرا نے دھپ سے ایک کیٹر اسے رسید کرتے ہوئے کہا۔

"اوف۔ اتنی بڑی فرمائش۔" ضمیرا آپی کو چڑانے کے لیے وہ جان بوجھ کر آئس کریم ہی آفر کر رہا تھا۔

اس سارے معاملے میں وہ یکسر بے نیاز بنی بس دونوں کے چہرے دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

امی نے من و عن پھپھو کی بات ابا کے سامنے دہرائی تھی۔ ابا نے سنتے ہی صاف انکار کر دیا۔

"ریحان اور علیزا کا کوئی جوڑ نہیں۔ داؤد نے خود ساری عمر سارا پیسہ الٹے تلکوں میں اڑا دیا۔ بیٹا بھی اسی روش پر چل رہا ہے۔ میں علیزا کے لیے ریحان کو بالکل مناسب نہیں سمجھتا۔"

"لیکن پھر گلزار بھی ہم سے تعلقات ختم کر دے گی۔" امی کی سراسیمگی پر علیزا نے ہمدردی سے اپنی کمزور ماں کو دیکھا۔ جو قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی اپنوں کی بے رخی کا دکھ سہتے آئی تھیں۔

"کر دے بند بول چال۔ میں بھر گیا ہوں اپنوں کے رویوں سے۔ اب کسی کی بات دکھی نہیں کرتی۔ بس میں اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے آگ میں انہیں جھونک سکتا۔"

"امی! ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ریحان بھائی مجھے بھی نہیں پسند۔ ہر وقت بونگیاں مارتے رہتے ہیں۔" زین نے کہا۔

☼ ☼ ☼

ساتھ والے گھر سے قہقہوں اور شور کی آواز آرہی تھی۔ ضمیرا آپی کی وجہ سے اسے سعید ماموں کی جرمنی سے آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔

امی کی حالت آج بار بار بگڑ رہی تھی۔ وہ انہیں نیند کی گولی دے کر باہر اپنے چھوٹے سے لان میں آکر رونے بیٹھ گئی۔ ان کی بیماری کچھ میں آکر نہیں دے رہی تھی۔ بے تحاشا کمزوری تھی۔ کچھ کھلاؤ تو الٹیاں کر کے سب نکال دیتیں۔

"آپی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟" زین نجانے کب گھر لوٹا تھا۔

"زین تمہاری امی کیوں نہیں ٹھیک ہو رہی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ آپی! میرا دل گھر آنے کو ہی نہیں کرتا۔ امی کی حالت ایسی ہوتی جا رہی ہے۔ نہ ان کو میرے آنے کا پتا نہ جانے کا۔ میں امی کے لاڈ کو ترس گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔ ہمارا گھر پہلے جیسا ہو جائے۔ امی ہم دونوں کے لیے ویسے ہی ناشتہ بنائیں۔ ہمیں ویسے ہی۔"

وہ علیزا کے سامنے بچوں کی طرح نجانے کب سے رکے آنسوؤں کو راستہ دے کر دھاڑیں مار مار کر رو پڑا۔

علیزا کی اپنی سسکیاں بے قابو ہو گئیں۔

انہیں بالکل پتا نہ چلا تھا کہ کوئی ان کے سر پر کھڑا

ہے۔ اور نجانے کب سے ان کی باتیں سن رہا ہے۔ ان کی باتوں کی تیزابی نے اس کا دل بھی زخمی کردیا تھا۔
"بس کرو میرے بچوں!" وہ دونوں کرنٹ کھا کر سیدھے ہوئے تھے۔ سعید ماموں کی آنکھوں میں مدتوں کا ٹھہرا گلیشیر پگھلنے لگا تھا۔
"ماموں۔" وہ دونوں جذبات کی رو میں بہہ کر کسی پیار کے سہارے کے متلاشی بچے ان کے ساتھ لپٹ گئے۔
آج کی تاریخ خوشیوں کی شروعات تھی۔ زین نے اپنے کمرے میں لگے کیلنڈر پر مارکر سے اس تاریخ کے نیچے سرخ روشنائی کا نشان لگا دیا۔
وہ آج کے دن کو کبھی بھی بھلانا نہ چاہتا تھا۔
سعید ماموں نے بچھڑے لوگوں میں ملاپ کروادیا تھا۔ ضمیرا آپی اور عفان بھائی کے خلوص پر وہ نجانے کتنی بار رویا تھا۔ ضمیرا نے عفان کی نوکری پر انگوری اور کاسنی رنگوں کے امتزاج سے بھرپور ایک شاندار سوٹ عفیرا کو گفٹ کیا تھا۔
آج خالہ، تایا ابو، سعید ماموں اور معین کی طرف سے ان کے گھر دعوت تھی۔ اس خوشی کے موقع پہ ابا نے گلزار پھپھو کو بھی بلایا تھا۔
"آپی! آپی! ریحان بھائی کو گولی لگ گئی ہے۔" زین حواس باختہ سا کچن میں آیا۔ وہ اور عفان دم بخود رہ گئے۔
"اللہ خیر!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ جبکہ زین اور عفان باہر کو بھاگے۔
پل بھر میں منظر بدل گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی امی کے کمرے میں آئی۔ پھپھو دیوانہ وار پاگلوں کی طرح امی کے پیروں اور گھٹنوں کو چھو چھو کر معافیاں طلب کررہی تھیں۔ پھپھو کے ذریعے ہی سب کو ریحان کو گولی لگنے کا انکشاف ہوا۔ وہ ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوا تھا۔ گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ ایمرجنسی میں تھا۔
سلمٰی خالہ اور ضمیرا آپی پھپھو کو سنبھال رہی تھیں۔

پھپھو کی معافی نے سب کو ہراساں کردیا۔
"گلزار! حوصلہ کرو۔ اللہ ریحان بیٹے کو زندگی دے۔ تم مجھ سے کیوں معافیاں مانگ رہی ہو۔" امی انہیں نرمی سے سمجھانے لگی۔
"میں بہت گنہگار ہوں۔ میں بہت خطاکار ہوں آمنہ! میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ہائے میرا بیٹا۔" وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ سب نا سمجھی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے۔
"کیا کہہ رہی ہو گلزار۔" معین ماموں نے اب ذرا درشتی سے کہا۔
"میں نے عفیرا کی ریحان سے شادی کروانے اور جائیداد ہتھیانے کے لیے آمنہ پر کالا علم کروایا تھا۔ مجھے معاف کردو۔ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ مجھے معاف کردو۔" وہ امی کے پیروں پر جھک سی گئیں۔ جبکہ امی نے کرنٹ کھا کر دونوں پاؤں پیچھے ہٹالیے۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔
"میرا ریحان! ہائے میں مر جاؤں گی۔ میں اندھی ہوگئی۔ ہوس میں۔ حسد میں۔ ہائے اللہ! ہائے میرے رب! میرا بیٹا!" وہ بین کرتی نیم پاگل سی ہوئی جارہی تھیں۔
انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ اصل چہرہ پہچانتے پہچانتے ہی انسان آدھی قبر میں اتر جاتا ہے۔ عفیرا کا تو ذہن بند سا ہو رہا تھا۔
"سورۃ الناس اور سورۃ الفلق میں اللہ نے انسانوں اور تمام مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ جھاڑ پھونک کرنے والیوں اور حسد کرنے والیوں پر اللہ کریم نے لعنت بھیجی ہے۔ سب گناہ معاف ہیں سوائے شرک کے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم ہماری بہن ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ انا اور تکبر میں ہم لوگ ہی ڈوبے ہوئے ہیں۔ اتنے سالوں سے اپنی انا کے پندار میں اکڑے بیٹھے رہے۔ ہم نے صلہ رحمی کی کوشش ہی نہ کی۔ میرا بھائی۔ بھابھی اور بچے ہم سب کی نفرتوں کا نشانہ بنتے رہے۔ میں اس بات پر فخر کرتا رہا کہ چلو گلزار کا دل تو موم ہے۔ وہ تو خدا خوفی رکھتی ہے مگر تم

تو اللہ کی حدود کو پار کرنے میں مجھ سے بھی بڑھ گئیں۔"

تایا ابو پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

"اللہ کریم ہے۔ رحیم بھی ہے۔ موت سے پہلے معافی کے دروازے کھلے ہیں ہمیں سب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ حقوق العباد میں ہم نے آپ کو معاف کیا۔ آپ اپنے رب سے معافی مانگیں بھائی جان۔!"

ابو نے ہمیشہ کی طرح اپنی نرم خوئی اور نرم طبیعت سے کھلے دل سے سب کو معاف کر دیا۔

ان دونوں بہن بھائیوں نے اور باقی سب نے ان روشن مزاج لوگوں کی طرف دیکھا جو ان ہی میں سے تھے پر ان جیسے نہ تھے۔ زین اور عفیرا کو ایک دم امی ابو پر پیار آیا اور ان پر فخر محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

اس واقعہ کو ایک ماہ بیت گیا۔ امی کی صحت بحال ہونے لگی۔ بس وہ چپ چپ سی رہتیں۔ عفیرا بڑے اہتمام سے سورۃ الناس اور سورۃ الفلق کی تسبیح روزانہ پڑھتی۔

کیونکہ پھپھو نے اعتراف بھی کر لیا تھا۔ مخلوق کے شر سے پناہ کا حکم اللہ کا تھا اور ہر انسان کو اپنی زندگی میں ہمیشہ مخلوقات کے شر سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

ابا کا کاروبار ترقی کی طرف گامزن تھا۔ سلمٰی خالہ روز چکر لگاتیں۔ وہ پہلے سے کمزور ہو گئی تھیں۔ اس واقعہ نے مختلف لوگوں پر مختلف اثرات مرتب کیے تھے۔

عفیرا ابو کی اجازت سے ایم اے اسلامک اسٹڈیز کر رہی تھی۔ وہ اپنے پیارے دین کو مزید سمجھنا چاہتی تھی جو زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرتا ہے۔ زین کا رزلٹ شاندار آیا تھا۔ عفان نے اپنی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ کروا دیا۔

ریحان بھائی ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے تھے۔

ضمیرا آپی کی متوقع شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

"نجمہ! میں اور تم ایک ہی رنگ کے سوٹ بنائیں گے جیسے ہم دونوں شادی سے پہلے پہنا کرتے تھے۔"

امی اپنی بہن کی محبت پر مسکرا اٹھیں۔

"پھر میں بھی ضمیرا آپی جیسے کپڑے بنواؤں گی۔"

"ہم اگر دلہنوں کی طرح کے کپڑے پہنو گی تو لوگ اصل دلہن کو کیسے پہچانیں گے۔" عفان نے اسے چھیڑا۔

"پھر ہم اصل دولہا ڈھونڈ لائیں گے۔" ضمیرا آپی نے ذومعنی انداز میں کہا۔ اس کے ہونق بنے چہرے کو دیکھتے ہوئے امی نے کہا۔

"ہم سوچ رہے ہیں کہ ضمیرا کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی اپنے عفان کی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آویں۔"

عفیرا اتنی کھلی بات پر سٹپٹا کر کچن میں بھاگ گئی۔ جبکہ باقی سب ہنسنے لگے۔

"میں چاہتا ہوں کہ چینی چچی کے ساتھ تمہیں اپنا دل، دماغ سب کچھ دے دوں۔" وہ بنا آہٹ پیدا کیے اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا۔

"دماغ تو تمہارا چلتا نہیں ہے البتہ دل کا سوچوں گی۔" وہ بھی شوخی سے بولی۔

"عفان بھائی! دماغ مجھے دے دیں۔ ایمان سے بڑی فل اس کی تیاری نہیں ہو رہی۔" وہ دونوں زین کی بات پر ہنس دیے۔

"دل تو کوئی لے ہی چکا ہے یار! اب ایک دماغ رہ گیا ہے۔ وہ تم لے لو۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"کیا مطلب۔" زین حیران سا ہوا۔

"مطلب یہ کہ میرے بھائی! تم یہ پانی پیو اور جا کر ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ عفان۔ موٹا تازہ۔ میرے بھائی کو پریشان مت کرو۔"

"شادی کے بعد تم مجھے ذرا موٹا تازہ کہنا تو سہی۔" وہ اسے دھمکاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

جبکہ عفیرا اپنے رب کا شکر ادا کرنے اندر کی طرف دوڑی۔ وہ خوشیوں کے راس آجانے کی دعا چاہتی تھی۔ جو مدتوں بعد ملی تھیں۔

کنیز نبوی

صنم سے سنگ تک

ملک حسنین رضا اور حسین رضا دونوں بھائی ہیں۔ حسین رضا پڑھائی کے سلسلے میں شہر میں رہتا ہے اور اس کا بڑا بھائی ملک حسنین رضا گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

حسین رضا اپنے ماموں کی بیٹی حمیرا کی محبت میں گرفتار ہے اور حمیرا بھی حسین رضا کے جذبات سے آگاہ ہے اور اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔

حسین رضا اپنی ماں کی طرف سے گاؤں آنے کے ارجنٹ تار پر سامان سفر باندھ کر گھر جاتا ہے اور گھر پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ حمیرا اور حسنین رضا کی شادی کی تاریخ طے پائی ہے۔ یہ خبر سن کر حسین رضا کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ حمیرا اور حسنین رضا کی شادی ہونے کے بعد وہ بجھے دل کے ساتھ دوبارہ شہر آجاتا ہے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد کاٹن فیکٹری میں منیجر کی جاب کرلیتا ہے۔

شادی کی پہلی رات ہی حمیرا کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور اسے دورے پڑنے لگتے ہیں جس پر اکثر لوگ جن آسیب کے سائے کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ حمیرا کو آئے دن پڑنے والے دورے طویل ہوتے گئے یہاں تک کہ اس کی سانس ہوتے کی آس لیے قبر میں جا سوئی جبکہ شوہر حسنین رضا ان دوروں سے تنگ آکر زمینوں پر ڈیرے میں رہنے لگا۔ وہاں منشی کی بیٹی زبیدہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ بیوی کے پاگل پن سے پریشان حسنین رضا کو جو پناہ زبیدہ کے وجود میں میسر آئی تو اس نے منشی سے رشتہ مانگ کر سادگی سے نکاح پڑھوالیا۔

ان ہی دنوں حسین رضا زمینوں پر اپنا حصہ وصول کرنے حویلی پہنچتا ہے تو اسے حمیرا کی حالت کا پتا چلتا ہے۔ وہ حمیرا کو

مکمل ناول



علاج کے لیے لاہور لے آتا ہے۔ ان کے ساتھ ماسی حمیدہ بھی ہوتی ہے۔ حمیرا لاہور آکر بہتر ہو جاتی ہے اور حسین رضا سے شادی کرنے کا کہتی ہے۔ ان دونوں کی باتیں یہ خشل سن لیتا ہے۔ حسین رضا یہ جان کر لرز جاتا ہے۔

غضنفر حسنین انتہائی غربت کے باوجود اعلا تعلیم حاصل کرتا ہے اور اپنے ماموں اور ماں کے خواب پورے کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسی کوشش کے دوران غضنفر حسنین کو حسین رضا کے دفتر میں جاب مل جاتی ہے۔ حسین رضا کی بیٹی حیا حسین غضنفر حسنین کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ بات حسین رضا کو پتا چل جاتی ہے۔ اور پھر غضنفر حسین کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کا کہتا ہے۔ کچھ دن سوچنے کے بعد غضنفر حسنین 'حیا حسین سے شادی کے لیے ہاں کرتا ہے۔

ماہم اپنی والدہ اور اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے اور اسے اعلا تعلیم حاصل کرنے اور آگے پڑھنے کا عزم ہمیشہ پرجوش رکھتا ہے۔ ماہم اپنی والدہ کے ساتھ گاؤں آتی ہے تو وہاں اس کی دوستی گاؤں کی ایک لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ جو در اصل حیا کی کزن ہوتی ہے۔ وہ ماہم کی جاب کے لیے حیا سے سفارش کرتی ہے اور یوں ماہم کو حیا کی۔ سفارش پر غضنفر حسنین کی سیکریٹری کی جاب مل جاتی ہے۔ حیا کے کہنے پر وہ اسے رہنے کے لیے فلیٹ بھی دے دیتا ہے۔ جسے پاکر ماہم اور اس کی والدہ کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

۲

دوسری اور آخری قسط

وہ رات کتنی سہانی تھی۔

سوہل کے گل جیسی طلسماتی روہی کی رات میں جب معلوم سے نامعلوم کے سفر پر رواں دواں جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہم سفر ستاروں کو گنتی۔ خواجہ فرید کی کافیوں پہ جھومتی تھی۔ اس کے اردگرد رقصاں ہوا کے جھونکے گانوں سے ٹکرا کر ا... سحر زدہ کر رہے تھے۔ فریدن پیر کے سرائیکی دوہے... کا طلسم اسے جکڑ گیا تھا۔

وہ اپنے سانول یار کے پہلو سے بیٹھی ملاپ سے مدہوش ہوئی جاتی تھی۔ چولستان کے ٹیلوں کے بیچ ہر جگہ عشق کے جلوے "حسن کوٹ کی روہی کو سانول یار جیسے روپ میں ظہور پذیر کرتے" روہی اک ایسے معشوق کی مانند طرح دار ناز و ادا سے بھرپور محبوبہ بنی بیٹھی تھی کہ صرف اس وسیب کے باشندے ہی نہیں، ہر محبت کرنے والا انسان اس روہی ایسی معشوقہ محبوبہ کا عاشق بن بیٹھے۔

اس کا ہم قریہ سانول یار روہی وسیب اس کے آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسے کسی نامعلوم سفر پر لے جاتا تھا۔ ساکت و سکون کی فضا سحر زدہ ماحول پر طاری تھی اور مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی ٹل ٹل روہی کی فضا کو ایسی موسیقیت عطا کرتی۔ جس موسیقی پہ راجہ اندر کا دیباج سرکتا کر سخاوت کے درجہ اعلا پر فائز ہوا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا' وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے اور کس سفر پر ... وہ تو ہجر و فراق کو شکست دے کر وصل و ملاپ کے نکاح میں آچکی تھی۔ وہ اس کے دل میں پیا نے پیر پسار لیے اس کے دل کی اجڑی جھوک وس گئی' سانول یار نے گلے کیا لگایا کہ ہفت اقلیم مل گئی۔

وہ شام سلونا پیا آج بھی اس کے دل میں مقیم تھا۔ اسی لیے اس کا محل جیسا دل آباد تھا۔

جو جس دا عاشق ہووے اسی دی گل کردا
سو سو مکر بہانے کردا اسے ہووے مردا

(جو جس سے پیار کرتا ہے' اسی کی بات کرتا ہے۔ سو سو بہانے بنا کے دل کو فریب دے کر۔ اسی کے غم میں مرتا ہے۔)

وہ فجر پڑھ کر جائے نماز پر غمگین بیٹھی تھی' کتنی سالوں بعد اسے نماز پڑھنے کا خیال آیا تھا اور رب سے دعا مانگنے کو دل چاہا تھا۔ اسی دم جیسی سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جس دل اندر عشق سماتا' اس نئیں فیر جاتا
بھانویں سوہنے ملن ہزاراں' اساں نئیں یار وٹانا

(جس دل میں عشق سما جائے 'پھر نکلتا نہیں' چاہے کتنے ہی خوب صورت لوگ ملیں 'محبوب بدلا نہیں جاسکتا۔)

اس کی آنکھیں یکدم پُرنم ہوئیں۔ وہ آہستگی سے جائے نماز سے اٹھ کر اسے لپیٹنے کو جھکی 'آنکھوں سے آنسو جائے نماز پر گر کر اپنی بے بسی کی فریاد کرنے لگے۔ وہ اس دردیلی آواز کے تعاقب میں چلتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

جنھاں دکھاں وچ دلبر راضی' سکھ رہتاں توں وارے
دکھ قبول محمد بخشا' راضی رہن پیارے

(جن دکھوں پر محبوب خوش رہے' میں ان پر خوشیاں قربان کروں گا' مجھے دکھ قبول ہیں۔ محمد بخش! بس محبوب خوش رہے۔)

اسے وہ سارے دکھ قبول تھے جن سے اس کا حسین خوش رہ سکتا تھا۔

اس نے تین دن سے منتظر حسنین کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے موبائل پر وہ پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ وہ سراپا انتظار' تنہائی کا شکار' کبھی آس کا دامن تھامتی' کبھی نراش ہو کر رہ جاتی۔

کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ اور کیا ہو گا اب اس کے ساتھ۔ حیا حسین جسے وصل جاں افروز' کبھی وہ ہجر جاں سوز لگتا۔ دل کے دامن تار تار پر وہ دلاسوں کے پیوند لگاتی۔ حیا حسین اپنا خانہ خراب دل لیے اب بھی اس کے التفات و توجہ کی منتظر تھی۔ کیونکہ اس نے عشق کیا تھا اور دل بیمار کا اگر کوئی مسیحا تھا تو وہ منتظر حسنین تھا۔

وہ محبت کے محل سرا میں محبوب کی گلیوں میں گم ہو چکی تھی اور اب ان بھول بھلیوں سے باہر نکلنا ناممکن اور بے کار تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچا ہے آپ نے؟" منتظر نے فون کر کے حسین رضا سے سوال کیا تھا۔

"دیکھو منتظر بیٹا! مانتا ہوں' مجھ سے ماضی میں غلطیاں ہوئیں مگر میری بیٹی۔ میرے جرم کی سزا اسے نہ دو۔" وہ جو چند دنوں سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے' رابطہ ہونے پر پہلی بات یہی کی۔

"اس کا یہ قصور کم ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے؟"

حسین رضا نے بے بسی سے موبائل کو دیکھا۔

"وہ تمہاری بیوی ہے۔ کوئی غیرت مند شوہر بیوی کو یوں اغوا کر کے اس کے والدین کو بلیک میل نہیں کرتا۔" وہ اپنے تئیں بڑی وزنی دلیل لائے۔

"اور غیرت مند بیوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ چند لمحے رکا۔ "اور غیرت مند بھائی کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں مسٹر حسین رضا!" وہ پُر طنز انداز میں گویا ہوا۔ "جنہوں نے اپنے نفس کی خاطر کسی کی جان لے لی۔" اس کا لہجہ زہر خند ہوا۔

"دیکھو۔ تم میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔ تم جو کہو گے وہ کروں گا۔ میں حمید اور مخشل کو آزاد کرنے کو تیار ہوں۔"

"اوہ ہو!" وہ دل کھول کر ہنسا۔ "بڑی جلدی لائن پر آگئے آپ۔"

حسین رضا نے اس کے طنزیہ فقرے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ "بس تم میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔" وہ گڑگڑائے۔

"ہوں۔ کب چھوڑ رہے ہیں؟"

"سنو! تم نے میری بیٹی پر تشدد تو نہیں کیا؟" وہ عجلت میں بولے۔

"اوہ۔ کیا آپ نے میرے ماموں پر کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو؟" دانستہ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"نہیں۔ نہیں۔ بخدا نہیں' حمید پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔"

"تو پھر آپ کی بیٹی پر بھی کوئی تشدد نہیں ہوا۔" مختر کا لہجہ پُراسرار تھا۔ اس کے لفظوں اور لہجے سے کوئی چیز واضح نہیں ہوئی تھی۔

حسین رضا کی آنکھوں میں بے بسی نمی بن کر تیرنے لگی۔

"اک بار میری بیٹی سے بات کروا دو۔" ان کے لہجے کی نمی مختر سے چھپی نہ رہ سکی۔

"صبر۔ صبر۔ صبر۔ کتنا مزا ہے صبر میں' ہے نا حسین رضا!" مستفسرانہ لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

"دیکھو۔ میں بار بار وعدہ کر رہا ہوں۔ تم جو کہو گے وہی ہوگا۔ مگر میرے اطمینان کے لیے میری بیٹی کی آواز سنا دو۔" وہ گڑگڑائے۔

"اونہوں۔" اس نے نفی میں ہنکارا بھرا۔ "آپ نے میرے ماموں کی آواز مجھے سنائی تھی نہیں نا؟"

"میں اس کی آواز سنوانے۔ بلکہ ابھی اسی وقت چھوڑنے کو تیار ہوں۔ بس تم میری بیٹی کو چھوڑ دو۔"

"ارے رے!" وہ لہجے میں حیرانی سمو کر بولا۔ "میں بے غیرت تھوڑی ہوں' جو بیوی کو چھوڑ دوں گا۔ یہ تو سوچیے بھی مت حسین رضا۔" اس نے دانت کچکچائے۔

حسین نیم مردہ سے صوفے پر ڈھے گئے۔

"تم میری اس سے بات کراؤ۔ اچھا۔ میں کہاں چھوڑوں مشعل اور حمید کو۔" وہ بے تاب ہوئے۔

"کل صبح دس بجے بادشاہی مسجد میں چھوڑ جائیے گا اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ یہ آپ کو مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" مردہ آواز اسپیکر سے ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا۔ وہ تیرا میاں ہے نا؟" اس بوڑھی عورت نے پوچھا' جو چند دن سے اسے کھانا دینے آ رہی تھی۔

"جی اماں!" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے اس سے؟" وہ نرم لہجے میں استفسار کرنے لگی۔

"میرا تو نہیں۔ خود ہی ناراض ہو گیا ہے۔"

"بیٹا' میاں' بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کبھی سانجھ' کبھی سویرا' کبھی دکھ' کبھی سکھ' کبھی دھوپ' کبھی چھاؤں' آپس کی چھوٹی موٹی ناراضیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ مگر اک دوسرے کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا۔ وہ ناراض ہے تو تم ہی منا لو۔" وہ اس بوڑھی عورت کے ناصحانہ انداز پر کتنی ہی دیر چپ رہ گئی۔

"وہ مانے گا بھی تو نا۔"

"تم روٹھو گی تو منت جائے گا۔ شوہر کہیں جائے یا بھٹکے لوٹ کر گھر ہی آتا ہے۔" وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"اماں! میرا دل تو اس کے عشق کا ایسا آتش کدہ ہے جو کبھی ٹھنڈا ہی نہیں ہوا۔" وہ آبدیدہ ہوئی۔

"اسے ٹھنڈا ہونے بھی نہیں دینا' ایک نہ ایک دن تم اسے تسخیر کر ہی لو گی۔" وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

"بہت مشکل ہے اب مجھے تسخیر کرنا حیا حسین!" وہ جو اندر کمرے میں اسے لینے آ رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر خود کلامی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔ آتے ہوئے اس کی سنگت میں بے انتہا خوش تھی اور جاتے ہوئے افسردہ۔ وہ اس کا تھا مگر نہیں تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھا تھا مگر اجنبیت کی دیوار بیچ میں حائل ہو گئی۔ آتے ہوئے جو سفر گھنٹوں کا منٹوں میں طے ہوتا محسوس ہوا۔ وہ جاتے ہوئے صدیوں پر محیط ہو گیا۔

وہ بار بار اسے نظریں چرا کر دیکھتی۔ مگر اس کے چہرے پر کسی نرمی اور اپنائیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ دامن دل کے ملائم تار وجود کو امید کی سوئی سے محبت کے ٹانکے لگاتی رہی۔

سفر کٹا، مگر بہت تھکا دینے اور روح پر زخم لگانے والا۔ جس میں اس کے محبوب نے اک نظر التفات تو کجا بے التفاتی سے بھی نہیں دیکھا۔

لاہور کے مضافات میں اک گھر میں گاڑی کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کی معیت میں اک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔

وہ حمید ماموں کہہ کر ایک آدمی سے لپٹ گیا۔ حمید ماموں اسے گلے لگا کر بے تحاشا رونے لگے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا بیٹا! کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں پھر دیکھ رہا ہوں۔"

وہ روتے ہوئے ماموں کے ہاتھ چومنے لگا۔

"مجھے معاف کردیں ماموں! میں آپ تک نہ پہنچ سکا اور شاید ساری عمر پہنچ نہ پاتا۔ اگر مجھے آپ کا فون نہ ملتا۔ شاطروں کی تدبیریں ——— تقدیر سے ہار گئیں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اب وہ شاطر میرے دام میں ہے کیونکہ جس طوطی میں اس کی جان ہے، وہ میرے قبضے میں ہے۔" اس کی نظروں کے تعاقب میں حمید ماموں نے اسے دیکھا۔

اس ہتک پر بے ساختہ لب بھینچ کر اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا یہ شخص ساری عمر میرے ساتھ دیے کیے کی سزا مجھے دیتا رہے گا۔ محبت و چاہت کا احساس کیے بغیر۔" نم آنکھوں میں نجانے کتنی پرچھائیاں لہرائیں۔

"یہ حسین رضا کی بیٹی ہے کیا؟" مخمل نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

خضر حسین نے سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس وقت حیا کا دل شدت سے چاہا کاش وہ یہ کہہ دے کہ یہ خضر حسین کی شریک حیات ہے۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے حسین رضا! میں نے منع کیا تھا۔ زندگی میں اتنے بڑے رسک نہیں لیتے۔ مگر تم پر تو بھائی کی محبت کا نشہ چڑھا تھا۔ اٹھا کر میری پھولوں جیسی نازک بیٹی کو اس ظالم کے حوالے کردیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اسے ملازمت دینے کی غلطی مجھ سے ہوئی مگر بعد میں حیا کی محبت نے مجھے مجبور کردیا تھا اور وہ میرا بھتیجا ہے۔ یہ پتا تو بعد میں چلا تھا۔"

"جب پتا چلا تو رشتہ کیوں دیا۔"

"تب تک حیا بہت آگے جاچکی تھی۔ ہم اس کی شادی نہ کراتے تو وہ خود کرلیتی۔" حسین رضا بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بولے۔

"میں ماں تھی اس کی، کبھی بھی اسے یہ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

"ہاں۔ تم ماں تھیں اس کی، اسی بات نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر تم کچھ بھی کرسکتی ہو تو وہ بھی تمہاری ہی بیٹی تھی نا۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تلخی سے بولے۔

وہ چند لمحے سن سی بیٹھی رہ گئیں۔ آج یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ان کا محبوب، ان کا شوہر، ان کی محبت کی شدتوں کو طعنہ بنا کر ان کے منہ پر مارے گا۔

"کیوں خاموش ہوگئیں، بری لگی ہے نا میری بات حقیقت یہی ہے حمیرا۔ حقیقت یہی ہے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔ "ہم جو بازی جیت کر سرشار بیٹھے تھے۔ آج جب جذبے سرد اور شدتیں ماند پڑی ہیں تو پتا چلا، ہم تو بازی ہار گئے ہیں۔" ان کے لہجے میں دکھ، تاسف گئے زمانوں کا پچھتاوا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔

"ہم اپنی سب سے قیمتی متاع ہار بیٹھے ہیں اور اب ہمیں سر اٹھا کر نہیں جھکا کر جینا ہے۔" وہ آبدیدہ ہوئے۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑائیں۔

"ہاں ایسا ہوگیا ہے کیونکہ سب سے بڑا منصف اوپر بیٹھا ہے۔ تب ہی ہم اتنے دنوں سے تڑپ رہے ہیں اور اب تو حمید اور مخمل کو چھوڑتے ہوئے بھی وہ

دن ہو گئے۔ مگر کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں ہماری بیٹی زندہ بھی ہے یا۔"

"نہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہیں کہو۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخیں۔

حسین رضا پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

☼ ☼ ☼

"میں حمیرا کے کہنے پر دودھ لینے گیا۔ واپس آیا تو جو میرے کانوں نے سنا اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں تمہاری ماں خوشی خوشی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ حسنین رضا کی جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس سازش سے بے خبر مگن تھی۔

حسین رضا، حسنین رضا کے آگے قسمیں کھا کر میرے اور زبیدہ کے بیچ ناجائز تعلق کا یقین دلا رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ میں ان کے اور حمیرا کے ناجائز و گھناؤنے تعلق سے باخبر ہو گیا ہوں۔ اس لیے وہ الٹا مجھ پر اور فرشتہ صفت زبیدہ بھابھی پر الزام لگا رہے ہیں۔ مبادا میں ان کے تعلق کے بارے میں حسنین رضا کو نہ بتا دوں۔"

یہ حقیقت جو ان سب پر منکشف ہو رہی تھی۔ حیا کے لیے سوہان روح تھی۔ اسے تو آج تک بتایا نہ چلا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ سے شادی سے پہلے اس کے تایا کی بیوی رہ چکی تھی۔ اسے تو ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ حسین رضا اکلوتے تھے۔ کبھی بھی اس کا جانا نہیں ہوا تھا۔

"مشتمر میاں! میں کبھی بھی ان کے تعلق کے بارے میں بتا نہ پاتا کیونکہ ہم کمی کمین لوگ تھے۔ بڑے لوگوں کے عیب دیکھ بھی لیں تب بھی انجان بن کر رہتے ہیں۔ ورنہ ہماری آنکھیں نکال دی جاتی ہیں اور زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں یا موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔"

بمشکل اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیر کر افسردگی سے بولا۔

حیا پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی ماں بدکردار تھی۔ کاش یہ سننے سے پہلے وہ مر جاتی کاش کوئی فرشتہ گواہی دے کر آتا اور ببانگ دہل کہتا ماں پر یہ الزام سراسر جھوٹ ہے۔

"میں الٹے پاؤں بھاگا۔ اس وقت رک جاتا تو زندہ نہ بچتا۔ سیدھا اپنی سالی کے پاس گیا اور کہا کسی طرح سے میری بیوی کو گاؤں سے لے آئے۔ پھر عمر بھر واپس نہیں گیا۔ ایک اسپتال میں صفائی کے کام پر لگ گیا۔ دال روٹی اچھی چل رہی تھی۔"

"امی کے ساتھ کیا ہوا تھا پھر؟" مشتمر بے چین ہوا تھا۔ تب ملک حمید ماموں بول اٹھے۔

"انکل جی نے اسی وقت اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ بے چاری اتنے بڑے الزام سے مری لرزتی گھر پہنچی۔ میں اسی وقت اسے لے کر وہاں سے نکل گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کب قتل کروا دیں۔ آخر ان کی عزت پر بن آئی تھی۔" حمید ماموں کی آواز بھرا گئی۔

"شہر میں مختلف مزدوریاں کرتے وقت کاٹا۔ وہیں تمہاری پیدائش ہوئی۔ ساری عمر ہم ملکوں سے چھپتے رہے۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں مگر ان کے ہتھے چڑھ ہی گئے۔" حمید افسردہ ہو گئے۔

حیا کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھا مشتمر اس کو نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر۔ پھر اس کے بعد بابا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"ٹھیک آٹھ ماہ بعد میں نے اسی اسپتال کے ایک کمرے میں حسنین رضا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے یا غنودگی میں تھے۔ حسین رضا ان کے پاس بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے ڈسٹ بن اٹھایا اور فوراً" باہر نکل گیا۔ حسین رضا نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اخبار پڑھنے میں مصروف رہے۔

میں نے شکر ادا کیا کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ اس دن کے بعد میں اس کمرے کی صفائی کے لیے اپنے

ساتھ کام کرنے والے دوسرے آدمی کو بھیجتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ حسین رضا کے آتے ہی فوراً ایک جونیئر ڈاکٹر ٹیک کر ان کے پیچھے جاتا تھا۔ شک تو مجھے پہلے ہی تھا۔ میں نے کھوج لگائی۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ حسین رضا کو سلو پوائزن دیا جا رہا تھا۔ یہ لوگ ہمیں جاہل سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے سامنے زیادہ احتیاط نہیں برتتے۔ میں چونکہ ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا اس لیے میرے کانوں میں کچھ باتیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن جب ڈاکٹر نے انہیں انجکشن دیا۔ ان کی حالت بہت بگڑ گئی میں بڑے ڈاکٹر صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے کہا کہ ان کو کوئی غلط انجکشن دیا گیا ہے۔ انہوں نے فوراً ''ایکشن لیا۔ وہ ڈاکٹر جس نے یہ انجکشن لگایا تھا وہ پکڑا گیا۔ حسین رضا نے دے دلا کر معاملہ ٹھنڈا کر دیا اور حسین رضا کو وہاں سے لے گئے۔ مگر جلد ہی پتا چلا کہ ان کی موت واقع ہو گئی ہے۔ بس پھر ایک دن مجھے اٹھا لیا گیا اور پھر ساری عمر قید میں ہی گزر گئی۔ منتظر میاں۔ میں ہر دن منتظر رہا کہ کب میری موت کے احکامات جاری ہوں گے مگر شاید تقدیر بنانے والے نے مجھے زندہ رکھنا تھا یہ حقیقت آپ تک پہنچانے کے لیے۔ تب ہی زندہ بیٹھا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

اجنبیت کی سنگی دیوار ان کے بیچ حائل تھی۔ وہ بھی خود میں ہمت نہ پائی اس کو مخاطب کرنے کی۔ اس وقت بھی سر جھکائے اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا چپ چاپ بیڈ پر نیم دراز رہا۔ پھر ایک دم اپنا موبائل اٹھایا۔

"ہاں مسٹر حسین رضا!"

حیا نے چونک کر دیکھا۔

"بیٹا! ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟" حسین رضا کا لہجہ اپنائیت بھرا تھا۔

وہ طنزیہ ہنسا "اس لیے کہ کیا گارنٹی ہے میرے پاس کہ واپسی پر آپ مجھے قتل نہیں کروا دیں گے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ بے چین ہو کر بے ساختہ بول اٹھے۔ منتظر حسین نے دزدیدہ نظروں سے اسے گھورا۔

"بیٹا! کیا کہہ رہے ہو! تم میرے داماد ہو۔ میری بیٹی کا سہاگ۔"

"آپ جو اپنے سگے بھائی کو قتل کر کے اس کا زر، زمین اور زن ہتھیا سکتے ہیں تو داماد کا کیوں نہیں؟" وہ سختی سے گویا ہوا۔

"تم جو گارنٹی چاہو' میں دے سکتا ہوں۔" وہ نزع کے عالم میں بولے۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میرے وکیل سے بات کر لیں' جو کہے وہ مان لیجئے گا۔"

"کہ کیا۔ کیا بات؟" ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

"یہ کہ اگر منتظر حسین کسی بھی طرح کی حادثاتی موت کا شکار ہوا تو اس کے ذمہ دار مسٹر حسین رضا ہوں گے۔ کیونکہ منتظر حسین کو صرف شبہ ہی نہیں' یقین ہے کہ وہ اسے قتل کروا سکتے ہیں اور اگر موت طبعی ہو تو بھی مکمل پوسٹ مارٹم کیا جائے کہ کہیں اسے سلو پوائزن تو نہیں دیا گیا۔"

"میں تیار ہوں۔" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے کہا۔

"ٹھیک ہے میرا وکیل آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اسے اندر بلا لیں۔"

اس وقت حسین رضا کو لگا جیسے وہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر رہے ہیں۔ مگر اپنی جان سے عزیز تر بیٹی کو بچانے کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ صالحہ خاتون کی گود میں سر رکھے سر میں مالش کروا رہی تھی۔ جب اک نیا نمبر اسکرین پر دیکھ کر اس نے سیل فون واپس رکھ دیا اور پھر سے آنکھیں موند کر خالہ سے لاڈ اٹھوانے لگی۔ جب پانچویں بار کال آئی تو وہ جھنجلا اٹھی۔

"پتا نہیں کون ڈھیٹ ہے تھکتا ہی نہیں۔"

"ارے بیٹا! اٹھا لے گیا پتا کسی کو ضروری کام ہو۔" اس نے فون اٹھایا۔

"مس ماہم! میں منتظر بول رہا ہوں۔"

"سر آپ!" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔

"مس ماہم! وہ مہمان ہیں۔ میرے لیے بہت خاص، بے حد اہم، جب تک میں ان کے رہنے کا انتظام کروں، آپ ان کو چند دن اپنے فلیٹ میں رکھ سکتی ہیں؟"

"سر! یہ میرا فلیٹ کہاں ہے، آپ کا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کو زیادہ دن تکلیف نہ ہو۔"

"پلیز سر۔ میری ذات پر آپ کے جو احسان ہیں وہ عمر بھر نہیں اتار سکتی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح آ رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کل چھٹی کر سکتی ہیں۔"

"نہیں سر! اس کی ضرورت نہیں، گھر میں ماں اور خالہ ان کی مہمان داری کے لیے موجود ہوں گی۔"

"اوکے۔ اللہ حافظ۔"

"خیریت ہے خالہ! سر اپنے مہمانوں کو کسی ہوٹل میں بھی ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر بھیج رہے ہیں۔"

"ارے بیٹا! ہوگی کوئی مصلحت۔ اتنا بڑا فلیٹ ہے۔" ماں نے ٹوکا۔

خورشید اٹھ گئی۔ ان مہمانوں کی آمد کی تیاری بھی کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے ٹیکسی والے کو پتا سمجھا کر ماموں اور مخمل کو بھیجا۔ خود اس کی گاڑی میں آ بیٹھا۔

"پہلے آفس چلو۔" حیا نے اس کے تحکمانہ لہجے پر ایک لحظے کو اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کیا منتظر حسنین کے نرم لہجے کے لیے میں اب ترستی ہی رہوں گی۔ اس کا دل بھر آیا۔

"آپ گھر نہیں چلیں گے؟"

سر اٹھاتے خدشوں کو بے حد مشکل سے ہمت مجتمع کرتے زبان دی۔

"ابھی نہیں، شام کو آ جاؤں گا۔" وہ اس کے لہجے میں اپنائیت کو تلاشتی رہ گئی۔ مگر کوئی شائبہ تک نہ ملا۔ اس کے لیے نہ شہر اجنبی تھا، نہ ہی ساتھ بیٹھا شخص مگر اجنبیت کے لمبے سائے اس کی زندگی پر محیط ہو رہے تھے۔

اس لمحے وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ وہ انسان تھی، خدا نہیں اور انسان دنیا میں تنہا آتا ہے۔ تنہا جاتا ہے مگر دنیا میں تنہا نہیں جی پاتا۔

گھر پہنچی تو اس کے ماں باپ صدیوں کی پیاس لیے اس کی طرف بڑھے۔ مگر وہ ہر سوچ و احساس سے عاری تھی۔ ان کی کسی گرم جوشی کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ میری بیٹی گھر واپس آ گئی ہے۔" حسین رضا آبدیدہ ہوئے۔

"ہاں۔ مالک نے بڑا کرم کیا۔ احسان ہے خدا کا کہ آج زندہ سلامت اپنے جگر گوشے کو دیکھنا نصیب ہوا۔" حمیرا اس کا منہ چومتے بولیں۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا بیٹا! منتظر نے کوئی برا سلوک تو روا نہیں رکھا۔" حسین رضا بغور بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولے مگر حیا کی شکایتی نظروں سے گھبرا کر رخ پھیرا اور بے چین ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اس گندی عورت کے بیٹے نے میری پھولوں جیسی بیٹی کی زندگی زہر کر دی نا حسین رضا؟" حمیرا نے غصے سے شوہر کو مخاطب کیا۔

حیا نے اک نظر سر جھکائے باپ کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر شرمندگی غلطیوں کا پچھتاوا بن کر نمایاں تھی۔ پھر ماں کو دیکھا، جو بالکل پہلے کی طرح تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی شرمندگی اور پچھتاوا نہ پا کر اس کے اندر بھرا غصہ ابھر کر باہر آیا۔

"زندگی زہر تو آپ لوگوں نے میری کی ہے۔ آپ

کے گناہوں کا کفارہ اب ساری عمر مجھے ادا کرنا پڑے گا۔"

وہ کہتے ہوئے لاؤنج میں رکی نہیں۔ اپنے کمرے میں آگئی۔ جہاں ہر سو وحشت اور تنہائی بچھی ہوئی تھی۔

"زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔" حسین رضا نے ندامت و افسوس سے خود کلامی کی۔

☼ ☼ ☼

"سر! یہ فائلیں آپ کے دستخط کی منتظر ہیں۔" ماہم نے فائلوں کا ڈھیر اس کی میز پر رکھا۔

"ارے مس ماہم! آپ میرے منع کرنے کے باوجود آفس آگئیں۔" منتظر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سر! مجھے پتا تھا کہ آپ آفس کے معاملات کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے فائلوں پر دستخط کرتا رہا پھر بولا۔

"یہ فائلیں چھوڑ جائیں۔ میں ان کو دیکھ کر پھر سائن کروں گا اور یہ لے جائیں۔" اس نے دستخط شدہ فائلیں اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"جی بہتر سر!" وہ فائلیں اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اس نے نظریں اٹھائیں، ماہم کی پشت پر لہراتی لمبے بالوں کی چٹیا دیکھتے اسے اپنی ماں کے لمبے بال یاد آگئے۔ پہلے کالے، پھر سفید و کالے اور پھر سرخ بال مہندی سے رنگے۔

وہ برآمدے میں لکڑی کے تخت پر بیٹھی سلائی کرتی ماں کی پشت کی طرف لیٹ کر اس کی چٹیا سے کھیلتا رہتا۔ جو تخت پر گری رہتی۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنی چٹیا سے کھیلتے بیٹے کو سر گھما کر ترچھی آنکھوں سے دیکھتی۔

"ہے نا ملکوں کا خون، گھوڑے پر سواری کرنے والوں کا بیٹا۔ اب گھوڑے کی لگام نہیں، ماں کی چٹیا ہی سہی۔"

وہ مس کر کہتی۔

اس نے بہت آہستگی و نرمی سے اس دلکش یاد کو دل کے کونے میں بحفاظت رکھا۔

وہ مشکل سے اس کی بیٹی اور بیوی کو ڈھونڈنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اسے لے کر سیالکوٹ جانا تھا۔ جہاں اس کی سسرال رہتی تھی۔

آفس میں کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے حیا یاد آگئی۔ جو اسے فون کر کے لنچ پر گھر آنے کی یاددہانی کرا چکی تھی۔

"حیا حسین!" اس نے غصے سے لب بھینچے۔

دشمن کی بیٹی جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے باپ کے قاتلوں کی بیٹی۔ سر جھٹک کر اپنا سیل فون اور گاڑی کی چابی اٹھائی، باہر نکل آیا۔

"مس ماہم!"

"جی سر!" وہ مستعدی سے اٹھی۔

"آپ چل رہی ہیں۔ میں آپ ہی کے گھر جا رہا ہوں۔"

"جی ضرور سر!" وہ کھل اٹھی۔

"مجھے اپنے مہمانوں سے ملنا ہے۔" اس نے وضاحت دی۔

"میں جانتی ہوں سر۔ ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔"

اس نے مسکرا کر "اچھا" کہا۔ وہ فوراً "دام میں آیا۔

"ارے نہیں۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ آپ بلائیں تو میں ضرور آتا۔" اس نے رسماً کہا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس قابل جانا۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے مین روڈ پر لے آیا۔ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی رہی۔

"کاش! یہ بندہ ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے۔" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرا بند کیے بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جیسے

جیسے لنچ ٹائم قریب آرہا تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

وہ کتنی خوش اور مسرور تھی۔

وہ اس کو فون کرکے گھر آنے کو کہتی۔ وہ شوق سے پوچھتا۔

"آج میرے لیے کیا بنایا ہے۔"

وہ اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز بنا کر بیٹھی ہوتی' کبھی نام بتاتی' کبھی کہتی "سرپرائز ہے۔ خود آکر دیکھنا' کھانا' پھر تعریف کرنا۔"

وہ ہنس کر کہتا۔ "آتا ہوں۔"

ایک گھنٹہ اس کے ساتھ گزار کر وہ پھر واپس آفس چلا جاتا۔

شام کو آنے کے بعد وہ گھومنے نکل جاتے۔ ڈنر کبھی باہر کسی ہوٹل میں کرتے یا بابلی کے چلے جاتے مگر آج۔ ان کی جدائی کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔

"نہیں۔ وہ میری زندگی ہے۔ میں اسے خود سے الگ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ میرے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتا ہے۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

وہ بدیانی ہو گی۔ اس کا نمبر ملاتی رہی۔ آفس کا نمبر' سیل فون' ہر جگہ سے جواب ندارد۔

وہ میسج کرتی رہی۔

"میں کھانے پر تمہاری منتظر ہوں۔"

"میں تمہارے بغیر کھانا نہیں کھا سکتی۔ پلیز جلدی گھر آؤ۔"

"تمہیں پتا ہے میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

کتنے ہی میسج کر ڈالے۔ کوئی جواب نہ تھا۔ پتا نہیں وہ پڑھنے کی زحمت بھی گوارا کرتا ہے یا نہیں۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی' تو مگر کہاں

اس نے تھک ہار کر آخری پیغام بھیجا۔ آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے رہے۔

دروازے پہ ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ تیسری بار اسے لنچ کے لیے بلانے آئی تھی۔

"حیا بی بی! آپ کو بیگم صاحب۔"

"دفع ہو جاؤ۔ نہیں کرنا لنچ' جا کر بتا دو میری زندگی برباد کرنے والوں کو۔"

ڈائننگ ہال تک اس کی آواز کی گونج گئی تھی۔

حسین رضا اور حمیرا کے گلے میں نوالے اٹک گئے۔

کھانا ان کے لیے بھی زہر ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا فون بج رہا تھا۔ مسلسل پیغامات آرہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ حیا حسین اس کی منتظر ہے۔ حیا اس سے لاکھ محبت کا دعوے دار سہی' مگر تھی تو اس کے باپ کے قاتلوں کی اولاد۔ اس کی محبت اس احساس کے سامنے ماند پڑ جاتی۔ وہ اس کے بلاووں کو نظر انداز کرتے ناہم کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔

اندر کے منظر نے ان دونوں کو حیران کر دیا۔ بخشل اور حمیدہ ان کے گھر میں ایسے گھل مل کے بیٹھے تھے' جیسے ہمیشہ سے رہ رہے ہوں۔

"بیٹا! تو زبان کا دھنی نکلا' وعدہ کرتے ہی مجھے میری بیوی کے پاس پہنچا دیا۔" بخشل نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ حیرانی سے بولا۔

"یہ۔ یہ ہے نا میری بچی!" بخشل صدیوں کی پیاسی شفقت لیے ناہم کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ارے پاگل! یہ تیرا باپ ہے۔" اس کی ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے بخشل کے قریب کیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

وہ اس عجیب ڈھنگ سے حلیے والے آدمی کو فوری طور پر باپ کے روپ میں قبول نہ کر پا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا سر پکڑ کر ماتھا چوم رہا تھا۔ آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بچی۔" خوشی بخشل کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ارے بخشل! یہ تیری بچی تو لگتی ہی نہیں' ملکانی

لگ رہی ہے ملکانی۔" حمید نے خوشی سے قہقہہ لگایا۔
ماہم شرمندہ سی ہوگئی۔ مگر اک خواہش جو اندر کہیں چھپی ہوئی تھی۔ فوراً" سر اٹھانے لگی۔ اس نے بے اختیار منتظر حسنین کو دیکھا۔ جو اس دلچسپ منظر و مکالمے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"سر! آپ پلیز بیٹھے میں کولڈ ڈرنک لاتی ہوں۔" اس ماحول سے بھاگنے اور خود کو سنبھالنے کے لیے فوراً" بہانہ مل گیا۔

وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر ماموں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا تھا کہ مخشل کی بیوی بیٹی مل گئیں مگر ساتھ ہی اس احساس نے رنجیدہ کر دیا کہ اک باپ اپنی بیٹی کے لیے سالوں تک ترستا تڑپتا رہا تھا۔ حمیرا اور حسنین رضا سے شدید نفرت کا احساس گہرا ہوا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

رات گئے جب وہ گھر پہنچا تو حسنین رضا اور حیا کو جاگتے پایا۔

منتظر! کہاں رہ گئے تھے تم؟ کتنی دیر سے ہم انتظار کر رہے تھے۔" حیا کا لہجہ نم ہوا۔ حسنین رضا لاؤنج کے صوفے سے اٹھے۔

"ہاں بیٹا! میں بھی صبح سے آپ کا منتظر ہوں۔"

"کیوں؟" آنکھوں میں دیکھتے تلخی سے بولا۔

"مجرم ہوں تمہارا۔ معافی مانگنی تھی۔"

"معافی اس بات کی مانگی جاتی ہے، جس کی تلافی ممکن ہو۔" وہ چبا چبا کر گویا ہوا۔ دو قدم آگے چل کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"لا سکتے ہیں وہ پدرانہ شفقت جو مجھ سے چھین لی۔ کر سکتے ہیں میری ان محرومیوں کا ازالہ جو میری ماما رات دن سلائی کرتی، پھر بھی میری چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہی۔"

حیا نے آزردگی سے لب بھینچ کر آنکھیں موندیں۔

"بیٹا! جس کی تلافی ممکن ہو کر لینی چاہیے۔ تم اپنے ماموں کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔ میں مخشل کو بھی بھاری تاوان دینے کو تیار ہوں۔ مانتا ہوں میں غلطی پر تھا۔ مگر مجھے تم سے محبت ہے بیٹا! تم ہمارے ملکوں کے خاندان کے اکلوتے وارث ہو۔" وہ آبدیدہ ہوئے۔

"محبت؟" وہ لفظ چباتے سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

"محبت تو خود کو اور دوسروں کو جینے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ خوشی دے کر تحفظ فراہم کرتی ہے، مگر یہ کیسی محبت ہے مسٹر حسنین رضا۔ کہ میں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگا ہوں۔ ہر وقت اپنی موت کا خدشہ اور آپ کی سازشوں کا اندیشہ رہتا ہے۔"

"منتظر! تم سے محبت نہ کرتا تو تمہیں اپنا داماد کیوں بناتا۔ اپنی جان سے پیاری بیٹی تمہارے حوالے کیوں کرتا۔" وہ نرم لہجے میں ملتجی ہوئے۔

"خود غرض، لالچی اور حاسد لوگ محبت جیسے نرم و ملائم جذبے سے واقف ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کے پیچھے بھی کوئی چال ہوگی۔"

"یقین کرو بیٹا! میں تمہاری اور حیا کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"او سب کچھ! ویسے ہی نا جیسے اپنی اور حمیرا کی خوشیوں کے لیے کیا۔" وہ استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

حسنین رضا نے گہری سانس لے کر اپنی شرٹ کا گریبان والا بٹن کھولا۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ ان کی بیٹی سر جھکا کر بوجھل قدموں سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چند لمحوں تک اسے بیڈ پر جوتوں سمیت نیم دراز دیکھتی رہی۔ پھر دل مضبوط کر کے آ کر اس کے جوتے اتارے۔

وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو مشرقی بیویوں کی طرح یہ خدمت کے ڈرامے کر کے مجھے جیت لوگی؟"

اس نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا۔
"نہیں۔ محبت سے۔"
"محبت ہونہہ۔ تمہاری محبت اب میری نفرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" اس کے تضحیک آمیز رویے نے دل کو تڑپا دیا۔
"مجھے تم سے محبت ہے منتظر! مانا کہ تم رشتوں پر اعتماد کھو چکے ہو مگر دلاؤں گی تم کو رشتوں پر یقین۔" وہ اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
"تم مجھے کوئی یقین نہیں دلا سکتیں۔ کھو چکی ہو تم میرا اعتبار' اعتماد اور محبت۔" دونوں ہاتھ جھٹک کر ہٹا دیے۔
اس کے لہجے کی کڑواہٹ دل میں پیوست ہوئی۔ وہ بیڈ کے کونے پر ڈھے سی گئی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات کی بے چینی کے بعد اس نے اپنے اندر کے ٹکڑے جوڑے ریزہ ریزہ وجود کو مجتمع کیا اور بجھے من سے ناشتے کی تیاری میں مگن ہو گئی۔ اپنی نگرانی میں ناشتا بنوا کر ٹیبل پر لگوایا۔ پھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔
منتظر اٹھا تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ ساری رات اسے بے چینی میں نیند نہیں آئی تھی۔ ایسا لگا کہ جیسے حسین رضا اس کو قتل کرنے آ رہے ہیں۔ وہ چونک چونک کر اٹھتا' آنکھیں کھول کر دیکھتا۔ صبح کے قریب اسے گہری نیند آئی تھی۔ جاگا تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آیا تو ڈائننگ ٹیبل پر انہیں اپنا منتظر پایا۔
"آ جاؤ منتظر! ناشتہ کب سے تیار ہے۔" حیا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
وہ آہستہ روی سے چل کر ڈائننگ ٹیبل تک آیا۔ حیا کے پہلو میں بیٹھنے سے گریز کرتے عین سامنے والی کرسی سنبھالی۔ دونوں ہتھیلیاں ٹیبل پر جما کر حیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھکا۔
"ناشتے میں زہر ملا کر انتظار کر رہی ہو۔۔۔ ہے نا؟"

طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ حیا تاسف سے اسے دیکھ کر کرب کاٹنے لگی۔
"مارنا چاہتی ہو؟"
"میں تو خود محبت کے ہاتھوں مر گئی ہوں۔" اس کی آواز نم ہو گئی۔
حسین رضا کے چہرے پر دکھ امڈ آیا۔
حیا ٹیبل کی دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آئی۔
"میری رگوں میں تمہاری محبت دوڑتی ہے منتظر!"
"اور میری رگوں میں تمہاری نفرت۔۔۔ گھن آتی ہے مجھے تم سے' تمہاری محبت سے۔" بھنویں اچکا کے حیا کو گھورا' جو اس کے سامنے ایستادہ تھی۔
"اور تمہاری رگوں میں دوڑنے والے اس خون سے' جو تمہاری قاتل ماں کے ناپاک بطن سے تم میں منتقل ہوا۔"
حمیرا اٹھ کے میں کھڑی ہو گئیں۔ حسین رضا نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بھی بولنے سے منع کیا۔ حمیرا کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔
"ہنہ۔۔۔ تم قاتل کی بیٹی ہو۔ مجھے بھی قتل کرنا چاہتی ہو اپنی ماں کی طرح۔"
حیا کے آنسو اس کے گالوں پر رواں ہو گئے۔ وہ صرف دکھ سے نفی میں سر ہلاتی رہی۔
"مگر میں تمہیں یہ موقع کبھی فراہم نہیں کروں گا۔ میں۔۔۔ منتظر ہوں۔" اس نے اپنے سینے پر دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی رکھی۔ "حسین رضا نہیں کہ بے خبری میں مارا جاؤں۔" وہ نفرت سے کہتا باہر نکلا۔
"ہمیں۔۔۔ اس کی اوقات کیا ہے' جو یوں ہمیں بے عزت کر رہا ہے۔" پیچھے سے حمیرا کی دھاڑ سنائی دی۔
"اس کی اوقات یہ ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کا شوہر ہے۔"
حسین رضا نے حمیرا کو جواب دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

آفس میں اس کا دل آج بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ناشتا بھی نہیں منگوایا۔ وہ کبھی ٹہلتا' کبھی کرسی پر جھولتا رہا۔ اس کے اندر جیسے آگ بھری تھی۔ جو اسے جلا رہی تھی۔ بے سکون کر رہی تھی۔ وہ فرار چاہتا تھا۔ ان حالات اور اپنی حالیہ زندگی سے۔

"السلام علیکم سر!"

اس نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی ماہم کو دیکھا۔

"کیسی ہیں مس ماہم؟" چاہنے کے باوجود وہ مسکرا نہ سکا۔

"بالکل ٹھیک سر! مگر لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کا ساتھ رہا تو میری طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

"جی سر!" وہ ٹھٹک گئی۔

"آپ کیسی میزبان ہیں؟" اس نے بے وجہ بات بڑھائی۔

"یہ تو آپ اپنے ماموں سے پوچھیں؟" وہ کھلکھلائی۔

"وہ تو بہت خوش ہیں آپ کی میزبانی سے' تھوڑی دیر پہلے ہی بات ہوئی ہے فون پر۔"

"پھر تو میں اچھی میزبان ہوئی نا سو!" وہ خوش ہوئی۔

اس کی بات پر وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ کسی حد تک وہ ذہنی دباؤ سے باہر آیا۔

"چلیں تو پھر ناشتا منگوائیں' آج ناشتا کر کے نہیں آیا۔ اصل میں آنکھ ہی دیر سے کھلی۔ اس وجہ سے۔" اس نے خوامخواہ وضاحت دی۔

☼ ☼ ☼

"ماموں! گھر جانے کو دل نہیں کرتا۔ بحالت مجبوری جاتا ہوں۔" وہ حمید ماموں کے پاس بیٹھا تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے؟" حمید نے ڈرائنگ روم میں اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھے مظفر کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"دعوے تو بہت بڑے بڑے کرتی ہے۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"دعوے تو کرے گی نا بیٹا جانی! تاکہ تم بے وقوف بنے رہو اور وہ اپنی ماں کی طرح تمہارا کام تمام کر دے۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نفرت سے بولے۔

مظفر کو حیا کی باتیں یاد آئیں۔

حمید نے سوچ میں ڈوبے مظفر کو دیکھا۔

"تم اپنی نفرت پر قائم رہنا۔ مت بھولنا کہ وہ تمہارے باپ کے قاتلوں کی بیٹی ہے۔ سمجھو قاتلوں کی جان تمہارے قبضے میں ہے۔ اب تو حساب چکانے کا وقت آیا ہے۔"

مظفر کے اعصاب تن گئے۔ لب بھینچ کر اس نے غصے کو روکا۔

"انتقام لو اپنی ماں کی دربدری کا۔ اپنی عمر بھر کی محرومیوں کا' میری لور ہنستیل کی قید کا اور سب سے بڑھ کر اپنے باپ کے قتل کا۔"

حمید کا اک اک لفظ اس پر پوری شدت سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ماموں ہی نہیں محسن بھی تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے بہت جنوں ہے اس کا

یہ شعر بار بار سسکی بن کر اس کے لبوں پر مچلتا تھا۔ سارا دن گزر گیا' شام سے رات ہو گئی۔ وہ مظفر کی منتظر ہی رہی۔

اس نے نہ دن کا کھانا کھایا تھا' نہ شام کی چائے پی تھی۔ عجیب چڑچڑاپن اس کی طبیعت پر وارد ہو جاتا۔ جب حمیرا اس کو کچھ کھانے پینے کو کہتیں۔ وہ مظفر کو دل ہی دل میں کوستی رہیں۔ چچی کے سامنے کہنے کی ہمت نہ کر پائیں۔

وہ فون کرتی تو بند' میسج کا جواب نہ آتا۔ آفس کے فون سے "آدھے دن تک۔

"سر اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔" کا جواب۔

وہ پھر کو کرتی تو۔ "سر آفس سے چلے گئے ہیں۔" کا جواب جان جلا رہتا۔ چار دن گزر گئے تھے۔ اس نے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ رات دیر تک لان میں اس کا انتظار کرتی۔ وہ مبارک گھڑی تھی کہ وہ آیا تھا مگر اس کو نظر انداز کر کے وہ تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ کے بغیر چار دن چار صدیوں سے کم نہیں تھے۔ آپ کو پتا ہے میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

"نہیں رہ سکتیں تو رہنا سیکھ لو۔" وہ غصے سے پلٹا۔

"ہر وقت قید کا سا احساس رہتا ہے مجھے۔ میں یہاں نہ اپنی مرضی سے سو سکتا ہوں۔ نہ اٹھ سکتا ہوں' نہ کھا سکتا ہوں' نہ پی سکتا ہوں' تم مسلط ہو کے رہ گئی ہو مجھ پہ۔ کیوں؟ کیا میں تمہارا غلام ہوں' یا تمہارے باپ کا۔"

تلخ لہجے پر اس کا دل لہو بن کر آنکھوں میں دوڑنے آیا۔

"معذرت۔" اس کے لب ہلے۔

"یہ جو اس بند کمرے میں کچھ بھی سننے کی گنجائش نہیں اور ہاں' یہ ڈھکوسلے مت کیا کرو میرے سامنے۔ پوری حمیرا لگتی ہو' گور' بے بار۔"

وہ اس کے ماں' باپ کا ذکر ہتک آمیز انداز میں کرتا۔ مگر وہ یہ بھی برداشت کر جاتی کہ شاید اس کا غصہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ اک امید کا دیا دل کے دوار روشن رہتا۔

☼ ☼ ☼

"یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے شادی کے بعد خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔" وہ بابل کے پیس میں بیٹھا تھا۔ ماہم انہماک سے سنتی کھانے کے ساتھ مکمل انصاف کر رہی تھی۔ اس کی اس بات پہ اس کے دل میں مایوسی اتری۔ وہ دونوں ایک مشہور ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

"مگر یہ اس سے بڑی حقیقت ہے کہ اب میں خود کو بدنصیب ترین انسان تصور کرتا ہوں۔ میری بیوی وہ ہے کہ جس کے ماں' باپ نے میرے باپ کو قتل کیا۔ میری ماں پر رکیک الزامات لگائے۔ مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔" اس کے لہجے میں دکھ' پھر غصہ نمایاں ہو کر ابھرا۔ ماہم نے اس کی بات پر خوشی بھری سانس لی۔ اسے جیسے ڈھارس مل گئی۔ یک گونہ اطمینان اس کے رگ و پے میں امڈ آیا۔

اسے یک دم سب کچھ زہر لگنے لگا۔ پلیٹ اپنے آگے سے کھسکا کر ٹشو سے ہاتھ پونچھے۔

"زندگی کی ساری آسائشیں' سہولتیں جو مجھے مل سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے مجھ سے چھین لیں۔ میں ان کی بیٹی کو اپنی بیوی' اپنی شریک زندگی کیسے تسلیم کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک۔ اک بات کہوں سر! اگر آپ برا نہ مانیں تو؟" اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شیور۔ ضرور کیوں نہیں۔ آپ تو اس شخص کی بیٹی ہیں۔ جس نے مجھے حقیقت سے آشنائی دی۔ آپ کی کوئی بات مجھے بری نہیں لگے گی۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔

"آپ اگر ان سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ تو انہیں اپنی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتے؟" اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"بس فی الحال کچھ مجبوریاں ہیں۔ جب شادی ہوئی تو مجھے حیا کی جائیداد کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اس لیے اس معاہدے کا تفصیلی جائزہ لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔ جو حسین رضا نے حیا اور میری شادی کے وقت کروایا تھا۔" اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔

"ہمارا وکیل بیرون ملک گیا ہوا ہے۔ جیسے ہی آئے گا میں اس سے' معاہدے اور طلاق کے بارے میں بات کروں گا۔"

ماہم کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ قدرت اس کے راستے کی رکاوٹ دور کرنے کا خود ہی بندوبست کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا وہ مجھے قبول کریں گے؟" بالکونی میں کھڑی جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ منتظر میرے حواس پر چھا گئے ہیں۔ پتا نہیں مجھے ان سے محبت ہو گئی ہے یا اپنی دربدری' ناآسودگی' احساس محرومی کو ختم کرنے کا اک وسیلہ سمجھ بیٹھی ہوں یا ناتمام خواہشات ان کی ذات سے پوری کرنا چاہتی ہوں۔

اس نے گہری سانس بھر کر اڑتی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"کچھ بھی ہو' ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے لیے بے حد ضروری ہو گئے ہیں۔ اتنے ضروری کہ مجھے لگتا ہے اگر وہ نہ ملے تو میں ادھوری رہ جاؤں گی' مگر کیا وہ مجھے قبول کریں گے؟"

کئی دن کا سوال جو اندر ہی اندر کھٹک رہا تھا۔ پھر اپنی جگہ آموجود ہوا۔ مانا کہ انہوں نے بھی کسمپرسی کی زندگی گزاری ہے۔ محرومیوں میں پلے بڑھے ہیں۔ مگر پھر بھی ہے تو ملکوں کا خون اور میں ان کے باپ کے نوکر کی بیٹی۔

وہ مایوسی سے نفی میں سرہلاتی رہی۔ یہ سوچ اس کے پورے وجود کو نڈھال کر رہی تھی۔ کیا وہ یہ طبقاتی فرق مٹانے کو تیار ہو جائیں گے۔ وہ تو اتنی بڑی بیٹی کے بعد اب بھی ملک منتظر حسین ہیں اور میں اپنے باپ کی طرح ان کی ملازمہ۔ اک سوال تھا جو بیچ دھارے بیچ اٹکی ہے۔

"یا اللہ منتظر کو مجھے دے دے۔" اس نے دل سے دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے پچھلے پہر کا سناٹا' صرف اس کمرے میں ہی نہیں اس کے دل میں بھی موجود تھا۔ اس کا ہم سفر ہم نشین' شریک حیات' اجنبیت اوڑھے سو رہا تھا۔

وہ جو محبت میں یک جان بننے کی چلہ کشی تھی۔ جب دوری ختم ہوئی تو نتیجہ دوئی کی صورت نکلا۔

دوئی بھی ایسی جہاں ایک ہی بستر پر صدیوں کا فاصلہ سمٹ آیا۔ اس نے اپنا دم گھٹتا سا محسوس کیا۔ وہ آہستگی سے اٹھی۔ اس کے پاؤں ابھی زمین پر جمے بھی نہ تھے کہ منتظر نے سرعت سے اٹھ کر اس کا بازو پکڑا۔ اس نے حیرانی سے منتظر کو دیکھا۔ جو اس کا بازو سختی سے پکڑے ہانپنے والے انداز میں اسے دیکھتا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بے یقینی میں ڈوبی آواز میں غصہ نمایاں تھا۔

"دم گھٹ رہا تھا' باہر لان میں جا رہی تھی۔"

"بہانے بناتی ہو مجھ سے' جھوٹ بولتی ہو۔ مارنا چاہتی ہو نا مجھے' بولو۔ بولو۔"

اس نے شانوں سے پکڑ کر حیا کو جھنجوڑا۔ حیا کو اس وقت وہ پہلے والا سلجھا ہوا منتظر نہیں لگتا تھا۔ وہ بالکل ابنارمل لگ رہا تھا۔

"عجب جینے کی جستجو زندگی کی لگن عروج پر ہو۔ تب بھلا کوئی کیسے آپ کو بھی مار سکتا ہے۔ منتظر!" حیا کے لہجے میں رنج و الم کا ہجوم سمٹ آیا۔

"غلط۔ غلط۔ غلط۔" وہ پرزور انداز میں گویا ہوا۔ "نہیں تمہاری جینے کی جستجو ہوں' نہ زندگی کی لگن۔"

"آپ میرا سب کچھ ہیں۔" اس نے "سب کچھ" پر زور دیتے کہا۔

"میں نے تمہاری سازش ناکام بنادی ہے۔ تب ہی ایسا کہہ رہی ہو نا؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"ناگن کی بیٹی ناگن ہی ہوتی ہے۔ زہر تو تمہاری سرشت میں ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔ "ڈسنا چاہتی ہو مجھے' ہرانا' جھکانا چاہتی ہو نا؟" سوالیہ' کڑی نگاہوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

حیا کا دل کٹ مرنے کو چاہا۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تیزی سے بھیگتا جا رہا تھا۔ منتظر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ناکامی پر رو رہی ہو؟"

☼ ☼ ☼

"تم ماہم سے شادی کر لو۔" ایک دم سے' بنا کسی تمہید کے حمید ماموں کے اس مشورے پر وہ خاموشی سے ماموں کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں بری لگی میری بات۔" حمید ماموں سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

وہ روز ماہم کو ڈراپ کرتا' چند گھنٹے ماموں کے ساتھ گزارتا' کبھی رات کو وہیں رہ جاتا' کبھی واپس گھر جاتا۔

"نہیں بری تو نہیں لگی۔"

"وہ دائن کی بیٹی تو تمہارا گھر بسانے سے رہی' جہاں تمہیں نیند بھی اس خوف سے نہیں آئی کہ کہیں سوتے میں قتل نہ کر دیے جاؤ۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو برخوردار!" ماموں نے شانے پر تھپکی دی۔

"ماموں! میں دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ سارے بزنس سرکل میں یہ خبر پھیل جائے کہ حسین رضا کے داماد نے دوسری شادی کر لی۔" وہ مختتم لہجے میں گویا ہوا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ حسین رضا کی بیٹی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔" حمید ماموں خوشی سے بولے۔

"اب دیر کس بات کی؟" ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ فوراً اس کی شادی کر دیں۔

"بس ماموں! وکیل سے وقت لیا ہے' آنے والا' انتظار ہے۔ فیصلہ کو لے کر چھٹیوں پہ وہ ملک گیا ہوا ہے۔"

"وہ کس لیے؟" انہوں نے بھنویں سکیڑ کر حیرت سے پوچھا۔

"دراصل میں شادی کے وقت حسین رضا نے ایک معاہدہ کروایا تھا۔ اس وقت میں نے سرسری دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اب یہ فیصلہ کرتے وقت میں تفصیل سے وہ معاہدہ وکیل سے لے کر پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ پھر بہتر حکمت عملی سے سارے کام سرانجام دے سکوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔ یہ تو بڑی عقل مندی کی بات ہے بیٹا!"

☆ ☆ ☆

"سر! بیرسٹر وقار احمد آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اندر بھیجو۔"

"السلام علیکم مسٹر مختطر حسنین!" اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"وعلیکم السلام! بڑے دن لگا دیے وکیل صاحب!"

"بس کیا کریں مختطر صاحب! اس دوڑتی بھاگتی زندگی سے بمشکل کچھ وقت چرا کر فیملی کے ساتھ گزارے ہیں' ورنہ کراچی کی مصروف زندگی تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

"جی ہاں بیرسٹر صاحب! آخر بڑے شہروں کے بڑے لوگوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔" وہ دانستہ کہہ بیٹھا۔ وکیل صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"وہ بس' کیا ہوا؟ کلائنٹ نے بتایا کہ آپ ایگریمنٹ کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ فائل ہے۔" انہوں نے فائل اس کے سامنے رکھی۔

"یہ معاہدہ باہمی رضا مندی کے ساتھ حیا حسین بنت حسین رضا اور مختطر حسنین کے درمیان ہے۔ دونوں فریق حیا ٹیکسٹائل مل کے برابر کے شریک ہوں گے۔ دونوں فریق شریک حیات بن کر ساری عمر ایک دوسرے کے ساتھ محبت' عزت سے نبھائیں گے۔ ان میں سے اگر کوئی بھی فریق اس رشتے کو توڑنے یا علیحدگی کی صورت میں اپنے فلفٹی پرسینٹ شیئر فریق ثانی کو دینے کا پابند ہو گا یا ہو گی۔ علاوہ ازیں یہ کانٹریکٹ حیا حسین کی مرضی و منشا کے مطابق ہو گا۔"

نیچے اس کے دستخط موجود تھے۔

اس نے تب دستخط کرتے ایک نظر بھی معاہدے پر ڈالنا گوارا نہ کی تھی۔

غصے سے اس کی کنپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔ بوڑھے نے جال بچھایا' وہ اس میں پھنس گیا۔

"بیرسٹر صاحب! کوئی ایسی صورت جس میں علیحدگی کے بعد بھی مجھے اپنے فلفٹی پرسینٹ شیئر سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہے' اگر حیا حسین خود آپ کو فلفٹی پرسینٹ شیئر ز دے دے۔"

"میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے قلم کو ہاتھوں کی دونوں انگلیوں میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"اس کی اجازت بھی تحریری طور پر حیا حسین سے لینی پڑے گی۔" بیرسٹر نے سگار کا کش لگایا۔

"بیرسٹر صاحب! میں آپ کو منہ مانگی رقم دوں گا کوئی حل نکالیں آپ 'ایگریمنٹ کو ادھر ادھر کریں' کوئی تبدیلی وغیرہ۔" وہ پریشانی سے بولا۔

"مظفر صاحب! یہ معاہدہ ہمارے پورے پینل کے پاس ہے' صرف میرے پاس نہیں اور آپ دونوں قانونی طور پر ایک دوسرے کی املاک کے وارث ہیں۔ ذاتی اور کاروباری زندگی میں ایک دوسرے کی رضا مندی کے قانونی محتاج۔ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو صرف آپ کی مسز ہی کر سکتی ہیں۔ آپ اپنی وائف کو راضی کریں۔"

"اب مجھے پھر اس ڈائن کی بیٹی کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑے گا۔" اس سوچ کے آتے ہی اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

وہ تیزی سے سیل اٹھا کر باہر نکلا۔

"سر! یہ فائل؟" ماہم جو اندر آرہی تھی اسے یوں باہر جاتے دیکھ کر ٹھٹکی۔

"یہ رکھ دیں۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔"

ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ حسب معمول ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال کر اس نے ماہم کے لیے اگلا دروازہ کھولا اور تیزی سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ رخ ماہم کے فلیٹ کی طرف تھا مگر وہ سارے راستے خاموش رہا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اس کے چہرے کے تناؤ کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"عیاری تو دیکھو حسین رضا کی۔" بخشل بولا۔ وہ سب سر جوڑ کر اس مسئلے کو سلجھانے بیٹھے۔

"مگر تم دست بردار ہو جاؤ' تو تمہارے پاس کتنے اثاثے ہیں؟"

"ماموں! سارے اثاثے ان ہی کے ہیں میرے پاس اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں صرف ایک کروڑ ہیں۔" وہ بے دلی سے بولا۔

"یہ فلیٹ؟" بخشل نے سگریٹ کا دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ان ہی کا۔"

"گاڑی؟"

"ان ہی کی۔"

"برخوردار! انہوں نے تمہیں بالکل ہی خالی ہاتھ اور اپنا دست نگر رکھا ہے۔ لیکن فکر کی بات نہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ ماموں کو بغور دیکھنے لگا۔

"میرا بیٹا دشمن کی بیٹی کی زندگی ہے' مر جائے گی اس کے بغیر۔"

ماہم کو لگا جیسے کسی نے دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو' گی بھر کے بے حال ہوئی۔

"اس کی محبت سے فائدہ اٹھاؤ۔ نفرت بھی اپنے ساتھ باندھ کے رکھو' اور اپنے بھی سارے کام نکالتے رہو۔" حمید کا انداز رازدارانہ رہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے' آزماؤ اس کی محبت کو۔" بخشل جذباتی ہوا۔

"پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں بیٹا!" حمید نے اس کا کاندھا تھپکا۔

"آج کھانے میں کیا بناؤں۔" خورشید نے روز کا مسئلہ سامنے رکھا۔

"ارے یہ اپنے بچے جا رہے ہیں نا' خود کھا کر آئیں گے' ہمارے لیے لے کر آئیں گے۔" بخشل ہنسا۔

"بس جلدی آنا۔ زیادہ بھوک برداشت نہیں ہوگی۔" حمید نے خوش ہوتے کہا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ہے یار! کمرا نشین ہو گئی ہو' کال ریسیو نہیں کرتیں' فون کرو تو ملازمہ جواب دیتی ہے۔ بی بی تو اپنے کمرے میں ہیں۔" مہرین کمرے میں داخل ہوتے ہی

کی شکوے بیٹھی۔ وہ خاموشی سے غائب دماغی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا؟ منتظر بھائی کے ساتھ کوئی ٹینشن چل رہی ہے۔ آنٹی بتا رہی ہیں، وہ چند دن سے گھر بھی نہیں آئے۔"

اس کا دل بھر آیا۔ چاہنے کے باوجود بھی جواب نہ دے سکی۔ اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"تم نے بلایا؟ فون پر بات ہوئی؟"

"کئی بار... فون اٹھاتا ہی نہیں۔" گلے میں پھر کچھ اٹکا۔ آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ ہر منظر دھندلا گیا۔ مہرین نے اس کے ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔

"مردوں کی عادت ہوتی ہے ادھر ادھر منہ مارنے کی، سنبھل جائے گا، حوصلہ رکھو۔"

"تمہیں شاید حقیقت کا علم نہیں۔"

"ارے سب علم ہے۔ چھوڑو یہ رونا دھونا۔ اٹھو فریش ہو جاؤ، کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا مہرین۔"

اسے پانا اسے کھونا، اسی کے ہجر میں رہنا یہی گر عشق ہے محسن، تو ہم تنہا ہی اچھے ہیں

اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔

حیا کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ مہرین نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"چلو اٹھو، تمہارا موڈ بہتر ہو جائے گا۔"

وہ باہر نکل آئیں۔ آرڈر دے کے چاروں طرف جائزہ لینے کے لیے نظریں گھمائیں۔ مگر نظر نے لوٹنے سے انکار کر دیا۔

مہرین نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔

"وہ!" اک گہری سانس خارج ہوئی۔

"ان کو میں ایک بار گاڑی میں بھی دیکھ چکی ہوں۔ میں سمجھی کہ منتظر بھائی اپنی رحم دل طبیعت کی بنا پر ماہم کو گھر ڈراپ کرنے جا رہے ہیں۔ مگر بات شاید اور ہے۔"

کتنا اذیت ناک منظر تھا۔ وہ جس دیوتا کی پجارن تھی۔ وہ دیوتا کسی اور کے ساتھ تھا۔ کتنا خوش نظر آ رہا تھا ماہم کے ساتھ۔ ہشاش بشاش، باتیں کرنے میں مگن بیٹھا تھا۔

مہرین نے اس کے زرد پڑتے وجود کو دیکھا۔

"خود کو سنبھالو حیا! بعض دفعہ زندگی میں بہت تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب سہنا پڑتا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔" اس نے منتظر سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے حیا کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔

اسے لگا جیسے وہ مردہ وجود کو گھسیٹتی جا رہی ہے۔

"تو یہ طے ہے منتظر حسنین کہ اب تم میری طرف نہیں لوٹو گے۔"

☼ ☼ ☼

رات صعوبت رہی تھی اور وہ فراقِ یار میں گھل رہی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، لاڈ اٹھواتے اٹھواتے اسے بڑا کیا۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی کے دور سے گزر کر وہ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ رہی تھی۔ جب حسین رضا نے اس کے نام پر ٹیکسٹائل مل لگانے کا منصوبہ بنایا اور اچانک اک دن پاپا منتظر حسنین کو لے آئے۔

"یہ بڑا قابل اور محنتی نوجوان ہے۔ میں نے ابھی سے مل کی جی ایم کی پوسٹ پر اپائنٹ کر لیا ہے۔ سارے تعمیراتی کاموں کی نگرانی بھی اس کے ذمے ہو گی۔"

اس پہلی ملاقات نے اس پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا سب کچھ لے گیا۔ محبت کا اک اک لمحہ احساس کے کواڑوں سے جھانک رہا تھا۔

جب سے مہرین اس کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔

آدھی رات کو دروازہ کھلا۔ وہ اندر آیا۔ اچھی طرح سے لاک لگایا، پلٹا، اس کو نظر انداز کر کے واش روم میں چلا گیا۔ چینج کر کے آیا تو پہلی بار اس کو غور سے دیکھا۔

"تم یوں بیٹھ کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
وہ پلٹ کر اس کی طرف آیا' ٹھوڑی سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"تم سمجھتی ہو کہ میں متاثر ہو جاؤں گا کہ میری مشرقی بیوی رات گئے میرے انتظار میں جاگتی رہتی ہے۔ خام خیالی ہے تمہاری۔" وہ چبا چبا کر بولا۔
اس کی آنکھیں نئے سرے سے مرچوں سے بھر گئیں۔
"یہ۔۔ یہ آنسو مجھے موم نہیں کر سکتے۔ بند کرو یہ ڈراما۔" اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا شہر دل لٹ چکا تھا۔
نہ چاہتے ہوئے بھی گھٹی گھٹی سسکیاں اس کے بے آواز چیخوں میں شامل ہو گئیں۔
"مختصر پلیز۔ میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر ایک بار پھر بھیک مانگی۔
"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر' تمہارے ماں باپ پر اور اس گھٹیا بندھن پر۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے اپنا بازو چھڑا کر اسے دھکا دیا وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ زمین کے اوپر جا گری۔
اس کی محبت بھری جھولی کو نفرت کا سیم و کلر چاٹ رہا تھا۔ دل بنجر بن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت خوش تھی۔ آج اس کی سنگت میں خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔
وہ سونے کے لیے لیٹی تھی۔ اس کے سیل پہ بیل ہوئی۔ اس نے فوراً" اٹھایا۔ مبادا مختصر نہ ہو مگر اسکرین پر مہرین کا نام آرہا تھا۔
"ہیلو۔ السلام علیکم مہرین! کیسی ہیں؟"
"کیسا ہونا چاہیے؟" چبھتا ہوا لہجہ۔
"جیسی ہمیشہ ہوتی ہیں' زندہ دل' خوش مزاج' خوش باش۔" یاسمین ہنسی۔

"تو تم اب بھی مجھ سے یہی توقع رکھ رہی ہو۔"
"کیا مطلب؟"
"جان بوجھ کر انجان نہ بنو؟"
"یقین کریں۔ مہرین میں نہیں سمجھی۔"
"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"
"کیا کہہ رہی ہو؟ کون سی امید؟ میں واقعی نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔"
"سمجھ بھی کیسے سکتی ہو' جھونپڑی سے اٹھ کر محلوں کے خواب جو دیکھ رہی ہو۔"
"پلیز الزام تراشی مت کریں۔"
"میں نے تمہیں آج خود مختصر بھائی کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھا ہے۔ تم۔ اس کی معمولی سی ملازمہ۔ آخر کس حیثیت سے اس کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہو۔"
"زبان سنبھال کر بات کریں مہرین!"
"ڈستا ہے' تم نے اپنی محسن کو ڈسا ہے' جس نے میرے صرف ایک بار کہنے پر تمہیں فوراً" جاب دی۔ کتنی کم ظرف ہو تم۔"
"جی حیا اور ان کے والدین کا ظرف بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔" یاسمین کا لہجہ طنزیہ ہوا۔
"تمہارے جیسے کمین لوگوں سے یہی توقع رکھی جا سکتی ہے۔" مہرین کی طیش بھری آواز ابھری۔
"یاد رہے مختصر بھی اک کمین عورت کا ہی بیٹا ہے۔ جسے حیا نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔"
"ہاں تب ہی بھگت رہی ہے وہ۔"
"مہرین صاحبہ وہ صرف اپنے والدین کا کیا بھگت رہی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دے کر سیل ہی آف کر دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے سے قطرے نمودار ہوئے۔ اب کیا ہوگا۔ اس کی نیند اک بار پھر اڑ گئی۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

صبح رات کا بو جھل پن لیے نمودار ہوئی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز شاید ساری رات روتی رہی تھی۔ اک گھنے

کے لیے اسے اس پر ترس آ گیا۔ پھر فوراً" جھٹلایا۔

"ڈائن کی بیٹی ڈائن۔"

حیا کی مندی آنکھیں کھلیں تو نظر اس کی پشت پر پڑی۔ دھڑام سے دروازہ بند ہوا۔ وہ بوجھل دل بوجھل وجود' بوجھل آنکھیں لیے فوراً" اٹھی۔ اس کے پیچھے لپکی۔

"مستنصر! ناشتہ!"

اس کی آواز پر وہ رک کر پلٹا تو سامنے سے ناشتے کے لیے آتے حمیرا اور حسین رضا کو دیکھا۔

حمیرا کو دیکھتے ہی اس کے اندر سے لاوا ابل پڑا۔

"او رات کے ڈنر سے سیرابی نہیں ہوئی۔ ابھی ناشتے کی بھی ضرورت ہے۔" وہ دل جلانے والی مسکراہٹ سے اس کے سامنے آیا۔ اس نے گھبرا کر سامنے کھڑے ماں' باپ کو دیکھا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو ہماری بیٹی کے ساتھ؟" حمیرا بپھریں۔

"جیسا آپ نے میرے باپ کے ساتھ کیا تھا' ویسا ہی۔" اس نے حمیرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزیہ کہا۔

"ہم نے تمہارے باپ کے ساتھ کچھ نہیں کیا' جو کیا تمہاری ماں نے کیا۔"

"بکواس بند کرو مکار عورت۔" وہ دھاڑا۔

"ہمارے گھر میں بیٹھ کر' ہمارا کھا کر ہم پر دھاڑتے ہو۔" حمیرا چیخیں۔

"اور تم لوگ جو سالوں تک میرے باپ کی جائیداد ہڑپ کر کے بیٹھے ہو' تمہاری رگوں سے کھینچ کے نکالوں گا اپنی جائیداد۔"

"کنگلے! تھا کیا تمہارے پاس' گلے پڑ گئے ہو ہمارے۔"

"حمیرا بیگم! یہ مل میرے باپ کی جائیداد سے بنی ہے۔ احسان نہیں کیا آپ نے۔ نہ مجھے بخشش میں دی ہے۔" وہ حسین رضا کے مدمقابل آیا۔ "یہ میرا حق ہے۔ وہ حق جو آپ نے میرے باپ سے چھینا تھا۔"

"افسوس ہو رہا ہے اس دن کو جب تمہیں داماد بنانے کی پیش کش کی تھی۔ سوچا بھتیجا ہے' زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے' مگر تم تو انتہائی محسن کش نکلے۔" ان کے لہجے میں افسوس' دکھ' کیا کچھ نہ تھا۔ وہ دل کھول کر طنزیہ ہنسا۔

"بھول گئے مسٹر حسین رضا! کہ ہر بازی پلٹنے والا اوپر بیٹھا ہے۔" انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ "آپ جیسوں کو مکافات عمل سے گزارنے والا۔ آپ چاہیں تو بھی اس سخت پکڑ رکھنے والے کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے' بس کبھی وہ خود پکڑ لیتا ہے۔ کبھی کسی انسان کو وسیلہ بنا دیتا ہے۔ پکڑنے کا بہت برے پھنسے ہیں حسین رضا! چاہیں بھی تو اپنی گردن نہیں چھڑا سکتے۔"

حیا تو سکتے میں تھی۔ حسین رضا اور حمیرا پر بھی سناٹا طاری ہو گیا۔ حقیقت کے ڈر نے ان کو لرزا دیا۔ مستنصر حسین سرعت سے باہر نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح تک ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ آفس پہنچتے ہی اس نے پیون سے سر کے آنے کا پوچھا۔

"صاحب ابھی نہیں آئے۔"

جب سے اس نے جوائن کیا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنا لیٹ ہو گیا ہو۔ وہ لیٹر ٹائپ کر کے منتظر کی منتظر تھی۔

ٹھیک دس بجے وہ آفس میں داخل ہوا۔ وہ فوراً" اس کے پیچھے لپکی' خاموشی سے فائل اس کے سامنے رکھ کر پلٹی۔ مستنصر نے اک سرسری نظر فائل پر ڈال کر اس کو پکارا۔

"مس ہاشم!" وہ دروازے سے باہر نکلتے نکلتے رکی۔

"ادھر آئیے۔" وہ آہستگی سے واپس مڑی۔

"بیٹھیے۔" تحکمانہ لہجہ۔

اس نے اک نظر مستنصر کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر غصے کی لہر ابھر آئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" کاغذ ہاتھ میں اٹھا کر لہرایا۔

"میرا ریزائن سر!"

"کیوں؟"

"سر! ہمیں رات ڈنر کرتے آپ کی وائف اور مہ بین نے دیکھ لیا۔"

"مجھے پتا ہے اس بات کا۔" اس نے بیچ میں اس کی بات کاٹی۔ "پھر۔" سوالیہ نگاہیں اس پر مرکوز کیں۔

"سر! جو ملازمت دلوا سکتے ہیں' وہ نکلوا بھی تو سکتے ہیں نا؟" اس کے بجھے بجھے سے لہجے پر وہ مسکرایا۔

"یقیناً" ملازمت دی ان کی مرضی سے تھی۔ مگر نکالوں گا اب اپنی مرضی سے۔ اطمینان رکھیے! اب اگر نکلیں گے تو اکٹھے ہی نکلیں گے۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔

ماہم کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔

"رات میں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ لیں۔ اسی لیے صف ماتم بچھی ہوئی تھی ان کے ہاں۔" وہ محظوظ ہو کے ہنسا۔

☼ ☼ ☼

تم جو کہتے ہو کہ کیوں ہوتے ہو اس بن بے چین
اے ناصح! تنگ نہ کر بس کہہ جو بیٹھا ہوتے ہیں

پورے تین دن ہو گئے تھے اسے غم زدہ ہوئے۔ وہ حسب معمول اس کا فون اٹینڈ کر رہا تھا' نہ میسج کا جواب دے رہا تھا۔

وہ کیسے یار منائے' کیسے دل کو بہلائے اور اگر یار نہ مانے تو بھی کوئی گر نہ تھا اس کے پاس یار کو بہلانے کا۔

گریہ۔ گریہ صرف گریہ تھا جو اس کے بس میں تھا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا اک بہانہ تھا یا قرینہ۔

کمرے کی افسردہ بوجھل فضا میں وہ خوشگوار جھونکے کی مانند آیا تھا۔

اس نے دیدۂ بیدار میں بے پناہ چاہت کا جہان سمو کر اسے دیکھا۔

وہ اس کے قریب آیا' جیب سے چیک نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔

"اس پر دستخط کر دو۔" کتنے دنوں بعد اس کا لہجہ اور رویہ نارمل تھا۔ وہ بھول گئی ساری کج ادائیاں' رسوائیاں' اس کے سامنے اس کا محبوب پوری دل فریبی کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے فوراً" ہاتھ سے چیک لے کر دستخط کر دیے۔ اس نے یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ کتنی رقم کا چیک ہے۔ اسے جب بھی بڑی رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ جوائنٹ اکاؤنٹ سے چیک کیش کرواتے' وہ چیک دے کر بتاتا اتنی رقم اس کام کے لیے چاہیے' وہ دستخط کر دیتی۔

مگر آج اس کی زندگی میں وہ لمحہ تھا جو ہر سچی محبت کرنے والے کی زندگی میں آتا ہے۔ جب محبوب کو دیکھنے کی خواہش زندگی کی قیمت پر بھی قبول ہوتی ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی چیک کی رقم پر غور نہیں کیا۔ اس کا محبوب اس کے سامنے تھا پاس تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔ دل مضطر کو قرار دیا۔ بے طولانی سکون میں تبدیل ہوئی۔ بے قراری قرار کے سینے میں سمٹی۔ بے چینی نے چین کو چوم لیا۔ محبت پر اس لمحے کاملیت کا نزول ہو رہا تھا۔

وقت تھم جانے کی خواہش پوری شدت سے ابھری۔

اس سے چیک لے کر وہ جانے کے لیے مڑا تو دل کو جیسے شعلوں نے گھیر لیا۔ وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ اس کے راستے پر محبت کا کشکول لے کر کھڑی ہو گئی۔

وہ بے نیاز بنا رہا۔

"خدا کے لیے رک جاؤ۔" وہ گڑگڑائی۔ وہ بے نیازی سے مسکرایا۔

"میں نہیں رہ سکتا تمہارے ساتھ۔"

"اور میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔" اس نے پھر التجا کی اور سیل رواں نے اس کے سراپے کو دھندلا دیا۔ اس کے اندر کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔

"بالکل اپنی ماں کی طرح جنونی اور مکار ہو۔" وہ کشکول بھرنے لگا۔ وہ بہت تخی' بڑا فیاض تھا۔ رکھ دینے میں۔

"اور اپنے باپ کی طرح چالاک شکاری۔ جال میں پھانسنے والی۔"

ملکے قہقہے نے سماعتوں میں تیزاب پھینکا۔ وہ اندر تک جھلس گئی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! آپ نے تین کروڑ کے چیک پر دستخط کرنے سے پہلے کچھ سوچا ہوتا' کچھ پوچھا ہوتا' جس کام کے لیے یہ رقم اسے چاہیے' کیوں لے رہا ہے۔"

بوجھل رات کے بعد بوجھل دن جب اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے باپ نے آتے ہی اضطراب سے اس سے کئی سوال پوچھے۔ اس نے خالی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"رقم بھیجی کس نے تھی؟" خود کلامی پر حسین رضا نے ٹھنڈی سانس لی۔

"دیکھو بیٹا! اسے باندھ کے رکھنے' مجبور کرنے کے طریقے اپناؤ' ترساؤ اسے' ہر چیز کے لیے' مجھے پتا ہے' وہ کچھ نہیں کر سکتا تم سے الگ ہو کر۔ وہ اتنی آسائشات کا عادی ہو چکا ہے کہ اب اپنی اصلی زندگی کی طرف لوٹ کر جانے کی غلطی کبھی کر ہی نہیں سکتا۔"

"وہ اپنی اصلی زندگی کی طرف تو اب لوٹا ہے۔ پہلے تو ترس کر جیا ہے۔ وہ آپ کا بھتیجا ہے بابا! یہ کیوں بھول جاتے ہیں آپ؟"

حسین رضا لاجواب ضرور ہوئے مگر بار نہیں مانی۔

"مگر اس سب کا لنک وہ نہیں آپ ہیں بیٹا!"

"قدرت نے اسے میرا صرف شریک سفر ہی نہیں شریک' دولت ملکیت بھی بنا دیا ہے۔" وہ خیال یار کے پہلو سے کھسکنے کو کسی طور راضی نہیں ہوتی۔ حسین رضا نے آنکھیں موند کر اپنے تئیں اس کی عقل کا ماتم کیا۔

"اس نے یہ رقم جوائنٹ اکاؤنٹ سے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروائی ہے۔ وہ آپ سے محبت نہیں کرتا۔ صرف آپ کی دولت کو استعمال کرنے کی خاطر یہ بندھن نہیں توڑ رہا۔" انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"محبت عقل سے نہیں دل سے کی جاتی ہے بابا جان! آپ کی دلیلیں چاہے کتنی ہی وزنی ہوں' مگر میرے دل کے نزدیک بے وزن ہیں۔"

"دل کے اتنے اختیارات مت دو بیٹا! دل کے معاملات خود دیکھنا شروع کر دو۔"

وہ ڈوب گئی سیل رواں میں۔ حسین رضا بھول گئے اپنے دلائل اور بھاری رقم کو۔ صرف اور صرف انہیں اپنی بچی اور اس کا درد یاد رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بابا! دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ ہر کام اس سے نکلواؤ' محبت کرنے والے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اگر وہ تم سے سچی محبت کرتی ہے تو تم اس کی محبت سے فائدہ اٹھاؤ۔" ڈی ایچ اے میں بنگلہ دیکھتے حمید ماموں خوش ہو رہے تھے۔

"اتنے بڑے خوب صورت گھر میں ہم رہیں گے؟" بخشل چاروں طرف دیکھتے حیرت سے بولا۔

"ہاں اسی گھر میں ہم سب رہیں گے۔" مظفر نے مسکرا کر ماہم کو دیکھا۔ ماہم کے اندر تک طمانیت سرایت کر گئی۔

"گھر تو لگ ہی نہیں رہا۔ جنت ہے جنت۔"

حمید کی تو جیسے آنکھیں ہی کھل گئی تھیں۔

"ہیں یار! سالوں تک جہنم کی قید کاٹ کر آئے ہیں۔ اب اللہ نے زمین پر ہی جنت دے دی۔ شکر ہے اس رب جلیل کا۔" بخشل کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"اس قارون کی ملکیت پر ہم عیش کریں گے۔" حمید کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"ماموں! میں اپنی نفرت کی زمین میں دھنسا دوں گا اس قارون کو۔" مظفر کے لہجے میں انتقام کا عزم تھا۔

"یہ کمرا تو میں نے اپنے لیے لیا ہے۔ ہمارا بیڈ روم۔" وہ ماہم کو دیکھ کر مسکرایا۔

ماہم سب کے سامنے خجل ہو گئی۔

"اور آپ لوگوں کو جو کمرا پسند آئے۔ وہ اپنے لیے سیٹ کر لیں۔"

"میں تو تمہارے کمرے کے ساتھ والے کمرے

میں رہوں گا۔" حمید نے فیصلہ کرلیا۔

"اور اس کے ساتھ والا ہم لے لیں گے۔" مخمل نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"یہ پیسے تو سارے لگ گئے گھر میں۔ شادی کا خرچا؟" حمید ماموں کو پھر نئی فکر لگ گئی۔

"ماموں! کیوں پریشان ہوتے ہیں شادی کی اجازت ملنے کے ساتھ خرچے کا چیک بھی سائن کروالوں گا۔" وہ حمید کے گلے میں بازو ڈالے کہہ رہا ہوا۔

"او ہو۔ یہ تو میں بھول گیا کہ ہمارے پاس سونے کی چڑیا ہے۔" وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔

ماہم کے انگ انگ سے سرشاری عیاں تھی۔

"خوش ہو نا؟" سارا گھر گھومنے کے بعد وہ اس کے مدمقابل آیا۔

"کیا اظہار کی ضرورت باقی ہے؟" اس نے جواب کے بدلے سوال داغا۔

"نہیں۔ تم سراپا اظہار ہو۔" وہ مسکرایا۔

"اور آپ سراپا محبت۔" ماہم نے کہا۔

اس کے چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔

"تم سراپا محبت ہو مخمل!" حیا کی کھنکھناہٹ اس کی سماعت میں نمودار ہوئی۔

اس نے سر جھٹک کر سماعت کو صدا دی۔

☼ ☼ ☼

بعض دفعہ انسان کو اپنے عمل کا حساب اولاد کے شکل میں دینا پڑتا ہے۔ حیا کی محبت نے حمیرا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کتنے دنوں تک وہ کھل کر بیٹی سے بات کرنے کی ہمت نہ کرسکیں۔ نہ ہی حیا پہلے کی طرح ان کے پاس آکر بیٹھتی مشورے کرتی۔ اس کا رویہ بہت خراب تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر آتی نہیں اگر آبھی جاتی تو ماں کو دیکھنا بات کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتی رہتیں۔

زندگی میں پہلی بار انہیں احساس ہوا۔ اپنے جنون غلطیوں کا۔ وہ اس قدر حیا کی حالت سے پریشان تھیں کسی کل چین نہ تھا۔ اگر حیا رنجیدہ تھی تو خوش وہ بھی نہ تھیں۔ اس کو اس حالت سے ہر حال میں نکالنا چاہتی تھیں۔ سو اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے اس کے سامان کے ساتھ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

وہ بہت نفیس طبیعت کی مالک اپنے کمرے کو صاف ستھرا رکھنے والی حیا یوں خود سے بے خبر ہو گئی تھی۔ کمرا سارا الٹ پلٹ تھا۔

یہ سوٹ اس نے پانچ دن سے پہنا ہوا تھا۔ اس دیوانی جنونی سے بیٹی کی دیوانگی دیکھی نہ جاتی۔

"حیا!" ان کی زبان سے صرف یہ محض حرفی لفظ ادا نہ ہوا تھا۔ بلکہ ممتا کی پوری تڑپ اور محبت تھی اس پکار میں۔

بیڈ پر لیٹی حیا نے کروٹ بدل کر ماں کو دیکھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"بیٹا! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"یقیناً آپ سے تو بہتر ہی ہے۔"

وہ حیا کے قبضے میں چھپے ماضی کے طنز کو نگل گئیں۔

"مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔" آواز روہانسی تھی۔ "خود کو سنبھالو بیٹا۔"

"آپ سنبھال پائی تھیں؟"

ان کے پورے جسم میں جیسے لرزش ہوئی تھی بمشکل تھوک نگلا۔

"جو غلطیاں ہم سے ہوئیں تم تو ان غلطیوں کو نہ دہراؤ۔ ہم سے تمہارا دکھ ہوتا دیکھا نہیں جاتا۔"

"آپ کی وجہ سے کتنے لوگ دکھی ہوئے ہیں۔ کبھی آپ نے یہ سوچا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آپ نے کبھی کسی کا خیال رکھا؟ رکھا تو صرف اپنے دل کا۔" وہ تاک تاک کر حملے کررہی تھی۔

"تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو بیٹا! مجھے یوں تو زخمی مت کرو۔"

"پتا چل رہا ہے نا زخم کتنا درد دیتے ہیں۔ آپ نے کتنے ہی کب ہیں کہ علامت ہو۔ آپ نے تو صرف زخمی کرنا سیکھا ہے ہوتا نہیں۔"

اس کے لہجے کی تپش پر وہ موم کی مانند پگھل رہی

تھیں۔ ان کی لاڈلی بیٹی حقیقت کی چٹان بن کر ایستادہ تھی۔

✡ ✡ ✡

بقول شاعر وہ سر پر خیال یار کی چادر تان کر بیٹھی تھی۔ جب ملازمہ نے اسے وکیل کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آئی۔

"السلام علیکم! بیٹا کیسی ہیں آپ؟" بیرسٹر وقار احمد نے کھڑے ہو کر اپنائیت سے پوچھا۔

"وعلیکم السلام انکل! الحمد اللہ! آپ کیسے ہیں۔" اس نے بڑی مشکل سے دنیاداری نبھائی۔

"اللہ کا شکر۔" وقار صاحب نے عاجزی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے توقف کیا۔ ٹھنڈی سانس لی۔

"آپ کے لیے ایک بری خبر ہے بیٹا! آپ کو سناتے ہوئے بھی ڈر رہا ہوں۔"

"فکر نہ کریں انکل! میں اب بری خبروں کی عادی ہو چکی ہوں۔"

ملازمہ نے چائے لوازمات کے ساتھ ان کے آگے رکھی۔

"یہ فائل آپ خود دیکھ لیں۔" انہوں نے ٹیبل پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے فائل اٹھا کر اس میں ٹائپ کی ہوئی تحریر پڑھی۔

خیال یار کی چادر سر سے سرک گئی۔

سیاہ ہجر زدہ لباس میں وہ درد کے درمیان گھر گئی۔

گویا قتل ہوئی، محبت کا چراغ بجھ رہا تھا۔ ہجر کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

"مجھے پتا تھا بیٹا! آپ کو شدید صدمہ پہنچے گا۔" اس کا متغیر چہرہ دیکھ کر بیرسٹر وقار خود پریشان ہو گئے۔

وہ مردہ ہو رہی تھی، بالکل بے جان۔

حمیرا اندر داخل ہوئیں۔ اس کے خاموش وجود کو دیکھا۔ بہتے آنسوؤں پر تڑپ کر فائل اس کے ہاتھ

سے لی اور زور سے دیوار پر دے ماری۔

"بھاڑ میں جائے منحوس انسان۔ نالی کا کیڑا! میری بیٹی کے لائق ہی نہیں تھا۔ ایک چھوڑ دس شادیاں کرلے۔ ہماری بلا سے۔ ہماری جوتی کو بھی پروا نہیں۔" وہ اور غبار نکالتیں اگر وقار صاحب اسے حیا کے بے ہوش وجود کا احساس نہ دلاتے۔

"میری بیٹی حیا۔ حیا!" تڑپ کر حیا کو بازو میں بھرا۔ حیا کا سر ان کے کاندھے پر گر گیا۔

✡ ✡ ✡

وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ حیا کو سکون آور ٹیبلیٹ دے کر وہ اپنے کمرے میں آئی تھیں۔

"حیا کی یہ حالت۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، کیسے خوشیاں خریدوں اس کے لیے۔" حسین رضا بے بس تھے۔

"اس نے شادی کی اجازت مانگی ہے۔ اسے جواباً طلاق کا مطالبہ بھجوا دو۔"

"اور اگر اس نے طلاق دے دی تو؟" حسین رضا نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"تو اچھا ہے۔ جان چھوٹ جائے گی خبیث سے۔"

"ہاں جان تو چھوٹ جائے گی مگر کیا حیا مانے گی؟"

"وہ بچی ہے حسین رضا! ہم اس کی پھر کسی اچھی جگہ شادی کر دیں گے۔" اپنی دانست انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

"وہ خوش رہ سکے گی۔ تمہاری بیٹی ہے؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی حسین رضا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"تم اور تمہاری بیٹی مجھے طعنے ہی دیتے رہنا ——" وہ غصے سے چیخیں۔

حسین رضا نے خاموشی سے سگار جلا لیا۔ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

حمیرا نے مزید بحث سے گریز کیا۔ وہ چیخنے چلانے لگتیں۔ وہ دنیا کے لیے کیسی بھی ہوں، بہرحال ان کو اور حیا کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔

کتنی ہی دیر بعد حمیرا کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس

ہوا۔

"سنو! میری بات مانو تو یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔ اسے لالچ دو اور کہو خود ہی حیا کو طلاق دے دے۔ ہمارا نام لیے بغیر۔"

"حیا جیتے جی مر جائے گی۔" حسین رضا نے جیسے خود کلامی کی۔

"وہ اب بھی پل پل مر رہی ہے۔ صدمہ ضرور ہوگا' مگر ان شاء اللہ سنبھل جائے گی۔ ہاں کچھ وقت ضرور لگے گا۔"

ان کے پر سوچ انداز نے حمیرا کی ہمت بڑھائی۔

"تم بات تو کر کے دیکھو اس سے۔"

☼ ☼ ☼

"بیرسٹر صاحب! آپ نے اجازت نامہ نہیں بھیجا۔ میں سارا دن انتظار ہی کرتا رہا۔" رات دس بجے اس نے فون کر ہی ڈالا۔

"اجازت نامے پر سائن ہوتے تو بھیجتا نا۔" بیرسٹر صاحب نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ کیا حیا نے سائن کرنے سے انکار کر دیا؟"

"وہ ہوش میں ہوتی تو انکار کرتیں نا۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں بیرسٹر صاحب۔"

"وہ تو اجازت نامہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پھر مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔" انہوں نے تلخی سے کہہ کر سیل آف کر دیا۔

اس نے پھر کال کی' نمبر بند کا جواب موصول ہو رہا تھا۔

اسے صدمہ ہوگا۔ یہ اندازہ تھا' مگر اتنا شدید ہوگا' یہ پتا نہ تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا' وہاں سکوت تھا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ وہاں سب بیٹھے تھے۔ ان کو اطلاع دی۔

"لو بھئی برخوردار! اب دعا کرو' وہ زندہ بچ جائے۔ ورنہ حسین رضا ہمارے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔"

حمید ماموں کے لہجے پر' انداز پر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ ان کی فطرت سے واقف تھا۔

"ہاں دعا تو کرنی ہی پڑے گی' ورنہ صرف جان کے لالے ہی نہیں پڑیں گے۔ خالی ہاتھ بھی رہ جائیں گے۔" مخمل کی فکر انگیز آواز ابھری۔

ماہم نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کے تاثرات سے وہ اس کے دل کا حال نہ جان پائی۔

اپنے مستقبل کی فکروں نے اسے آن گھیرا تھا۔ یہ بنگلہ لینے آرائش کرنے کے بعد صرف چند لاکھ ہی باقی بچے تھے۔

☼ ☼ ☼

بیرسٹر صاحب کی طرف سے نوٹس آیا تھا۔ وہ حیا کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کتنی ہی دیر تک اسے یقین ہی نہ آیا۔ وہ بار بار نوٹس کو پڑھتا۔ یہ حیا نے بھیجا ہے؟ حیا میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے آخر اس کی محبت پر اتنا گہرا یقین کیوں تھا۔ اپنے اندر کی اس پکار کو' جذبے کو سمجھنے کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

کتنی ہی دیر تک وہ غصے سے ٹہلتا رہا۔

ماہم نے اسے یوں دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر ماہم کو دیا۔

وہ اب پہلے والی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ جیسے جیسے زندگی کی آسائشات و سہولیات زندگی میں آتی جاتی ہیں۔ وہ غموں کو' پچھلی مشکل زندگی کو بھول بیٹھتا ہے۔ وہ بھی بھول گیا۔ زندگی کس مشکل سے کاٹی تھی۔

ماہم کو بھی اپنے خواب چکنا چور ہوتے محسوس ہوئے۔

"مانا کہ میں قانونی طور پر پابند ہوں' مگر یہ میرا حق ہے میں کسی بھی طرح اپنے حق کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"آپ نے حیا سے بات کر کے دیکھی ہے۔"

حیا ان کی رقیب تھی۔ دشمن' مگر وہ اندر ہی اندر اس سے اتنا مرعوب تھے کہ انصاف کے لیے پھر حیا ہی کو

پکارنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ وہ حیا کی اچھائی سے متاثر تھے، گمانتے نہیں تھے۔

اس نے سیل اٹھایا۔ حیا کا نمبر ملایا۔ حیا کا دل خوش گمانی سے دھڑکا۔ شاید اسے احساس ہو گیا ہے۔ میری مزاج پرسی کے لیے فون کیا ہے۔

وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ مزاج پرسی نہیں۔ محبت کے پرے کے لیے کال آئی ہے۔ اس نے بکھرے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"کیسے ہو منتظر! مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم نے مجھے فون کیا ہے۔" اس کے لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

"تمہارے بغیر بہت اچھا ہوں اور بہت خوش اور یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا کہ تم نے مجھے نوٹس بھیجا ہے۔ جو محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں۔"

"کون سا نوٹس؟"

"میرا خیال تھا صدمے سے تم مر جاؤ گی۔ مگر نہیں تم کیوں مرو گی' ہو نا حمیرا کی بیٹی۔ الٹا مجھے پر یشر ترتی کر رہی ہو کہ میں مل کے اپنے غلطی پر بیٹھ جاؤں تیزی سے دست بردار ہو جاؤں۔ میں اپنا حق بھی نہیں چھوڑوں گا۔ کان کھول کے سن لو۔ تم تمہارا باپ اور تمہاری ڈائن ماں!"

وہ سانس لیے بغیر بولتا گیا۔ وہ بیچ میں اسے پکارتی رہی۔ "میری بات سنو۔" مگر وہ سننے کے نہیں سنانے کے موڈ میں تھا۔

"تم۔۔۔ تم مجھے کیا نوٹس بھیجو گی۔ میں بھیجوں گا اب تمہیں طلاق نامہ۔ پھر چھین کے دکھانا تم مجھ سے میرا حصہ۔۔۔ میرے باپ کی جائیداد' میرا حق۔" وہ طیش سے مسلسل بولتا رہا۔

اس کی سماعتوں میں پگھلا سیسہ انڈیل کر وہ سانس لینے کو رکا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ خدا کے لیے مجھ سے اپنا نام مت چھیننا' تم میرے نہیں ہو سکتے تو اپنا نام تو میرے ساتھ رہنے دو۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے' نہ میں نے تمہیں کوئی نوٹس بھیجا ہے۔"

وہ رو رو کر تڑپ تڑپ کر گڑگڑا رہی تھی۔

منتظر حسین کے کلیجے پر ٹھنڈ پڑ گئی۔

وہ اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے نام سے بھی اسے محبت ہے۔ وہ اپنا ہر کام با آسانی اس سے نکلوا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیل فون بجا' اسکرین پر حسین رضا کا نام دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کوندی۔ وہ اب ان سے بات کر سکتا تھا۔ ترپ کا پتا اس کے پاس تھا۔ کھیل جیتنے کی امید وہ اتنی آسانی سے نہیں ہار سکتا۔ بازی اسی کی تھی' جب تک حیا کی اس سے محبت برقرار تھی۔

"جی فرمائیے۔۔۔ مسٹر حسین رضا!" طنزیہ لہجہ۔

"تمہیں ہمارا قانونی چارہ جوئی کا نوٹس تو مل ہی گیا ہو گا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"آپ کا خیال ہے میں اس کاغذ کے ٹکڑے سے متاثر ہو جاؤں گا۔"

"یہ محض کاغذ کا ٹکڑا نہیں منتظر حسین! تمہیں امیرے تقصیر محل سے جھونپڑے تک لانے والا نسخہ کیمیا ہے۔" حسین رضا نے معتدل لہجے میں کہا۔

"آپ کے اس نسخہ کیمیا سے مٹی ہی نکلے گی۔ سونا نہیں حسین رضا!"

اس کے مضبوط لہجے پر وہ تھوڑا گڑبڑائے۔ مگر کامیاب بزنس مین تھے۔ فوراً" سنبھلے۔ "ہاں سونا بھی نکل سکتا ہے تمہارے لیے۔ اگر تم مجھ سے ایک معاہدہ کر لو' مل تو کیا نہیں پوری تمہارے نام کر دوں گا۔"

حسین رضا نے دانہ ڈالا۔

وہ فوراً" مستعد ہوا۔ "کیا مطلب؟"

"دیکھو بہت آسان بات ہے' یا تو پرانی رنجشوں کو بھلا کر حیا کے ساتھ اچھی خوش حال زندگی گزارو۔"

"نا ممکن۔" وہ پر زور انداز میں انکاری ہوا۔ "وہ میرے سامنے آتی ہے تو مجھے اپنے مظلوم ماں' باپ یاد آجاتے ہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"تو پھر دوسرا راستہ ہے۔ تم اسے طلاق دے دو۔ صرف اتنی احتیاط کرنی ہو گی کہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ

ہم نے کہا ہے۔ میں دل تمہارے نام کروں گی۔"

"قطعاً" نہیں۔ آپ کی بیٹی میرے انتقام کی تسکین ہے۔ میں اسے کسی حال میں آزاد نہیں کروں گا۔ وہ میرے پاس آپ کے جرائم کی قیدی اور آپ کے گناہوں کی سزا کے طور پر رہے گی۔" اس نے کال کاٹ دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

وہ سونے کی چڑیا ابھی اس کے ہاتھوں سے نہیں اڑی تھی۔ اس کی محبت کے پنجرے میں قید تھی۔

✲ ✲ ✲

ورق ورق پہ تیری عبارت' تیرا فسانہ تیری حکایت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تیری ہی یادوں کا باب نکلا

پورے تین ماہ ہوگئے اسے اک نظر دیکھے ہوئے۔ ان تین ماہ میں سیکڑوں بار وہ اسے "آئی مس یو" کے میسجز کرچکی تھی۔ کتنی بار دل مضطرب کے اضطراب سے گھبرا کر اسے کال کی مگر وہ ریسیو ہی نہیں کرتا۔

نئے نمبروں سے کال کرتی تو اس کی آواز سن کر موبائل آف کردیتا۔

وہ جھلس گئی تھی اس کے عشق میں' مررہی تھی' پل پل۔ اک بار دیکھنے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ بہت سادہ لڑکی تھی' کبھی کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ اس کی طرف ہوئی تو ٹوٹ کر ہوئی۔ وہ اس کا دوست بھی تھا۔ دلدار بھی' پیار بھی' سرتاج بھی' اس کی ذات پرت در پرت اس سے منسوب' اس کی خوشبو سے معطر' اس کے احساسات کی دلفریبی' وابستگی' دلکشی صرف اسی سے وابستہ' اس کے وجود کے ہر کونے سے وہ جھانکتا' ہر گوشے میں وہ موجود۔

وہ کیسے رہ پائے گی اس کے بغیر' اس کے بغیر رہنے کا سوچتی تو سانس رکنے لگتی۔ کئی کئی لمحے کے لیے رو تھم جاتی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی' زندگی کو منانے لگتی۔ اس کی آس دلاتی' اس کو یاد کرتی' اسے کسی سے یوں اتنی اور ایسی شدید محبت ہوگی۔ یہ بات شاید کبھی اس

کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی۔

ٹوٹ کر چاہنے میں وہ کس کس طرح سے نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ ذات کے ٹکڑے یکجا کرتی' پھر اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی' طعنوں' بے اعتنائی سے ریزہ ریزہ ہوتی۔ ریزے نہیں جڑتے۔ مگر وہ جوڑ لیتی۔ پھر ٹوٹنے بکھرنے کے لیے۔

وہ کیسے یار مناتی' محبوب کو راضی کرتی' راضی کرنے کا ہر جتن بے وزن' ہر منت بے توجہ' محبت جو ان کے وجودوں میں ڈھل کر ذات کا حصہ تھی۔ وہ اس کی ذات کا تو حصہ رہی' مگر غضنفر کے وجود سے ایسے ڈھل گئی کہ کوئی نشان' شائبہ' دھبہ تک نہ رہا۔

وہ اپنا انتقام بن گیا۔ اس کی رگوں میں محبت کے بجائے انتقام دوڑتا' مگر پھر بھی محبوب تھا۔ لب ہجر کا بار اٹھا۔ اک بار پھر بیرسٹر صاحب آئے تھے۔

"آپ کہہ دیں وہ خود آجائیں کاغذات لے کر میں سائن کردوں گی۔" اس نے ہتھیار پھینک دیے۔

وصل محبوب کی رضا سے ہوتا ہے' زبردستی نہیں حاصل کیا جاسکتا۔

اس نے شہادت کی انگلی کی پشت سے آنکھ سے بہنے والا آنسو پونچھا۔ جو ہزار ضبط کے باوجود بند توڑ بیٹھا تھا۔

✲ ✲ ✲

"آپ کیا کہہ رہی ہو بیٹا! اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے آپ کا فیصلہ۔" حسین رضا کی ناشتے کی ٹیبل پر اسے دیکھنے کی خوشی اس کا فیصلہ سن کر ریت میں مل گئی۔

"تم نے اجازت نامہ اور چیک سائن کرنے کے لیے اسے بلوا بھیجا ہے؟" حمیرا نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

وہ خاموش تھی۔ اس کے پاس ان کی باتوں کا کوئی بھی جواب نہ تھا۔

"اس کا رویہ' اس کا انتقام کچھ بھی نظر نہیں آرہا

تمہیں۔ اگر تمہاری روش یہی رہی تو سب کچھ کھو دو گی۔" حمیرا مسلسل بول رہی تھیں۔

"سب کچھ ہی تو کھو چکی ہوں۔" ناشتا زہر ہو گیا۔ آنسوؤں نے گلا بند کر دیا۔

"بیٹا! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ آپ کو مار رہا ہے۔ جلا رہا ہے۔ آپ کی اتنی محبت، توجہ کے باوجود وہ آپ کے قابل ہی نہیں۔" حسین رضا نے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

اس کی نظریں کسی غیر مرئی نکتے پر جم گئیں۔

"تم بے وقوف ہو، جو اس کو یوں چیک پر چیک سائن کیے دے رہی ہو۔" حمیرا کو اور طیش آیا۔

"میری عقل، میرا ضمیر یہی کہتا ہے، یہ اس کا حق ہے۔ اس کی ملکیت ہے۔ میں اسے روکنے کی بے وقوفی نہیں کر سکتی۔ مجھے پتا ہے بابا! اپنی ذات کی نفی کر کے حق پر چلنا کانٹوں کا سفر ہے۔ انتقام لینا تو بہت آسان ہے۔ بپھرے سمندری طوفان کی مانند سب کچھ تہس نہس کرتا، ایثار کے رستے پر چلنا مشکل ہے۔ بادل کے پانیوں کی طرح ہر جگہ پہنچنا، ہموار نشیبوں کے ساتھ گھاٹیوں، کھنڈوں سب ہی کو سیراب کرنا بہت مشکل ہے بابا! بہت مشکل۔"

وہ پور پور بھیگی آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

حسین رضا ہر بات بھلا کر بے کل اٹھ کر اسے گلے لگا گیا۔

حمیرا کو چپ لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

شفق آلود شام کے نیلے افق پر سرمئی بادل پوری آن بان سے دمکتے تھے۔ عقب میں آنکھ چرائے ہوئے نارنجی مائل رنگت سے بکھرے بادل ٹولیوں کی صورت عجب چھب دکھاتے رہے۔

وہ یاد یار کا کونا پکڑے اس شام کے نظارے میں منہمک رہی۔ آہستہ آہستہ سورج نے رات کا کونا پکڑ لیا اور بادل اس کے ہجر میں سرمئی سے ہلکے سیاہی مائل ہوتے چلے گئے۔ اک ستارے نے افق پر نمودار ہو کر بغور اس کو دیکھا۔

وہ بادلوں کی طرح اس کی یاد میں بکھرتی ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی۔ اس کا وجود، اس کی آواز کچھ بھی تو نہ تھا۔ بس دل کے اندر یاد تھی۔ جو ساتھ دیتی اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

وہ سیدھا چلتا ہوا لان میں کھڑی حیا کے مدمقابل آیا۔ اس نے لمبی سانس کھینچ کر آنکھیں کھولیں۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سانس ساکن ہوئی۔ آنکھ جھپکنے سے انکاری، کہیں خوب صورت سپنا بھیانک خواب نہ بن جائے۔

"کیوں بلایا ہے؟" چبھتا لہجہ۔

"تمہیں ترستے ہوئے۔" جواباً اس کے لب ملے۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟" اس کی آنکھوں کی بیگانگی نے لہجے کو بھی سرد کر دیا۔

"بہت فرق۔ منتظر حسین۔ یہی تو فرق ہے تم میں، مجھ میں۔ تمہیں سب کچھ نظر آتا ہے۔ مجھے صرف تم۔ تمہاری نظر ہر کس و ناکس سے نہیں ہٹتی، میری تم سے۔" اس کے لہجے میں صدیوں کی پیاس سمٹ آئی۔

وہ اس کی نظروں سے پگھلنے لگا، مگر اچانک موم سے سیسہ بن گیا۔

"تم میں اور مجھ میں اور بھی بہت سے فرق ہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں اپنا اور اس کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔

بس اس نے اس کے دل کو ہی نہیں دیکھا۔ سب سے زیادہ خوب صورت، منفرد، محبت کرنے والا، چاہت رکھنے والا دل۔ ایسا دل ہر ایک کو تو ودیعت نہیں ہوتا۔

اس کی آنکھوں میں برسات امڈ آئی۔

"تم اگر محبت کرتی ہو تو کرتی رہو۔" بے نیاز لہجہ۔ "مگر میری طلب سے باز آجاؤ۔ میں روز روز تمہاری خواہش پر نہیں آسکتا۔" دھمکی آمیز لہجہ۔

"طلب ختم تو قصہ زندگی ختم منتظر حسین! طلب ہی تو زندہ رکھتی ہے۔ طلب کے بغیر کچھ نہیں۔ طلب مفاد نہیں، بلکہ ہر مفاد سے بھاگتی ہے۔ طلب تو ہر عشق کا زیور ہے۔ مجازی ہو یا حقیقی۔ طلب ہی تو پہاڑوں

سے نہر کھدوائے' بے آب و گیاہ صحراؤں میں دربدر پھرائے' طلب کے بغیر تو خدا بھی نہیں ملتا۔ طلب میں کتنے لوگوں نے عمریں مٹی میں رول دیں۔ یہ میرے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے غضنفر حسنین۔

وہ آگے گلا رندھ جانے کی وجہ سے ایک لفظ بھی نہ بول پائی۔

"تم اپنا یہ بے کار کا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے بھول کر بھی توقع نہ رکھنا' میں قاصر ہوں' تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنے سے۔" وہ اس کے مدمقابل آکے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے حسی سے غرایا۔

آنسوؤں کے ریلے میں اس کا عکس دھندلا گیا۔

اس نے فائل کھول کر اس کے سامنے رکھی۔

دوسرے ہاتھ سے جیب سے پین نکال کر اسے تھمایا۔

اس نے مردہ ہوتے وجود سے جدائی کے پروانے پر خاموشی سے سائن کر دیے۔ سارے ہتھیار پھینک کر ہار مان لی۔ سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

اس نے چیک آگے کر دیا۔

حیا نے خاموشی سے سائن کر دیا۔

وہ فاتح اسی بے نیازی سے مڑا اور چلا گیا۔ وہ مفتوح وہیں بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ خوش تھی۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ اس کو اپنے خوابوں کا شہزادہ مل رہا تھا۔ سپنے یوں بھی تعبیر پاتے ہیں۔ دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔

ماہم بار بار اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اللہ نے اسے من پسند ہم سفر عطا کیا ہے۔ اللہ نے کتنا خوب صورت نعم البدل دیا تھا۔ اس کی منگنی خالہ زلو سے ٹوٹی تو سالوں تک غم منایا دل نے بھی اور ماں نے بھی۔

جس رات یہ قیامت خیز خبران تک پہنچی' وہ ساری رات اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔ اس نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی۔ اپنی کم مائیگی' غربت کا احساس اسے مارے دیتا تھا۔ حیا اپنے والدین کے گناہوں میں گھر گئی اور

غضنفر حسنین اس کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ جستجو نے اسے غضنفر تک پہنچایا۔ نصیب نے غضنفر سے ملا دیا۔

اس نے جی بھر کر غضنفر کے ساتھ شاپنگ کی مشہور ڈیزائنر سے کپڑے بنوائے۔ جیولری خریدی۔ صورت تو اللہ نے اچھی دی تھی۔ زیب و زینت نے حسین تر بنا دیا۔

☼ ☼ ☼

اس تقریب میں غضنفر نے اپنی ساری ایلیٹ کلاس کو مدعو کیا۔

چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں' یہی تو وہ چاہتا تھا کہ لوگ ان پر ہنسیں' حسنین رضا کا سگا بھتیجا تھا' پھر ایسا کیا ہوا۔

ماضی کی معافی زبان زدعام بن چکی تھی۔ وہ ان کی سبکی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

"شاندار جوڑی۔" جو بھی دیکھتا کہے بنا نہ رہ پاتا۔ وہ خوب صورت تو تھی مگر عمدہ لباس' جیولری اور میک اپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

اسے پتا تھا' آج اس کے دشمنوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہوں گے۔ اس نے انویٹیشن کارڈ حیا کو بھی بھیجا تھا' اور مہرین کو بھی۔ اسے ایک بار بھی حیا کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کی محبت نہ عنایت نہ مہربانی' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت سارے پتے تھے۔ مگر وہ تو تب کارگر ہوتے جب وہ کھیلنے کو تیار ہوتی۔ اس نے تو کھیلنے سے پہلے ہی ہار مان لی تھی۔ سارے پتے پھینک دیے تھے۔

وہ جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا' اٹھا رہا تھا۔ اس کی محبت و نرمی سے بیس کروڑ کا بھاری چیک لکھوا لیا تھا۔ مبادا وہ بعد میں سوتن کے جلاپے' حسد میں سائن نہ کرے' اور اگر وہ سائن نہ کرتی تو وہ ایک روپیہ بھی نہیں نکلوا سکتا تھا۔

وہ چاہتی تو کئی قانونی رکاوٹیں ڈال کر مل کو تالے لگوا دیتی مگر ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ماہم کے ساتھ وحشت میں حیا اس کو بھول کر بھی یاد نہ آئی۔

اتنی خوب صورت شریک حیات پاکر یا انتقام کی آخری اسٹیج پر پہنچ کر اپنی کیفیات کو وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆ ☆ ☆

دعوت نامہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تو حیا حسین۔ آج اس نے اپنی زندگی سے تمہیں مکمل طور پر نکال دیا۔" اک بار پھر اسے رونے کا دورہ پڑا۔

وہ سارا دن بچھڑے یار کے ہجر کا ماتم کرتی رہی نہ کھانا نہ پینا' کچھ بھی تو یاد نہ تھا اسے۔

دل کی کیفیت عجیب ہو گئی تھی۔ کبھی تیز تیز دھڑکنے لگتا اتنا تیز کہ اس دھڑکن کی پکار ناقابل برداشت ہو جاتی۔ اور کبھی اتنا مدھم ہو جاتا کہ دھڑکنیں محبوب کی طرح گم ہونے لگتیں وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

مہرین اس کا غم بانٹنے آئی تو اسے بہت بری حالت میں دیکھا۔

"کیوں غم منا رہی ہو' اس احسان فراموش کا جس نے تمہیں سوائے دکھ کے کچھ بھی نہ دیا۔"

اس نے حیا کو بازو سے اپنے قریب کیا۔ اس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر تھپکنے لگی' وہ مزید روئی پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مہرین! اسے صرف لینا آتا ہے' دینا نہیں۔ وہ سمجھتا ہے' محبت کے قابل صرف وہ ہے' نیک پاک پارسا اچھا انسان بھی خود کو ہی سمجھتا ہے۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مگر اس میں قصور اس کا نہیں میری محبت کا ہے' جس نے اس کو آسمان پر بٹھا دیا۔ کہ وہ جھک کر زمین کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔"

"اس لیے حیا کہ وہ خود غرض ہے۔ محسن کش ہے جس نے اسے محبت کے ذائقے سے آشنا کر دیا۔ دھتکارتا ہے اسے' جس نے ہر طبقاتی فرق کو مٹا کر اسے اپنایا۔" مہرین کے لہجے میں دکھ' تاسف' غصہ کیا کچھ نہ تھا۔

"وہ مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ میں نے اس کی پرستش کی ہے۔ چاہا ہے محبت کی آخری حدوں تک' اپنے وجود کو مٹا کر۔" خاموش آنسو اس کے لفظ لفظ پہ گرتے رہے' "مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ تم سے محبت کرتا ہو۔"

"نہیں مہرین! اسے صرف وقتی لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ میری بے تحاشا محبت' بے انتہا۔ توجہ' بے انتہا آسائشات دیکھ کر وہ محبت کے جذبے سے ناآشنا تھا' ناآشنا ہے۔"

لفظ ختم ہوتے گئے۔

جب انسانوں کے اندر لالچ' حسد آجاتا ہے تو انسانیت' محبت گھٹنے لگتی ہے۔ غرض کی پٹی آنکھوں پہ بندھ جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"میں نے آپ کے لیے شاہی کباب بنائے ہیں۔ حمید ماموں بتا رہے تھے۔ آپ کو بے حد پسند ہیں۔"

آفس سے لنچ ٹائم پر گھر آیا تو ماہم نے خوش ہو کر بتایا تھا۔

کھانا کھانا اس کے لیے مشکل ہو گیا' اسے حیا کا خیال آیا' وہ اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ بناتی تھی تو لقمہ گلے میں اٹک گیا۔

"آئندہ میرے لیے مت بنانا۔" اس نے پلیٹ اپنے آگے سے ہٹائی۔

"ارے کیوں بیٹا! اچھے نہیں بنے کیا۔" خورشید گھبرائی۔

"نہیں خالہ! مجھے شاہی کباب سے اس واپن کی بیٹی یاد آگئی' اتنی بار اس نے بنا کر کھلائے ہیں کہ اب لگتا ہے۔ ہر جگہ اس نے ہی بنائے ہوں گے میں ان لوگوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا' ان کی ہر یاد' ہر بات بھلانا چاہتا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔ آئندہ میں آپ کے لیے نہیں بناؤں

کی۔" ماہم نے جلدی سے پلیٹ اس کے سامنے سے ہٹالی۔

"اچھا یہ مچھلی کھالو۔ بہت مزے کی بنی ہے۔"

حمید ماموں نے فوراً مچھلی اس کے آگے رکھتے ہوئے دل جوئی کی۔

ماہم نے سوچا وہ اب کبھی شامی کباب نہیں بنائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی حیا بھول کر بھی اسے یاد آئے۔

☼ ☼ ☼

"وہ سانپ ہمیں ڈس رہا ہے' ہماری دولت پر عیش کر کے ہمارے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ اور۔ تم حسین رضا! خاموش بیٹھے ہو کوئی کارروائی نہیں کر رہے اس کے خلاف۔"

"ہمارے پر کٹ گئے ہیں حمیرا! یہ تم بھول رہی ہو۔"

"تمہیں اس سے ہمدردی ہے' بھائی کا بیٹا ہے نا' باپ بیٹی نے سر پر چڑھا دیا۔ وہ چیک پہ چیک سائن کر کے دے رہی ہے۔ تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ بینک مینیجر سے کہو کہ اتنے بڑے چیک وہ کیش نہ کرے۔ آخر تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے؟" وہ چیخیں۔

"کیا کروں' تم بتاؤ۔" حسین رضا نے اخبار میز کے کونے پر پٹخا۔

"تمہارے پاس کوئی چال نہیں۔ کوئی کارڈ نہیں' تم اتنے بڑے گیم لوزر ہو سکتے ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ طنزیہ طنز کرتی رہیں۔

"ہم ہار گئے ہیں' یہ تم تسلیم کیوں نہیں کر رہیں۔" انہوں نے سگار کا کش لگایا' تھکے تھکے انداز میں چیئر کی بیک سے ٹیک لگائی۔

"تمہارے جیسا کھلاڑی جو زندگی میں کبھی نہیں ہارا' سب کچھ حاصل کر لیا۔" وہ نفی میں سر ہلاتی رہیں۔ "یقین نہیں آتا مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ آبیٹھیں۔

وہ تلخی سے مسکرائے۔

"یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔" انہوں نے خود کلامی کی۔ "میں اتنا مجبور ہو سکتا ہوں؟ ہمارا تکبر ہمیں لے ڈوبا۔" اس کے لہجے میں تھکن ہی تھکن تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ مضطرب ہو کر ٹہلنے لگیں۔

"حسین رضا! مجھ سے یہ ہار' یہ دکھ برداشت نہیں ہو رہا' ذلیل کر رہا ہے' قتل کر دوں اسے۔" انہوں نے مٹھیاں بھینچیں۔

"اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے ماروں' اپنی نسل ختم کر دوں' باپ دادا کی پیڑھی ناس کر دوں' گناہ پر گناہ' جرم پر جرم' یہ نہیں ہو گا اب مجھ سے حمیرا بیگم! سمجھیں تم' بیٹی ٹھیک کہتی ہے' شکر کرو کہ اللہ نے ہمیں اتنی قیمتی بیٹی دی ہے جو ہماری غلطیوں کا کفارہ بن رہی ہے' ہمیں غلط فیصلوں سے بچا رہی ہے' اب توبہ کا وقت ہے' تم بھی توبہ کر لو تو بہتر ہے۔"

وہ کہتے ہوئے اٹھے۔

باتیں ان کے دل کو بھی لگ رہی تھیں' وہ خاموش رہ گئیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"وضو کرنے' دو رکعت نفل توبہ ادا کرنا ہے۔"

حمیرا نے سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اٹھتا تو گڈ مارننگ کا میسج ملتا' سوتا تو گڈ نائٹ کا' اور پھر دن میں چھوٹے چھوٹے محبت بھرے جملے اشعار آتے رہتے۔ یہ حیا کا معمول تھا۔

اور اب وہ اتنا عادی ہو چکا تھا کہ لاشعوری طور پر منتظر رہتا' وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ کس جذبے سے مجبور ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے میسجز پڑھتا تھا۔ البتہ جواب کبھی نہیں دیا تھا۔

ماہم کو اس کے یہ میسجز کھٹکتے' اس نے چپکے سے منتظر کا سیل اٹھایا اور جواب ٹائپ کرنے لگی۔

"آخر تم میسجز کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں' تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میرا اب تم سے کوئی

تعلق نہیں ہے۔ میں تمہیں یاد نہیں کرنا چاہتا' مجھے اپنے ماں باپ کی اذیتیں یاد آتی ہیں' میں تم سے نفرت کرتا ہوں' حیا حسین! میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں' یہ بات مان لو' قاتلہ کی بیٹی قاتلہ۔"

اس نے میسج دو تین بار سینڈ کیا' پھر ڈیلیٹ کر کے سیل اس جگہ پر رکھ دیا۔

"مجھے پتا ہے۔ حیا! تمہارے میسجز ہم دونوں کو ڈسٹرب کر دیتے ہیں۔ میں نے جو بھی لکھا وہ میں نے وقتاً" فوقتاً" مظفر کی زبانی اس سے سنا ہے' دل کو دلا سا دیا۔

☼ ☼ ☼

تم ہمیں بھول بیٹھو تو ہزاروں پہلو
ہم تمہیں بھول کے بیٹھیں تو کسے یاد کریں

وہ روتی رہی اس کے اس نفرت انگیز میسج پر اس کو نیند نہیں آرہی تھی' درد روئیں روئیں میں سرایت کر رہا تھا' وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ اس درد سے' وہ خود نجات حاصل کرنا چاہ رہی تھی ان میسجز سے' نکر کہاں جائے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

وہ گھبرا کر باہر نکلی' سلاف میں آئی۔ حمیرا سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ وہ کسی گہری سوچوں میں گم تھیں۔ آنسوؤں سے ان کا چہرا بھیگ رہا تھا' اس کی ماں یوں رو رہی تھی' جو کبھی مشہور تھی' یقیناً" اس کا دکھ ہی اس کو رلا رہا تھا۔

"کیوں وہ اپنے ماں باپ سے بدلہ لینے پر تلی ہوئی ہے۔" ایک سوچ نے اس کو جکڑا' انہوں نے کیا کیا ناز نہ اٹھائے اس کی خوشیوں کے لیے۔ سب کچھ تج کر بیٹھے حتیٰ کہ مظفر کو بھی اپنا لیا اور وہ اس سب کا صلہ نفرت' بے اعتنائی' بے رخی کی صورت دے رہی ہے ان کو۔" دل مجرم بنا' ماں باپ کی محبت نے دل میں انگڑائی لی' اس کے احسان یاد آ گئے' اپنے رویے پر انتہائی شرمندگی ہوئی۔

بالفرض ان کے ماضی کی یہ سب باتیں سچ بھی ہوں تو بھی مجھے کیا حق پہنچتا ہے' باز پرس کا۔

"میری زندگی تو ان ہی کی وجہ سے تلخ ہوئی۔" اندر کی خود غرضی عود کر دلیل بنی۔

"اور انہوں نے جو اپنی دولت' محبت' شفقت کے خزانے تم پر لٹا دیے۔ وہ کس کھاتے میں ڈالو گی حیا حسین' کوئی ایک حق بھی ادا کیا تم نے؟" ضمیر نے آئینہ دکھایا۔

وہ تھکی تھکی' الٹے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آئی۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے جو بھی کیا' برا کیا۔ وہ اپنے اعمال کے لیے خود ہی جواب دہ ہیں۔ بحیثیت اولاد میں ان سے کس قسم کا انتقام لے رہی ہوں' کیوں۔ کیوں میں ان سے اتنی دور ہو گئی' میرا رویہ اتنا خراب کیوں ہے؟"

اندر سے بیک وقت ابھرنے والی آوازوں نے اسے بوکھلا دیا۔

"کیا اللہ مجھے اس بات کی اجازت دیتا ہے؟" اسے خود اپنی سوچ پر حیرت ہوئی۔ اللہ کے احکام کا خیال زندگی بھر نہ کسی نے دلایا' نہ ہی آیا تھا' پھر یہ روشنی کہاں سے آرہی تھی' اس نے بلا ارادہ بے اختیار ہو کر سر اوپر اٹھایا' کمرے میں لگا فانوس عین اس کے اوپر تھا' مگر یہ روشنی اس کی نہ تھی' یہ تو اندر سے پھوٹ کر نکل رہی تھی' اس نے سر جھکا کر آنکھیں بھینچ لیں۔

"یا اللہ مجھے معاف کر' میری غلطیوں سے درگزر فرما۔"

"یا اللہ مجھے معاف کر' اندھیروں سے نکال۔ روشنی دے۔ اندھیروں سے نکال' ظلمت سے بچا۔"

دعا مانگتے مانگتے اسے نیند آ گئی' ایسا سکون جو کبھی سکون آور گولیوں سے بھی نہ ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح اٹھی تو فریش تھی' اس نے پرانے معمول کی

طرح اٹھ کر غسل کیا' ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھی۔

حمیرا اور حسین رضا نے ایک دوسرے کو خوش گوار حیرت سے دیکھا۔

"السلام علیکم!" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی طبیعت ہے۔ بیٹا؟" حسین رضا نے پہل کی۔

"پہلے سے کافی بہتر ہوں۔" اس نے باپ کو دیکھ کر کہا۔ پھر مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آئی خوشی کی نمی کو دیکھ کر اسے اور ندامت ہوئی۔

"آپ کے پاس کتنی دولت ہے؟" اس نے ماں کا دیا ہوا چائے کا کپ تھامتے' باپ سے سوال کیا۔

"کیوں بیٹا! کتنی چاہیے آپ کو؟" حسین رضا خوش دلی سے مسکرائے۔

"نہیں' ایسے ہی پوچھ رہی ہوں اندازا" کتنی ہے؟" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"آپ کے اندازوں سے بڑھ کر بہت زیادہ۔"

"پاپا! آپ ایسی جگہ سرمایہ کاری کیوں نہیں کرتے۔ جس میں آپ کو دس فیصد منافع یہاں حاصل ہو جائے اور ستر فیصد سیو ہو جائے۔"

"بالکل لگانے کو تیار ہوں ایسا کس بینک کی پالیسی ہے؟" وہ بے اختیار کہہ گئے۔

حیا مسکرا اٹھی۔ "جنت بینک"

"میں نے تو نہیں سنا۔ نیا کھلا ہے۔"

"حیا بے اختیار کھلکھلا اٹھی۔

"بیٹا! جتنا چاہو سرمایہ لگاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" حمیرا اس کا نقطہ نظر سمجھتے ہوئے خوش دلی سے بول اٹھیں۔ "ہم تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں! میں دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اور تھر میں پانی کی فراہمی کے لیے کچھ کنوئیں وغیرہ کھدوانے کا کام بھی کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کا جس طرح دل چاہے کریں' پیسے کا مسئلہ نہیں بیٹا! بس آپ خوش رہیں' میں آج ہی آپ کے اکاؤنٹ میں بھاری رقم ٹرانسفر کروا دیتا ہوں۔"

حسین رضا نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی۔

"یہ سب کچھ تمہارا ہے بیٹا! جیسے چاہو خرچ کرو' ﷲ کا شکر ہے کہ اس نے میری بچی کو نیک کاموں کی توفیق دی۔"

حمیرا کی تشکر بھری آواز ابھری۔ وہ دونوں خوش تھے کہ حیا نہ صرف زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔ بلکہ دوسروں کی زندگی میں خوشیاں بانٹنے کو بھی تیار ہے۔

☼ ☼ ☼

"وہ میرے مقدر میں ہے' اس لحاظ سے میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ میں اس کی ہو کر صرف اس کی ہوں' وہ میرا ہو کر بھی میرا نہ رہا۔

میں بازار محبت میں بے مول بک گئی اور وہ کیسا خریدار ہے۔ جو نہ دل' نہ حسن' نہ پیار کسی کا بھی سودا نہیں کرتا۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔ اور میں بچانا چاہتی ہوں اسے' اس آگ سے' اس انتقام سے' میں جانتی ہوں' اسے کچھ نہیں ملے گا' وہ صرف اپنا دامن جلائے گا' اگر وہ اس انتقام سے مجھ سے نفرت کر کے خوش رہ سکتا تو مجھے اس کی نفرت بھی قبول ہوتی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ میسج ٹائپ کرنے لگے۔

"میں تیری سودائی محبت کی ماری تیرا من اگر مجھے انتقام کی آگ میں جلا کر خوش ہوتا ہے' تو مجھے جلا کر خاکستر کر دے' بھسم کر دے' راکھ بنا دے' آگ لگا دے آگ۔"

میسج سینڈ کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼ ☼

اس کے خیال خانہ بدوشوں کی طرح مسلسل مسافرت کا عذاب بھگتتے' کبھی دل کے کوچے میں گھومتے' کبھی ذہن کے قریے میں گھٹتے' کبھی غم جاناں میں کھلتے' کبھی فکر دوراں میں جامد کرتے' چلتے' رکتے' گھٹتے' بڑھنے کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسیوں کے گہرے سمندر — موجزن رہتے۔ اس سانولی رنگت میں عجیب سی کشش پیدا ہو گئی تھی' دیکھنے والے اک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری نگاہ ڈالنے سے خود کو روک نہ پاتے۔

"آج گھر پر رہنا' چیک سائن کروانا ہے۔" اس دن بھی آیا تو تم نہیں تھیں۔ "منتظر نے میسج کیا۔

وہ آیا تو اس کو پہلے سے بھی جواب "نظر لگا یقیناً" بہت خوش تھا۔ اس کی سنگت اس کو وہ خوشی نہ دے سکی جو ماہم کے ساتھ نے دی تھی۔ دل میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"چائے پئیں گے؟" شاید کچھ دیر بیٹھ کر وہ باتیں کرلے۔ وہ گھڑی کے لیے رک جائے۔ دل نے راہ دکھائی وہ مجبور ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے رکھائی سے انکار کیا' اسے اسی جواب کی امید تھی۔

"کیوں' زہر دینا ہے؟" لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا' وہ حسب عادت کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔

وہ اس کے اس طنز کو بھی حسب معمول ہو کے تبسم سے پی گئی۔

"اللہ آپ کو زندگی بھر ہمیشہ خوش رکھے۔" دعائیہ الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔

"خوش تو میں ہوں' بہت زیادہ' ماہم سے شادی کے بعد مجھے حقیقی خوشیوں کا احساس ہوا ہے' بہت خیال رکھتی ہے وہ میرا۔ میں بھی ٹوٹ کر چاہتا ہوں اسے۔"

وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا ہے' وہ سمجھ گئی۔ وہ اسے جلانا چاہتا ہے' ماہم کا ذکر کرکے وہ پرسکون سامع بنی رہی۔

"تم کیا جانو منتظر حسنین' اسے حسد کی آگ کیا جلائے گی' جو محبت کے بھانبڑ میں جلے ہجر کی تپش میں تڑپے۔"

وہ اک لمحے کو اس جواب اور وہ بھی غیر متوقع پر چپ رہ گیا' مگر پھر سے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں کود پڑا۔

"اوہ تمہیں برا لگ رہا ہے ماہم کا ذکر۔ صحیح ہے' بھئی برا تو لگے گا' آخر ایک کمی تمیزن تمہارے باپ کے قیدی کی بیٹی تمہارے برابر آ گئی۔ اوہ برابر نہیں۔ تم سے اونچی مسند پر جا بیٹھی' میرے دل کی حکمران' گھر کی ملکہ' وجود کی مالکن۔"

وہ اپنے تئیں تاک تاک کر نشانے باندھ رہا تھا۔ اسے زخمی کرنے کا یہ نادر موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"میں مانتی ہوں منتظر حسنین! محبت میں رقابت کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔" وہ اس کے لہجے پر یکدم خوش ہوا کہ اس کی چوٹ میں ماہم نہیں ہو گئی۔

"مگر تم تو میرے تھے ہی نہیں' کوئی امید' کوئی وابستگی' کوئی دلبستگی کا شائبہ تک نہ تھا' دامن دل تہی رہا۔ میں نے تو یک طرفہ محبت کی۔ اور یہ محبت میرے لیے' خوشی یا گلزار' میرا نصیب' کسی کا اس سے کیا تعلق۔"

اس کے نپے تلے انداز نے اسے لاجواب کر دیا۔ اس نے چیک بک آگے بڑھائی۔

حیا نے حسب معمول خاموشی سے دستخط کر دیے۔

"تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں نے اتنی بھاری رقم کا چیک کیوں سائن کروایا ہے' تو سنو' میں بار بار تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا' اس لیے۔"

"آئندہ چیک بھیج دینا' میں نہیں چاہتی' تم اس اذیت سے بار بار گزرو۔" اس نے ٹوٹے وجود کو مضبوط لہجے سے سنبھالا دیا۔

جواب پھر غیر متوقع' آج وہ اسے لاجواب کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی' شاید اس کے سارے نشانے چوک رہے تھے۔

"شکریہ تمہارا۔" لہجہ طنزیہ ضرور تھا' مگر آگے وہ کچھ بھی بول نہ پایا۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ وہ اٹھا اور جانے لگا۔

"اللہ کی امان میں' منتظر حسنین!"

وہ ٹھٹکا' رکا' مڑ کر اسے دیکھا' اس کی نظروں میں ناسمجھ میں آنے والی حیرت تھی۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

حیا نے آنکھیں موند کر تھکے ہارے ہوئے انداز میں سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آیا تو حمید ماموں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ ڈالا۔

"بہت مبارک ہو بیٹا!"

"کس بات کی ماموں؟"

"ارے ملکوں کی پیڑھی آگے بڑھنے والی ہے' تیرا وارث پیدا ہونے والا ہے پتر!" وہ ہاتھ اٹھا کر ناچنے لگا۔

"خیر مبارک ماموں' آپ کو بھی مبارک ہو۔"

وہ صبح آفس گیا' تو ماہم کو ہلکی سی حرارت تھی' اس نے ناشتا بھی نہیں کیا' متلی ہو رہی تھی۔

"میں آؤں گا تب تک شام ہو جائے گی۔ گاڑی بھیج دیتا ہوں' خالہ کے ساتھ جا کر ابھی چیک اپ کروالو۔" اس نے جاتے ہوئے تاکید کی تھی۔

وہ خوش ہو کر کمرے میں آیا۔

"مبارک ہو میرے بچے کی اماں جان!" اسے جکڑ لیا۔

ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔ "آپ کو بچے کے ابا جان کو بھی مبارک ہو۔"

"ڈاکٹر نے پھر کتنے دنوں بعد چیک اپ کروانے کو کہا ہے۔"

"ہر ماہ وزٹ ہوگی۔"

"نہیں یار! ہم ہر پندرہ دن بعد وزٹ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں میرا بچہ خوب صحت مند ہو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

وہ اپنی اس خوشی میں ایسا مگن ہوا کہ بھول کر بھی حیا اسے یاد نہ آئی نفرت سے ہی سہی۔ ماہم کا چیک اپ' کھانے کا خیال' ٹائم سے دوائیوں کا خیال' اتنی محبت توجہ پا ماہم فضاؤں میں اڑتا محسوس کرتی خود کو۔

جیسے جیسے ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے' وہ ڈر رہی تھی۔

وہ اس کی ڈھارس بندھاتا "سب خیریت سے ہو جائے گا' تم پریشان نہ ہو۔"

خالہ اور اماں ہمت دلاتیں۔ "ارے بیٹا! کیوں اتنا ڈر رہی ہو' کچھ نہیں ہوگا۔ یہ دنیا کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا' اک تم ہی تو اکیلی نہیں۔" وہ اس پر ہنستیں۔ پھر دعائیں دیتیں۔

"اللہ آسانی کرے گا۔"

یہ نو ماہ ان کے اتنے محبت بھرے اور مصروف گزرے کہ بھول کر بھی ان لوگوں کا تذکرہ ان کی زبان پر نہ آتا۔

☼ ☼ ☼

سنبھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں۔
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس مخل مشتاقانہ حزیں' جہاں دل تو' دلبری کی دلبری کی ابھاریں' تمنی ہر تی' ہمتی ناقدری کرتی' وہ اس ہمتی میں جل کر بھسم ہو جاتی۔

رات تیسرے پہر میں داخل ہوئی' جب مختر کا نام موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا' اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔

"میرے دشمنوں کو خبر ہو کہ اللہ نے مجھے بیٹی سے نوازا ہے۔"

اس نے فوراً جواب دیا۔

"اس رحمت کے لیے آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔"

"اس نے اس قابل تو سمجھا کہ اپنی خوشیوں میں شریک کیا۔" دل نے خوشی محسوس کی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے دل جلے میسج نے اس تاثر کو زائل کر دیا۔

"ہاہا! بہت دکھ ہوا ہوگا تمہیں' میری وارث پیدا ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ قاتل کی اولاد کے بطن سے نہیں' محسن کی اولاد کے بطن سے۔ ماہم سے جو میری جان ہے۔"

اس کے ہاتھ تیزی سے جواب ٹائپ کرنے لگے۔

"محبت نفع و نقصان کی جمع تفریق نہیں دیکھتی۔ بے غرض ہوتی ہے۔ دل کرائے کا گھر نہیں صاحب! اس کے مکین بار بار نہیں بدلتے۔"

اس کے آنسو موبائل اسکرین پر گرے' اس نے پیغام ارسال کر دیا۔

محبت ایسی ہی ہے۔ جبر بن کر نازل ہونے والی۔ صبر بن کر شہرنے والی' ہجر کا قہر بن کر جلانے والی' دراصل وہ جس کو محبوب کی گلی سمجھی تھی۔ وہ محبوب بھی اک ایسی وفانی انسان اور وہ گلی بھی بھول بھلیاں' جس میں وہ گم ہو گئی۔ اسے ادراک ہوا کہ اس نے غلط راستہ پر قدم رکھا تھا۔

"الٰہی مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے انسان کے پیچھے دوڑنے کی رسوائی سے بچا۔ میں فون کرتی ہوں' وہ نہیں اٹھاتا' وہ میری پکار کا جواب نہیں دیتا۔ مگر تو مایوس نہیں کرتا' ہر پکارنے والے کو جواب دیتا ہے۔ مدد کرتا ہے' جو تجھے چھوڑ جائے اسے بھی اپنا لیتا ہے۔ مجھے فانی کے عشق سے بچا رکھ' ...ہوتے ... باقی کا عشق عطا کر۔"

صرف وہی نہیں سنگ دل تھی۔ رات بھی ساتھ ساتھ سسکتی تھی۔ اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ پہلی بار ہوا کہ وہ رب صمد جو بے نیاز تھا' اس سے ہم کلام تھی۔ جب بے بس ہوئی تو اس صمد بے نیاز رب کو پکارنے لگی' جس سے تعلق ہستی ہی بے نیاز ہو جائے۔ وہ پکارنے والے کی پکار سنتا ہے۔

اسے یہ ادراک بہت دیر میں ہوا کہ محبوب ہمیشہ بے نیاز ہوتا ہے۔ مگر رب صمد ایسا بے نیاز ہے کہ جس کے سامنے اک بار نیاز سے عاجزی سے بندہ جھک جائے' تو وہ کہتا ہے "تم ایک قدم بڑھاؤ' میں دس قدم بڑھاؤں گا۔"

اس کے دل پر آہستہ آہستہ سکون اترنے لگا۔ اس کا دل بارگاہ ایزدی میں جھکنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے کمرے میں وہ سب خوش تھے۔ ماہم کو ہوش آگیا تھا۔

سب اس کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اس کا خیال رکھ رہے تھے۔

"جس گھر میں پہلوٹی کی اولاد بیٹی ہو' اس گھر میں فرشتے مبارک باد دینے آتے ہیں۔" خالہ نے اس کی پیشانی چومتے کہا۔

"ہم اس کا نام مریم فاطمہ رکھیں گے' مرحومہ زبیدہ بہن کو بڑا پسند تھا۔ غضنفر کی باری بھی کہا تھا کہ اگر بیٹی ہوئی تو مریم ہی نام رکھوں گی۔" حمید ماموں' بہن کو یاد کر کے بولے۔

"اگر امّاں کو یہ نام پسند تھا تو میں یہی رکھوں گا۔" غضنفر نے بیٹی کو سینے سے لگا کر کہا۔

"ہاں ہاں ضرور بیٹا! کیوں نہیں۔" ساس نے خوش ہو کر کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"میں دیکھتا ہوں' کوئی ڈاکٹر یا نرس ہی ہوگی۔" بخشل نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ "جی یہ غضنفر صاحب کے لیے۔" ڈرائیور اسے باہر سے ہی تھما کر واپس چلا گیا۔

"ارے بیٹا! یہ تمہارے نام کوئی دے گیا ہے' پھولوں کا گلدستہ' مٹھائی کا ٹوکرا۔ اس کے اوپر رکھا کارڈ۔"

"کس نے بھیجا ہے؟" حمید نے اس سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"یہ پوچھنے کا اس آدمی نے موقع ہی نہیں دیا۔ بس غضنفر میاں کا پوچھا۔ میں نے کہا اندر ہیں۔ یہ تھمایا اور یہ جا وہ جا۔"

"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" غضنفر نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

بے حد مبارک ہو' کے ساتھ بیٹی کے جنم پر میری طرف سے یہ تحفہ' امید ہے پسند آئے گا۔
تمہاری حیا غضنفر حسنین۔

اس نے بلند آواز سے پڑھا۔

ماہم کو اچانک بے چینی نے آن گھیرا' دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔

"تحفہ یہ مٹھائی ہے۔" مخمل استہزائیہ ہنسا۔

"نہیں سپلور تک اسٹارلی مل میں اپنا حصہ بھی میرے نام کروایا ہے۔" لیٹر ہاتھ میں پکڑ کر لہرایا۔

مظفر کے چہرے پر حیرت تھی۔ جو اس کے لہجے سے بھی جھلکتی تھی۔ "رات میں نے طعنہ دیا تھا۔ شاید وہ اس طعنے کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہے۔ مکار، سمجھتی ہے مجھے جیت لے گی۔ اپنے ان ہتھکنڈوں سے۔"

"ارے بیٹا! اس نے جو بھی کیا، تمہارے حق میں تو اچھا ہی ہوا۔ اب تمہیں چیک سائن کروانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سمجھو، مالک ہو اب تم۔" حمید نے کہہ کر شانہ تھپتھپایا۔

"ارے ہماری بھتیجی بڑی بھاگوان ثابت ہوئی ہے۔ آتے ہی رحمت کے دروازے کھول دیے ہیں۔" مخمل نے چہک کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل۔" سب تائید کرنے لگے۔

"خالہ! یہ مٹھائی اسپتال کے عملے کو دے دینا۔" مظفر نے ٹوکرے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

صالحہ خاتون نے تسبیح پڑھتے ہوئے صرف اثبات میں سر کو جنبش دی۔

ماہم کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ وہ اسی کا تو حق تھا۔ اب تو اس کا قلعہ اولاد نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

محبت کی علامات ہر ذی روح کے احساسات سے مختلف ہیں۔ انسان دام الفت کا شکار، محبوب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ چاہے محبوب چاہے یا نہ چاہے۔ مگر محبوب کی دھتکار میں بھی عجب اک پکار پوشیدہ رہتی ہے۔

محبوب کا انکار، اقرار، نفی، اثبات، جھڑکنا، بلانے کے مترادف، دل کے جذبات ذہن کے احساسات پر صرف محبت کا سکہ رائج رہتا ہے اور محبت میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے، جب قربت اور فرقت بے معنی ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے والے ایک جادو اس لمحہ میں

قید ہو جاتے ہیں۔

عید آنے والی تھی۔ اس نے اپنی اسسٹنٹ کو ان اداروں کی لسٹ بنانے کو کہا، جہاں یتیم بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اس نے اس عید پر ان بچوں کو کپڑے، جوتے دینے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس کی این جی او کے ساتھ ایک میٹنگ تھی۔ جو غریب، ذہین بچیوں کو اسکالرشپ پروگرام دے رہی تھی۔ ان کے فائنانشل پروگرام کو وہ سپورٹ کر رہی تھی۔

"بیٹا! آپ خود کیوں نہیں این جی او بنا لیتیں۔" اک روز حسین رضا نے اس کو مشورہ دیا۔

"میں... تنہا اتنا کام سنبھال سکتی ہوں بابا؟" اس نے [illegible]

"ہم کاموں کے لیے ورکرز رکھیں گے۔ آپ صرف نگرانی کریں گی، اچھا ہے، اس سے کچھ لوگوں کو روزگار بھی مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔ جیسے آپ چاہیں، مگر ایک شرط ہے، جن تنظیموں سے میں وعدہ کرچکی ہوں، فنڈنگ کا وہ میں پورا کروں گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں بیٹا! آپ ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہتی ہیں تو کرتی رہیں؟ یہ کام ہم الگ کرلیں گے۔"

کچھ ہی دنوں میں حسین رضا نے نہ صرف حیا فاؤنڈیشن رجسٹر کروالی تھی۔ آفس بھی بنوالیا اور ساری آسامیوں پر مختلف ورکرز بھی رکھ لیے۔

اس کے لیے کام بہت آسان ہوگیا تھا۔

گوٹھوں، دیہاتوں میں غربت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ اس کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کی مفلوک الحالی اور غربت، تنگ دستی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرنا چاہتی۔

اپنا غم ان کے غموں کے آگے ہلکا پڑ جاتا۔ اپنا درد ان غریبوں کے درد دکھ کے سامنے بے معنی لگتا۔ وہ وقتی طور پر ہی سہی، مگر بہل جاتی۔

☼ ☼ ☼

"آج مریم کے اسکول کا پہلا دن ہے۔" ماہم نے منتظر کو اطلاع دی' جو بیرون ملک دورے سے رات دیر سے آیا تھا۔

"اچھا۔ ایڈمیشن ہو گیا اس کا؟" اس نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا! بچی روئے گی' آج تم خود چلی جاؤ اس کے ساتھ۔" ساجدہ خاتون کوئی دسویں بار یہ کہہ چکی تھیں۔

"خالہ! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ ساری دنیا کے بچے اسکول جاتے ہیں۔ سیٹ ہو جائے گی۔" ماہم نے ہنستے ہوئے دلاسا دیا۔

"تو یہ تو تمہارے ساتھ بھی ایک ماہ تک خود اسکول گئیں۔ کہیں ماہم کی' کوئی بچہ پٹائی نہ کر دے۔" خورشید نے بچپن کی بات بتا کر نواسی کی پیشانی چومی۔

"خالہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہیں لیکن' مگر اب آپ بھی بالکل ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے والی۔"

"ہاں تو بیٹا۔ اصل سے سود عزیز ہوتا ہے۔ تمہاری بچی میں تو ہماری جان ہے۔" خورشید کی تائید سب نے کی۔

"ہاں تو چلی جاؤ نا خالہ۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بچی ہے' فرسٹ ڈے پر تم ساتھ رہو گی' تو نارمل بی ہیو کرے گی۔" منتظر نے بھی تائید کی۔

"او کے۔ آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟" اس نے استفسار کیا۔

"شیور۔" منتظر مسکرایا۔

مریم فاطمہ اسکول ڈریس پہن کر رانی بنی بیٹھی تھی۔ سب کے درمیان۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں بعد مہرین سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دل کھول کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے سوشل پروگرامز کے بارے میں بتاتے اس کے چہرے پر انوکھی سی خوشی تھی۔

"میں نے اتنے سالوں میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہم اپنے سارے مسائل' غربت' لسانیت' دہشت گردی سب پر' کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اگر لٹریسی ریٹ بڑھ جائے۔ خواندگی کی شرح بڑھنے کے ساتھ مسائل کسی حد تک کم ہو سکتے ہیں' شعور کی بلوغت لوگوں کو انصاف کرنا سکھائے گی اور حق پر چلنا' اپنے مسائل کو حل کرنا سکھائے گی۔"

وہ روانی سے بول رہی تھی۔ جب اچانک اس نے دانت بھینچے' دونوں ہونٹوں کے درمیان "سی" کی آواز نکلی' چہرے پر اچانک تکلیف کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"کیا ہوا؟" مہرین نے فوراً" آئس کریم کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے آنکھیں نیم وا کر کے نفی میں سر کو جنبش دی' بھینچ کے لمبی سانس لی۔

"بخار تو ہے' کیا کہیں درد ہے؟" اس نے حیا کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ہمدردی سے تھپتھپایا۔

"درد کا اور میرا رشتہ تو سالوں سے جڑا ہوا ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"اتنی اذیت پسند مت بنو۔" مہرین نے اس کے دوسرے ہاتھ کو دیکھا۔ جو سینے کی دائیں سائیڈ پر رکھا ہوا تھا۔

مہرین نے اس کے اس ہاتھ کو ہٹایا۔ "یہیں پر درد ہے۔"

"ہاں۔ کبھی کوئی ٹیس سی اچانک اٹھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے' مگر ناقابل برداشت۔ مگر فوراً" ہی خود ختم ہو جاتی ہے۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا؟" مہرین نے اضطراب سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں' ٹائم نہیں مل رہا تھا۔"

"حیرت ہے' اتنی لاپروائی کہ ابھی تک سوچ رہی ہو' چلو اٹھو میرے ساتھ' میری دوست ہے' بہت اچھی ڈاکٹر ہے۔"

"ارے یار! بعد میں چلیں گے۔"

"دیکھو کوئی اپائنٹمنٹ لینے کی ضرورت نہیں

ہے۔ وہ اسپتال میں نہیں ہوگی تو فون پر فوراً" پہنچ جائے گی۔" اس نے پکڑ کر اٹھایا۔

"اوکے۔ اوکے۔ یہ تمہاری عجلت پسندی۔ اُفوہ!" وہ مسکرا کر نفی میں سر کو جنبش دینے لگی۔

"آغا خان چلو۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"کوئی پرانی چوٹ پیدا ہوئی ہے آپ کو؟"

ڈاکٹر بینش نے تفصیلی چیک اپ کے بعد کہا۔ اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا۔ نفی میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ مگر مہرین کی نظروں سے وہ سایہ چھپا نہ رہ سکا۔

"یہ کچھ ٹیسٹ ہیں' آپ کروالیں' رپورٹس آنے تک ہم حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے' باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔"

اسے سخت الجھن ہورہی تھی ڈاکٹر بینش کے سوالوں سے۔ ٹیسٹ کروا کے وہ جلد از جلد اسپتال کے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن پھر کچھ ٹیسٹ تھے۔ صبح سویرے ہی مہرین نے اسے پک کیا۔

وہ کل کے مقابلے میں کافی فریش تھی۔ بھورے مشکل ٹیسٹوں سے فارغ ہو کر وہ لنچ کرنے ہوٹل میں آ گئیں۔

لنچ کرنے کے بعد کولڈ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے مہرین نے اچانک سوال داغا۔

"یہ چوٹ تمہیں منتظر کی لگائی ہوئی ہے نا؟"

اس نے اضطراب سے مہرین کو دیکھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں تمہیں اچھی طرح سے جانتی ہوں ڈیر۔ تم کھلی کتاب ہو' محبت کرنے والے دوغلے نہیں ہوتے' وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے اندر ویسے باہر۔" مہرین کے باریک تجزیے پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ جسم کی تو اک چوٹ ہے۔ میری روح تو ایسی سینکڑوں چوٹوں سے بھری پڑی ہے۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

"دل کرتا ہے قتل کردوں اس کو جس نے تمہیں اتنا رلایا ہے۔" مہرین نے غصے سے کہا۔

"چھوڑو مہرین' کیوں جان جلاتی ہو' جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے' وہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ہر کوئی اپنے حصے کا رونا خود ہی روتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

اک دنیا بھول بھلیاں سی
اک کونگا بہرا اندھا دل

آج دل کو پھر قرار نہ تھا۔ سارے جسم و جان میں بے چینی کروٹیں لے کر بیدار ہوگئی تھی۔ وہ کہیں سے آجائے' اک بار اسے دیکھ لوں' وہ نہ سہی اس کی آواز ہی سن سکوں۔

اس نے فون اٹھایا۔ اس کا نمبر ملا کر کاٹ دیا۔ کیا فائدہ' وہ ابھی بھی نہیں اٹھائے گا۔ میں مسلسل کال کروں گی تو وہ جھنجلا کر فون ہی بند کردیتا ہے۔

وہ پھر بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو پونچھ کر پھر فون ملایا۔

"یا اللہ۔ اس کے دل میں ڈال دے میرا فون اٹھالے۔" اس کے صرف لفظوں سے ہی نہیں پور پور سے اخلاص ٹپک رہا تھا۔

ناقابل یقین جب فون سے اس کی ہیلو کی آواز ابھری۔

"منتظر! تم کیسے ہو منتظر؟" بے تابی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ٹھیک ہوں' تمہارے بغیر بہت خوش' اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ بہت مطمئن بہت آسودہ۔"

وہ اک اک لفظ اسے جتلا رہا تھا۔ باور کرا رہا تھا۔

اس نے کال کاٹ دی۔

وہ اور شدت سے رونے لگی۔ کیا ملا اس کی آواز سن کر بات کرکے۔

میں نے ایک انسان کی پرستش کی' اس کی سزا یہ ملی ہے کہ وہ کبھی بھی میرا ہو ہی نہیں سکا۔ پرستش تو صرف اس ذات یکتا کی کی جانی چاہیے' جو صرف دینا جانتا ہے' لینے سے بے نیاز' بے پروا ہے اور میری

وقوفی 'نادانی تو دیکھو کہ میں بھاگتی رہی اس کے پیچھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

انسان بہت بھٹکتا ہے۔ مٹی کی مورتیوں کے پیچھے' وہ مٹی ہی نکلتی ہیں۔ مٹی جو بکھر جاتی ہے۔ پک جائے تو ٹوٹ جاتی ہے۔ جو بار بار فنا ہوتی ہے۔ اس کی خاطر اس نے اپنی انا کو فنا کیا۔ خواہشات کو فنا کیا۔ اس کی خوشی کی خاطر غموں کو گلے لگایا۔ بس جس بات میں وہ خوش' جس طرح وہ خوش۔

وہ اگر اس کو چھوڑ کر خوش ہے تو وہ وصال سے دست بردار ہوگئی۔ اس کی فون کالز اس کے لیے باعث جھنجلاہٹ ہیں تو اس نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ مسیجز وہ بغیر پڑھے ڈیلیٹ کر دیتا ہے۔ اس نے مسیجز کرنا بند کر دیے۔ اپنی ہر خوشی کا قتل کیا۔ محض اس کی خوشی کی خاطر۔ پھر بھی وہ راضی نہیں مطمئن نہیں۔

"بندہ کبھی کچھ صلہ نہیں دیتا۔ بندہ تو صرف اپنی ذات کو' اپنی انا کو خوش رکھتا ہے۔ پھر یہ بے وقوفی ہی ہے کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کو اعلا تر بنا دیتا ہے اور محبوب حقیقی کو چھوڑ دیتا ہے۔ دور ہو جاتا ہے۔ انسان جاہل ہے کہ لوگوں کو اعلا' کم تر کو برتر اور اپنی ریاضت' محبت کو بہتر و معتبر بناتا ہے۔ اس غلط فہمی' خوش فہمی میں اللہ اسے پھر کسی بندے کے ہاتھوں ذلیل کرواتا ہے۔ وہ بھٹکتا ہے' اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ میں بھگت رہی ہوں' میرے مالک' کاٹ رہی ہوں سزا' میرے دل کو بدل دے' بدل دے۔"

ندامت کے آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ وہ جھکتی چلی گئی۔ نیچے کارپٹ پر سجدے میں پڑے پڑے اسے کتنی ہی دیر ہوگئی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کے دل پر خاموشی طاری ہوگئی۔ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ بے غم ہو کر سو گئی۔ اپنے سارے غم رب صمد کو سنا کر جیسا کہ بوجھ ہلکا ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

پاکستان ٹیکسٹائل انڈسٹری کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ اس نے تین اسٹالز لگائے تھے۔ ان اسٹالز کو چیک کر کے وہ باہر نکلنے کو مڑا۔ جب حسین رضا سے اس کا سامنا ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر حسین رضا کا ہاتھ اس کے شانے پر جم گیا۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

اس نے حسین رضا کے سوال کا جواب استہزائیہ مسکراہٹ سے دیا۔

"پتا نہیں تمہاری بدگمانی کب ختم ہوگی بیٹا؟"

"کبھی بھی نہیں کیونکہ میں اپنے باپ کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔"

"یقین کرو' میں نے اسے مارنے کی نیت سے انجکشن نہیں دیے تھے۔ وہ معمولی نشے کے انجکشن تھے۔ تاکہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول سکے۔ اسے ان انجکشن نے نہیں مارا بیٹا! غیرت مند آدمی تھا۔ غیرت کے صدمے نے مار دیا۔"

اس نے اپنے شانے پر رکھے حسین رضا کے ہاتھ کو جھٹکا۔

"اور کتنا جھوٹ بولیں گے۔ اب تو باز آجائیں۔"

وہ تیزی سے باہر آیا۔ گئے دنوں کی باتیں جو وقت کی دھول سے اٹ گئیں۔ وہ پھر صاف ستھری ہو کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

پتا نہیں کیوں اک گمان سا دل میں آ ٹھہرا کیا حسین رضا سچ کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بے اختیار سوچ رہا تھا۔ وہ سمندر پر آگیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنی رپورٹس خود لینے گئی تھی۔

"آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے مسز حیا!"

"مجھے اندازا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"آپ اتنی ذہین' پڑھی لکھی ہیں۔ پھر بھی اپنا خیال رکھ سکیں۔ اپنے آپ سے اتنی بے خبر ہیں۔" انہوں نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔

"جو سنانا چاہتی ہیں' بے دھڑک سنا دیں۔" وہ مسکرائی۔

اس نے رپورٹ پڑھ کر فائل بند کردی' اسے کوئی دھچکا نہیں لگا تھا۔ جیسے وہ پہلے ہی جانتی تھی۔

"لمبا علاج ہے۔ آپ ذہنی طور پر تیار رہیں۔ پہلے آپریشن کروانا ہوگا۔"

ڈاکٹر نے اسے کچھ اور ٹیسٹ لکھ کردیے تھے۔

وہ وہاں سے اٹھ کر ساحل سمندر پر چلی آئی۔

اسے یاد تھا۔ وہ ظالم لمحہ جب منتظر نے اسے دھکا دیا تھا۔ نیجل کا کونا اس کے سینے میں لگا۔ مگر سینے کے اندر دل کا درد اتنا شدید تھا کہ اس نے خیال ہی نہ کیا۔

زخم کینسر میں بدل گیا تھا اور ہڈیوں تک جا پہنچا تھا۔

وہ سمندر کے کنارے چلتی رہی۔

"تو حیا حسین! اس محبت نے تمہیں یہاں تک پہنچا دیا۔ کچھ لوگوں کو محبت جلا بخشتی ہے اور کچھ کو جلا بخشتی ہے۔ تمہیں اس نے خاک کردیا۔"

سمندر کی تنہائی سے گھبرا کر مڑی' اس کے عین سامنے منتظر کھڑا تھا۔ وہ پتھر کی ہوگئی۔ یہی حالت اس کی بھی تھی۔ دونوں کو دھچکا لگا تھا۔ اتفاقیہ ملاقات' کیا یوں بھی وہ ایک دوسرے کو سر راہ مل جائیں گے۔

ان دونوں نے تو ان راہوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جن پر ایک دوسرے کے ہونے کا امکان بھی ہوتا تھا۔

حیرت' سکون' خاموشی' وہ دونوں جیسے ساکت و مبہوت ہوگئے تھے۔

"کیسی ہو۔"

"منتظر حسین! میں تمہارے بغیر کیسی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

اس نے دونوں ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے' سسکی ابھری۔

وہ دونوں اپنی بے ساختگی پر حیران تھے۔

وہ خاموش تھا۔ حیا نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا' مڑی اور تیزی سے چلتی گئی۔

بعض دفعہ انسان اپنے محسوسات سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا کرے' اس کے پیچھے جائے' روکے یا ہمیشہ کی طرح اپنی راہ لے۔

☼ ☼ ☼

یہ خبر بجلی بن کر اس کے والدین پر گری تھی۔ سارا سرمایہ ایک دم ڈوب جائے تو کیا حالت ہوگی۔ وہ پاگل سے ہوگئے تھے۔ رو' رو کے حیرا کی آنکھیں دکھنے لگیں۔

حسین رضا نے دنیا کے مشہور ہاسپٹلز سے رابطہ کیا تھا۔ اس کی رپورٹس امریکہ اور برطانیہ کے بڑے ہاسپٹلز کو بھیجی گئی تھیں۔ شاید کہیں سے کوئی مثبت جواب مل جائے۔

امید' دعا' آسرا' تعلق' جیسی سہارے کی بنیاد پر وہ لندن جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اتنے کام' زندگی اتنی کم' اسے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ کیا کچھ نہ کرنا تھا' اور موت کی دستک سنائی دینے لگی تھی۔ نہیں' منتظر جیسی زندگی' ذرا' کچھ بھی نہیں۔

موت اور محبت میں کتنی مماثلت ہے۔ آہ۔ دل خالی۔ دامن خالی' ہاتھ خالی۔

نہ دنیا میں کچھ کرپائی' نہ ہی آخرت کے لیے۔ تیری مخلوق کی خدمت میں دل لگایا۔ وہ بھی پورا نہ ہوپایا۔

ایک بندے کے عشق میں عمر گنوادی' کیا ملا؟ صرف انتظار۔

بندے کا ارادہ تو کچھ نہیں' بندے کا اختیار بھی کچھ نہیں۔ پھر انسان زندگی کو اپنے اختیار' اپنی مرضی سے ہی کیوں گزارنا چاہتا ہے؟

یہ سوال بار بار اس کے سامنے سر اٹھاتا اور ہر بار اس کا سر اس رب صمد کے حضور جھک جاتا۔ جس کے پاس سارے اختیار' جس کا ارادہ صرف محتاج کن' جس کا علم ہر علم سے ماورا' جو زندہ۔ زندہ صرف زندہ۔ موت سے پاک' اونگھ سے۔ نیند سے ماورا۔ ماورالماورا' زندگی میں اس نے کبھی اس محبوب حقیقی کا حق ادا نہیں کیا۔ جو بے نیاز ہے' بھٹکا ہوا' اس کے پاس آئے تو۔ وہ دھتکارتا نہیں۔ تھام لیتا ہے' سنبھال لیتا ہے۔ یہی تو فرق ہے۔ حقیقی اور مجازی

محبوب میں۔

میں یہ ذلت بھگت چکی۔ بس اب مجھے پناہ دے۔

☆ ☆ ☆

"بیٹا! یہ انوی ٹیشن کارڈ پڑا ہے۔ چند دن سے۔ تمہارے کام کا تو نہیں ہے؟" خورشید نے جو اپنی نگرانی میں ماسی سے صفائی کروا رہی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھی صالحہ خاتون سے باتیں کرتی ماہم سے پوچھا۔

ماہم نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔

"اماں! یہ تقریب تو پرسوں ہو چکی ہے۔ اب یہ بے کار ہے۔"

اسے پتا تھا کہ اماں سارے اخبارات "کارڈز" پھینکنے نہیں دیتی ہیں۔ ان میں قرآن کا ترجمہ لکھا ہوتا ہے۔ پھینکنے سے بے ادبی ہوتی ہے۔ وہ لفظ کی حرمت برقرار رکھنے کی سخت قائل تھیں۔

"تم اس تقریب کا بتا رہی تھیں نا بیٹا! جہاں حیا آئی ہوئی تھی۔"

"جی خالہ! وہ مہمان خصوصی تھی۔"

"تمہارا اس سے سامنا ہوا؟"

"نہیں خالہ! میں تو اسے دیکھ کر آخری رو میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری دوست کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو جائے۔"

"مگر وہ آئی کیوں تھی بیٹا؟" خورشید نے سادگی سے پوچھا۔

"اماں۔ وہ این جی او کے مختلف پروجیکٹ کو اسپانسر کرتی ہے۔ اس لیے آئی تھی۔ ان لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ دینے، جن کے تعلیمی سلسلے کو اس نے سپورٹ کیا تھا۔"

"سنا ہے دل کھول کر لوگوں کی مدد کرتی ہے۔" خورشید دبے لہجے میں بولیں۔

"جی اماں! بہت سی این جی اوز کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اس نے خود بھی اپنی فاؤنڈیشن بنا رکھی ہے۔"

"ارے بیٹا! حسین رضا نے اتنی حرام کی دولت کمائی ہے۔ آخر کیا کرے گا" اچھا ہے، کچھ غریبوں کا بھلا ہو رہا ہے۔" بخشل ہنسا۔

"بس بیٹا! نبیوں کے گھر کافر، کافروں کے گھر نبی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ بے تو یہ بھی گناہ گار ماں، باپ کی اولاد مگر ہے نیک۔"

اندر آتا مظفر ان کی باتوں پر کچھ لمحے کے لیے باہر ہی رک گیا۔

"ہاں اماں! میری دوست بتا رہی تھی کہ تقریب اتنی جلدی اس لیے ارینج کی کہ اسی رات حیا کی فلائٹ تھی۔ لندن جا رہی ہے والدین کے ساتھ۔"

"ہونہہ۔ یہ بھی بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔"

"ہم بھی اب بڑے لوگ ہیں اب ہم بھی جا سکتے ہیں۔" بخشل اکڑ کے بولا۔

"ہاں بابا! کیوں نہیں۔ اب کے چھٹیوں میں ہم سب چلیں گے۔"

"مظفر بیٹا بھی آگیا۔" بخشل نے خوش ہو کر کہا۔ اس نے محسوس کیا، جیسے ماہم نے اس کو دیکھ کر دانستہ موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"وہ کہیں بھی جائے، اب اس کا علاج ممکن نہیں۔" ثمرین کو بار بار ڈاکٹر بینش کی بات یاد آ رہی تھی۔

اسے رہ رہ کے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ کیوں میاں کے ساتھ دبئی شاپنگ فیسٹیول چلی گئی۔ جب واپس آئی تو حیا، سمیرا پھپھو، انکل لندن چلے گئے تھے۔

اس نے فون کر کے حیا سے رپورٹس کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے "سب کلیئر ہے" کا بتایا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

ایک ماہ بعد اس کا میسج آیا تھا کہ وہ یورپ کے تفریحی دورے پر جا رہی ہے۔ وہ سال میں ایک بار بیرون ملک فیملی کے ساتھ جاتی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جس پر وہ چونک اٹھتی۔

اور آج جب بینش سے ملاقات ہوئی تھی تو بینش

نے حیا کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آج کل محترمہ یورپ گئی ہوئی ہیں۔"

"وہ کہیں بھی جائے' اب اس کا علاج ممکن نہیں۔ وہ اب لاسٹ اسٹیج پر ہے مہرین!" ڈاکٹر بینش نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی تھی۔

بینش کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازا ہوا کہ وہ شاکڈ رہ گئی ہے۔

"لگتا ہے تم لاعلم ہو۔ اس کی بیماری سے۔"

"یہ بات اس نے مجھ سے کیوں چھپائی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"تمہارے ٹرپ کو بدمزا کرنا نہیں چاہتی ہوگی۔ ایک اچھے دوست کی یہی نشانی ہوتی ہے مہرین۔" مگر آخر بھی وہ پریشان رہی۔

چاہنے کے باوجود وہ فون نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کیا کہے گی حیا سے' بار بار آنکھیں بھر آتیں' خود میں بات کرنے کا یارا نہ رہا تو اسے میسج کیا۔

"اب کیسی ہو حیا؟"

چند گھنٹوں بعد جواب آیا تھا۔

"پہلے" سے بہتر ہوں۔"

اس نے سکون کی سانس بھری۔ وہ اس کے "اب" سے بات سمجھ گئی اور وہ اس کے "پہلے" سے۔

کچھ لوگ کہی ہوئی بھی نہیں سمجھتے اور کچھ ان کہی بھی سمجھ جاتے ہیں۔ جو ان کہی سمجھ لیں ان کا شمار بہترین دوستوں میں ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

حیا نے اپنی غیر موجودگی میں حیا فاؤنڈیشن کی عارضی ذمہ داریاں مہرین کو سونپ دی تھیں۔ اس عرصے میں حسین رضا دوبار پاکستان آئے تھے۔ بزنس ڈیلنگ کے سلسلے میں' مگر یہ حقیقت تھی کہ اب ان کا بزنس میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ دونوں ہمہ وقت حیا کے ساتھ ہوتے۔ ان تینوں فریقوں کو اس بات کا اچھی

طرح اندازا تھا کہ جو وقت گزر رہا ہے' وہ پھر نہیں آئے گا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کی کوئی گھڑی ضائع نہیں کرتے تھے۔

وہ خود ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی ماں گھنٹوں اس کو تکتی رہتیں۔ پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ باپ کا دکھ وہ سمجھ سکتی تھی۔ جو اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔

اسے لگتا کہ صرف وہی نہیں اس کے ساتھ وہ دونوں بھی اس بیماری کو جھیل رہے ہیں۔ اس کے پاس اب بہت تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا اور اسے پاکستان میں بہت سے اہم اور قانونی فیصلے کرنے تھے۔

"میں پاکستان واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"جیسے آپ کی مرضی بیٹا!" حسین رضا نے اختلاف نہیں کیا۔

"مگر بابا! پہلے عمرہ کریں گے۔" اس نے حتمی فیصلہ سنایا۔ ان تینوں نے جوش و خروش سے عمرہ کی تیاری کی۔

"بابا! اگر حج تک مجھے مہلت ملی تو ہم حج بھی کریں گے' ورنہ آپ دونوں تو حج ضرور کرنا۔"

وہ لرزاٹھے' کانپ گئے۔

"کیسی باتیں کرتی ہے میری جان!" حمیرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"میں نے راتیں جاگ جاگ کر اللہ سے تیری زندگی مانگی ہے' تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ ماں کو گلے لگا کر تھپتھپاتی رہی۔ اپنے وجود سے دلاسا دیتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ سفید احرام میں بہت مشکل سے خانہ کعبہ کے غلاف تک پہنچی تھی۔ وہ اپنی ایڑیاں اوپر اٹھا کر غلاف تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔ پاؤں کی انگلیوں اور انگوٹھوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر ہر حالت میں غلاف کعبہ کو پکڑنا چاہ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ غلاف سے مس ہو رہا تھا۔ اس

کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"تو وہ خدا ہے' جس کو اسی سال تک بت کی پوجا کرتے بت پرست نے بھول کر یا صنم سے یا صمد کہا تھا اور تو نے فوراً" جواب دیا تھا۔

"لبیک یا عبد' میں حاضر ہوں میرے بندے!" اور ملائکہ نے کہا۔ "مولا' اس نے اسی سال تک یا صنم کہا ہے۔ بوڑھا ہو گیا ہے' او نکھ آگئی ہے۔ تب ہی غلطی سے یا صمد پکار بیٹھا ہے' تجھے نہیں پکارا۔ غلطی سے کہہ بیٹھا ہے۔ تو پھر بھی جواب دے رہا ہے اور تو نے فرشتوں کو کہا تھا۔ "پھر مجھ میں اور اس بت میں کیا فرق رہ جائے گا۔ جس نے اسی سال تک اسے جواب نہیں دیا۔"

میں اکیسویں صدی کی وہی بت پرست ہوں مالک یا صنم کہنے والی' ساڑوں تک صنم صنم کرتے' عمر کی ساری پونجی لٹا کر اب صنم سے صمد یاد آیا ہے اور صمد اتنا مہربان' اتنا رحیم' اتنا کریم' شکوہ نہیں کرتا' طعنہ نہیں دیتا' دھتکارتا نہیں۔

اپنے دوار سے لوٹاتا نہیں۔ فوراً" جواب عنایت فرما لیتا ہے۔

بے شک یہی تیری شان۔

یہی تیرا ظرف ہے۔

کوئی پلٹے تو تیری جانب

اور میں حیا حسین پلٹ آئی ہوں تیری جانب۔

مجھے اپنا لے۔

مجھے سکون دے۔

مجھے راحت دے اپنے ذکر میں۔

مجھے مصروف کرا اپنی فکر میں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی بہ آواز بلند دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اس کے دل پر سکون کا نزول ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو رب کعبہ کو سونپ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر لیٹ آیا تھا۔ چینج کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔ بیٹی کے کمرے میں آیا۔ اس کو پیار کر کے چادر ٹھیک سے اوڑھائی' اپنے کمرے میں آیا تو ماہم سو چکی تھی۔

کتنی پر سکون نیند تھی۔ زندگی کتنی مطمئن اور پر سکون ہے اس کی سنگت میں۔ اسے ماہم پہ پیار آرہا تھا۔

وہ چادر صحیح کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب میسج ٹون بجی' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جماہی لیتے ہوئے موبائل اٹھالیا۔

حیا کا نام اسکرین پر دیکھ کر ناگواری تو ضرور ہوئی مگر کافی عرصے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ پڑھے بغیر رہ نہیں پایا۔

"ارمان بچارے تھے' زندگانی کے اتنے
جب ہم نہ رہے تو کچھ بھی پیار نہ رہا
"زندگی' جو میری آنکھوں میں جیتی تھی" آنکھوں میں ہی مر گئی۔ اب آخری بار ملنے کے لیے آجاؤ' کہیں حسرت دیدار نہ رہ جائے۔"

"مکر و فریب تو تم لوگوں کی ذات سے منسلک ہے۔ پھر کوئی نیا ڈرامہ کیا ہے؟؟"

اس نے جواب دے کر فون رکھا تھا کہ اس کا میسج پھر آیا۔ وہ پڑھنے سے رہ نہیں پایا۔

"محبت ہم جیسوں کے لیے روح کی تکمیل ہوتی ہے۔ تمہیں کیا پتا منتظر حسنین! تم کیا جانو' ہم کوزہ گروں نے جہان معلوم کے خزانے سے کیسے کیسے موتی چنے اور محبت کے خزینے پائے۔ اب محبت مجھے تہجد پڑھنے والے کی طرح اطمینان قلب مہیا کرتی ہے۔"

اس کے پاس اس کے میسج کا کوئی جواب نہ تھا۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا' جو اس کے میسج کا جواب دے دیا۔ شاید یہی وہ چاہتی ہے۔ نیند آئی تو مگر بڑی مشکل سے۔

اس کے دوسرے میسج کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے تک بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔

سر شدید درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ تھکن ہاتھوں، ٹانگوں پورے وجود میں اتر گئی۔ وہ بیڈ سے اٹھی۔ بے چین گھبرائی اور وہیں کمرے میں ٹہلنے لگی۔

دس سال اتنی لمبی، اتنی کڑی ریاضت۔ کیا پایا؟ وہ آج بھی وہیں کھڑی تھی۔ اسے لگا، یہ دس سال کا سفر پاتال کا سفر تھا۔ عروج کا نہیں زوال کا سفر، جہاں وہ غروب ہو گئی۔

جتنا اس کی چاہت کی دلدل سے نکلنا چاہا، اتنا دھنستی چلی گئی۔

تھکاوٹ اس کی رگوں سے گزر کر دل کے اندر پہنچ گئی۔ اس نے کئی بار سوچا، عشق طلب سے ماورا ہے۔ محبت میں لین دین کا کوئی سلسلہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ محبت تو دین ہی دین ہے۔ مگر اب تھک گئی تھی۔ دس سال اس نے صرف دیا تھا۔ لیا کچھ نہیں، اس کی جھولی محرومیوں، نفرت اور دھتکار سے بھری ہوئی تھی۔

وہ اس اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر سے پھسلتے چلے گئے۔ بے قرار کم یا زیادہ ضرور تھی۔ وہ لڑکھڑائی، بے چینی سے بڑھ گئی۔ اسے کسی کل چین و قرار نہیں تھا۔ یا پنے بیڈروم میں چکراتی رہی۔

مختصر چاند پر بیٹھا تھا اور وصل کا لمحہ ناقابل تسخیر تھا۔ وہ چکور کی طرح چکراتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا۔ وہ اس کے گرد چکرا چکرا کر مر جائے گی۔

وہ رات کے مہیج بھول چکا تھا۔ ناشتہ کر کے آفس پہنچا۔ ایک اہم کاروباری وفد سے ملاقات تھی۔ اس معاہدے کو حتمی شکل دے کر میٹنگ روم سے آفس میں آیا تو بیرسٹر وقار احمد کو موجود پایا، مصافحہ کر کے انہوں نے اس کے سامنے ـــ ایک فائل رکھی۔

"حیا بی بی بیمار ہو کر ہاسپٹلائز ہو گئی ہیں۔ یہ وصیت نامہ ہے ان کا انہوں نے اپنے حصے کی جائیداد کا کچھ حصہ "آپ کی بیٹی مریم فاطمہ کے نام کر دیا ہے اور اکاؤنٹ میں ان کے حصے کی جو رقم بچتی ہے حیا فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کی ہے۔ ایک اور اہم بات، جب تک ان کے والدین حیات رہیں گے تب تک وہ حیا فاؤنڈیشن کے چیئرمین رہیں گے۔ ان کی وفات کے بعد بورڈ آف گورنرز کی سربراہی مریم فاطمہ کریں گی اگر وہ بالغ ہو گئیں، ورنہ ان کی بلوغت و تعلیم مکمل ہونے تک یہ ذمے داری آپ نبھائیں گے۔

اور سب سے اہم اور خاص بات حسین رضا اور حیا حسین کے نام باقی جو جائیداد ہے۔ وہ حیا فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کر دی گئی ہے۔"

بیرسٹر صاحب اور کیا کچھ کہتے رہے۔ اس کی سوئی ان کے اس جملے پر اٹک گئی تھی۔ "حیا بیمار ہو کر ہاسپٹلائز ہو گئی ہے۔"

اس سے آگے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جانے کتنے لمحے گزر گئے۔ کب وقار صاحب گئے۔ دل میں ایک انوکھی سی کسک نے سر اٹھایا تھا۔

"میں اس سے محبت نہیں نفرت کرتا تھا۔ پھر کیوں اس کی بیماری نے پریشان کر دیا؟"

وہ حسب معمول گھر گیا۔ ماہم کے ساتھ شام کی چائے پی۔ لان میں مریم کو کھیلتے دیکھتا رہا۔ ماہم سے باتیں کر کے اپنا دھیان بٹانا چاہا۔

"آپ کی طبیعت تو صحیح ہے؟" ماہم نے اس کی بے ربط، بے دھیان سی گفتگو سے اندازہ لگایا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ریسٹ کر لیں۔ کام کی اتنی ٹینشن لیتے ہیں تاکہ اپنا خیال رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" وہ خاموش رہا۔ مگر اندر اندر "حیا ہاسپٹلائز ہو گئی ہے۔" کی گونج جاری تھی۔ ماہم نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے لاؤنج سے اٹھایا اور بیڈ روم میں لے آئی۔

"پلیز۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔" اور وہ اس کے کہنے پر بچوں کی طرح آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ ماہم آہستہ سے دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے دل کے اندر دھڑکنوں سے بھی ایک ہی آواز آ رہی تھی، حیا بیمار ہو گئی ہے۔

ہر طرف یہی شور تھا۔

حیا بیمار ہو گئی ہے۔اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ یہ اچانک کیسی بے چینی نے اسے آن گھیرا تھا۔ اس کے دل سے آواز اٹھی اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اسے حیا کے پاس ہونا چاہیے۔ وہ اپنی اس خواہش پر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا' وہاں نفرت نہیں۔ اس کی جگہ ہمدردی مقیم ہو گئی تھی۔ وہ اس ہمدردی کو محبت کا نام دینے سے ڈر رہا تھا۔ میں بھلا کیسے اس سے محبت کر سکتا ہوں۔ وہ میرے والدین کے قاتلوں کی اولاد ہے۔ مگر وہ حیران رہ گیا۔ جب دل نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ دل تو اس وقت کچھ بھی نہیں سوچنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت اسے صرف حیا حسین یاد تھی۔ جس نے اسے چاہا۔ اس سے ٹوٹ کر محبت کی۔ ایسی ٹوٹ کر کہ وہ خود ٹوٹ گئی۔ اس نے سیل فون اٹھایا۔ حیا کے نمبر پر کال کی۔ فون پر جواب موصول نہیں ہوا۔ اس نے بیر سٹر وقار سے فون پر اسپتال کا نام پوچھا۔

گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ماہم نے پوچھا۔ وہ اسے حیران ہی چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' کسی سے بھی بات کرنے کو۔

☆ ☆ ☆

"کوئی مجھ سے یہ ساری جائیداد' ساری دولت لے جائے' مجھے میری بچی کی زندگی دے دے۔ میں سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔" حسین رضا کسی سے کہہ رہے تھے۔ اس نے اک نظر اس ٹوٹے ہوئے شخص کو دیکھا۔

انہوں نے اسے روکا نہیں' نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ دس سال تک انتقام لیتے لیتے نفرت کا جذبہ کہیں سرد ہو گیا تھا۔ ایک انسان بھلا کتنی نفرت کر سکتا ہے۔ جبکہ یہاں تو بندہ محبت سے بھی تھک جاتا ہے۔ وہ بھی نفرت کرتے تھک گیا تھا اور وہ کیسی لڑکی تھی۔ جو نفرت پا کر بھی نہ تھکی' وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ جب ہیرین باہر نکلی۔ وہ عین دروازے کے بیچ کھڑی تھی اور غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ بیماری دینے والے بھی آپ ہی ہیں۔ یاد ہے اپنا وہ ستم' دھکا دے کر ٹیبل کے کونے پر گرایا تھا۔ تب تو صرف درد دل ہوا' مگر پھر یہ ناسور بن گیا۔ اس کی جان کا۔"

اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک رہی تھی۔ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اف وہ اک چھوٹی سی غلطی' اتنا بڑا ناسور' میں بھی قاتلوں کی صف میں آ کھڑا ہوا۔ ہوا میں معلق ہو رہا ہو جیسے۔

"سب سے بڑے ناسور تم ہو' ظالم انسان!" ہیرین کا غصہ اسے غصہ نہیں دلا رہا تھا۔ وہ اسے حق بجانب تصور کر رہا تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو ایک لفظ بھی نہ تھا۔

حسین رضا نے بڑھ کر ہیرین کو بازو سے پکڑ کر آگے سے ہٹایا۔ اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ سامنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ بہت کمزور نحیف' وہ جب آخری بار سمندر پر ملا تھا۔ تب تو وہ ٹھیک تھی اچانک ان دو سالوں میں کیا ہو گیا تھا۔

اس نے دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ کسی مجرم کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اس کے قریب آیا۔

"مجھے یقین تھا منتظر حسنین! تم ضرور آؤ گے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ خوشی سے یا غم سے' وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ بمشکل ایک جملہ بول پایا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ منتظر حسنین کا عکس دھندلا پڑ گیا تھا۔

"دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی' مدھم آواز میں شکستگی جھلکتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں دقت ہو گئی۔

"تم۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

سب سو سر فریب ہیں' کیا ان کا اعتبار
چار دن حسن و عشق' جوانی' محبتیں

اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ صرف موت ہے۔" اس کے لبوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ ابھری۔

وہ بیڈ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس پر جھکا۔

"تم تو سراپا محبت ہو اور محبت حیات کی نوید ہے۔"

حیا حسین چند لمحوں تک اپنے اوپر جھکے مختصر حسنین کی آنکھوں میں اپنا مرجھایا ہوا عکس دیکھتی رہی۔

موت کیا ہے؟ اک لفظ بے معنی
جس کو مارا' زندگی نے مارا

لبوں نے جنبش کی اور مختصر حسنین کے پاؤں تلے سے ایک بار پھر زمین سرک گئی۔ وہ ڈھارس دینے میں ناکام ہو گیا۔ اس کی سماعتوں پر محیط نفرتیں' دھتکاریں' بھوت بن کر اس کے ارد گرد ناچنے لگیں۔

حیا کی موندی ہوئی آنکھوں کے کونے سے ایک بے آسرا آنسو نکل کر کنپٹی میں گم ہوا۔ مختصر حسنین کے گرد پچھتاووں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

"انکل! اپنا نہیں' وہ ظلم کیا رہے گا اس کے ساتھ۔" مہرین تڑپ رہی تھی۔

"کچھ نہیں کرے گا بیٹا۔ میں نے آج اس کے اٹھتے قدموں سے جان لیا ہے۔ آج وہ جیتا ہوا نہیں' جیتی بازی ہارا ہوا لگ رہا ہے۔"

اسی وقت وہ باہر نکلا تھا۔ مہرین فوراً" کمرے کے اندر گئی۔

حیا اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

"دیکھا' میں نہ کہتی تھی' وہ ہار جائے گا میری محبت سے۔" سوال کا جواب یہ تو اور آیا۔

"اسے ہارنا ہی تھا۔ نفرت محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی' ہار جاتی ہے۔" اس نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"سنو مہرین۔!" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔ "زات میں نے پہلی بار اسے بھول کر اللہ کو پکارا تھا اور اللہ نے اسے سارے کا سارا میری طرف پھیر دیا۔ اللہ کتنا کریم ہے نا۔"

"ہاں بے شک اللہ بہت بڑا کریم ہے۔" مہرین نے بھیگی آواز میں جواب دیا۔

"مہرین!" اس کی آواز میں اشتیاق تھا' حیرانگی' تجسس اور خوشی۔ "میں نے پہلی بار اس محبت کو محسوس کیا ہے' جو اللہ کو اپنے بندے سے ہے۔" اللہ کتنا کریم ہے نا۔"

اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس محبت کی عجیب روشنی چمک رہی تھی۔ "آج میں نے اس کی آنکھوں میں وہ محبت دیکھی' جو دس سال سے خود بچتی رہی ہوں۔"

"تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا؟" اس نے مہرین کو بے یقینی ضبط کرتے دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے یقین ہے۔" مہرین نے اپنے بے اختیار بہنے والے آنسوؤں کو فوراً" ہاتھ کی پشت سے پونچھا۔

"میں نے سمجھ لیا نہیں۔" اس نے فوراً" نفی میں سر کو جنبش دی۔ "نہیں۔ میں نے نہیں سمجھا' اس نے اپنے فضل سے مجھے سمجھایا' میرے دل پر الہام کیا کہ سب "اسی" کے ہو جاتے ہیں' جو صرف "اس" کا ہو جاتا ہے۔"

حیا نے "اس کا" پر ہاتھ کی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی تھی۔

"اس کی محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

جو بقا کی طرف دوڑا' وہ کامیاب' جو فنا کی طرف دوڑا وہ ناکام' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

☼ ☼ ☼

وہاں کاریڈور میں سب تھے۔ سوائے حمیرا کے اس کی ہمت نہیں پڑی پوچھنے کی شاید ماں ہے' برداشت نہیں کر سکتی۔

"کیوں بیٹھے ہیں آپ یہاں' ہمارے ضبط کا امتحان

لینے؟" میرین ایک بار پھر آئینہ بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ میری بیوی ہے۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

"مگر یہ بات دس سال بعد آپ کو یاد آئی ہے؟" طنزیہ لہجے پر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ اٹھ کر باہر آیا مگر اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ گھر جائے' پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔

ماہم کے فون پر فون آرہے تھے۔ اس نے جھنجلا کر سیل آف کر دیا۔ سر کار کی سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ اسے کسی کل چین نہ تھا' بار بار آنکھیں بھیگ جاتیں' اس کی نیند' بھوک سب اڑ چکی تھی' ندامت سی ندامت تھی۔

"تم نے تو اس بے گناہ سے معافی بھی نہیں مانگی خضر حسنین!"

ضمیر نے ملامت کی' اس کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی' وہ فوراً" باہر نکلا۔ گاڑی کو لاک بھی نہیں کیا' سیل بھی نہیں اٹھایا' تیز تیز قدم اٹھا کر اندر آیا۔ اس کے بیڈ کے گرد ڈاکٹر کھڑے تھے۔

"پلیز۔ آپ باہر جائیں۔" ڈاکٹر نے اس سے درخواست کی۔

"پلیز ایک منٹ!" اس نے ڈاکٹر سے منت میں اجازت چاہی۔ وہ اس پر جھکا' اس وقت اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ سانس بہت تیز تیز چل رہی تھی۔

"حیا! مجھے معاف کر دو' اللہ کے لیے' مجھے معاف کر دو۔" وہ رو پڑا۔

ڈاکٹر نے اسے بیڈ سے دور کیا۔ اس نے دیکھا' وہ سب وہاں موجود تھے مگر گونگے آنسو بہا رہے تھے۔

ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ خضر کے دل میں اس کے لیے محبت کا سمندر موجزن ہو رہا تھا' اس کی اکھڑتی سانسیں اس کے دل کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔

وہ اپنے اس احساس کو مرنے والی سے ہمدردی کا نام قطعی نہیں دے سکتا تھا۔

"یہ ہمدردی نہیں ہے۔" اس کے دل کی ہر دھڑکن اعتراف کر رہی تھی۔ اس کی بے پناہ چاہت کا۔

وقت کی پرواز بہت تیز تھی۔ اور خضر کے ہاتھ میں ناپید' ایسا جال' ڈور ناپید جس سے وہ وقت کو باندھتا' روکتا۔

ایسے طلسم و سحر و وظیفے سے بھی یکسر ناواقف تھا وہ اس لمحے خود کو بے تحاشا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

انسان کتنا مجبور و لاچار ہے' کسی بھی بات' وقت' حالات' حتیٰ کہ اپنے دل احساسات اور آنسوؤں پر بھی اس کا بس نہیں چلتا' اس نے اس سے جانا' انسان کی بذات خود کوئی وقعت' حیثیت' حاکیت نہیں' وہ صرف مجبور محض ہے۔

اس سے تو اپنا دل بھی کنٹرول نہیں ہو تم۔ اس نے اس کی سانسوں کے ساتھ اپنے ڈوبتے دل کو اتھاہ تاریکیوں میں محسوس کیا۔

رات اس کے ہاتھ سے پھسلتی تھی' اور وہ رات کے ساتھ' حیا کو بھی پکڑنے میں ناکام ثابت ہوا۔ وہ دور نکل گئی۔

جان ہی دے دی' جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

"تمہارے ہاتھوں کا کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ حیا جب اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے' تو میں ہر نوالے کے ساتھ اس کا ہاتھ چومتی ہوں۔ اللہ نے پتا نہیں ہماری کس نیکی کا صلہ دیا ہے' ایسی اچھی بیٹی دے کر۔ اللہ کرے وہ ٹھیک ہو جائے' رات فون پر بات ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی' اماں بہت جلد سری لنکا سے آنکھیں ڈونیٹ ہوں گی میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ آپ کے آپریشن کے لیے میں نے کہا' جب آنکھوں کا آپریشن ہو گا' تو سب سے پہلے تمہیں دیکھوں گی۔ میری بیٹی تو وہ ہے' اللہ اسے صحت و تندرستی سے نوازے۔ بڑی دعائیں ہیں غریبوں کی اسے' تم سن رہی ہو سکینہ!"

"جی۔ جی۔ بیگم صاحبہ!" سکینہ نے ہچکی روکتے

ہوئے کہا۔

"ناشتا کرلیں جی! بھروائی بھی لینی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر دوائی کھانے کے بعد حیا کا نمبر ملا کر دینا' پتا نہیں کیوں رات سے دل ڈوب رہا ہے' آواز سنوں گی تو قرار آئے گا' ماں ہوں نا آخر' اس کو کچھ ہوتا ہے' طبیعت بگڑتی ہے' تو میرا دل خود بخود ڈوبنے لگتا ہے۔

سکینہ! ہمیں پر ہونا سن رہی ہونا میری باتیں۔"

"جی۔ جی بیگم صاحب!" سکینہ نے اپنے خاموش آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آج پتا نہیں کیا بات ہے۔ حلق میں نوالے پھنس رہے ہیں۔ شاید اندرونی بخار ہے' یا مجھ اور صبیح حسین سے بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ "حیا سوئی ہے تم ناشتا کرلو' پھر بات کرواؤں گا اب دیکھو کیسے شرارتیں باندھتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی۔" وہ حیا کا تصور کر کے ہنسیں۔

"پتا ہے سکینہ! یہ ان باپ بیٹی کی عادت ہے' حیا جب چھوٹی ہوتی تھی' مجھے اگر بخار ہو جاتا اور کھانا اچھا نہ لگتا' تو یہ دونوں بھی کھانا نہیں کھاتے' کہتے تم کھاؤ گی' تو ہم بھی کھائیں گے' ورنہ نہیں اور حیا باپ کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوتی' آج بھی مجھے کھانا اچھا نہیں لگ رہا مگر حسین نے... وعدہ کر چکی ہوں کیا کروں۔" وہ چند نوالے کھا کر رک گئی۔

"بس اب اور نہیں۔" اس نے ٹرالی کو اپنے آگے سے ہٹایا۔

"بیگم صاحب ٹیبلٹ!" اس نے ان کے ہاتھ پر ٹیبلٹ رکھ کر دوسرے میں پانی کا گلاس تھمایا۔

"یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے گلا خراب ہے کیا؟"

اس وقت ایمبولینس آکر رکی۔ سکینہ زور زور سے رونے لگی۔

باہر ٹینٹ لگ چکے تھے' مہمان آرہے تھے۔

"کیا ہوا سکینہ؟" ان کا دل ہول گیا۔

"حیا بی بی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" سکینہ نے ہچکیوں کے درمیان بات مکمل کی۔

"نہیں۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے' حیا مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ نہیں نہیں' حیا نہیں مر سکتی۔"

سکینہ ان کی وہیل چیئر دھکیل کر ہال میں لے آئی۔

"حیا مر گئی۔"

اٹھتی سسکیوں نے اسے یقین دلا دیا۔

وہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ حیا کے مردہ چہرے کا لمس محسوس کر رہے تھے۔

"حیا! اٹھو بیٹا! مجھے زندہ درگور تو نہ کرو' حیا کچھ تو بولو میری جان' مجھے تمہارے ہاتھ کے سوا کھانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

حیا ان کی کسی پکار و سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر رونے لگیں۔

"کیا ہوا' یہ کیا ہو گیا؟"

"پھپھو جان! صبر کریں۔ صبر کریں۔" مہرین اس کو پکار کر زار و قطار رونے لگی۔ اس نے ٹٹول کر مہرین کے ہاتھ پکڑے۔

"حیا نہیں مر سکتی' حیا نہیں مر سکتی۔" وہ بھول گئی تھیں کہ حیا تو اس دن مر گئی تھی۔ جب ان کے دیدوں کا پانی ختم! سوکھ گیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے شوہر کو مار دیا تھا۔ ان کی اندھی آنکھیں حیا کا آخری دیدار کرنے سے قاصر تھیں۔ اس نابینا پر خنجر سمیت سب کو رحم آرہا تھا۔ مگر ان کی مدد کرنے سے لاچار و مجبور سب بے بس ان کی ساری کوتاہیوں' چوٹیاں بن کے ان کے جسم پر رینگنے لگے۔ ان کے کیے ظلم اس کے سامنے استادہ تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگے' اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی نازوں پالی بیٹی کو مٹی میں دفن کیا تھا۔

ہم اپنے نفس کی نگہبانی نہ کر سکے۔ اب دریدہ دامن لیے خس و خاشاک پھانکتے ہیں۔

کھے سے ذائقہ گیا' دولت سے مسرت گئی

وحشت ہے۔ جو آنکھوں پہ پہرے رہتی ہے' کب زندگی کے باقی ماندہ دن کٹیں گے کب آنسو خاک ہوں گے' یا وہاں بھی نا آسودگی ہماری منتظر ہوگی۔ ہم اندھا دھند جائز ناجائز' حرام وحلال کی تفریق کیے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔

ہماری اندھی خواہشوں کے اندھے راستوں نے ہمارے گھر کی اکلوتی شمع کو بجھا دیا۔

کاش۔ کاش اس دن میں اپنے بھائی سے جائیداد کا حصہ لینے نہ جاتا' اتنی دولت نے کون سی خوشی دے دی۔ انسان بھلا کتنا کھا سکتا ہے۔ کتنا لٹا سکتا ہے۔ یہ بہت زیادہ تھی۔ میرے لیے میری بیٹی' بیوی ساری عمر عیش کرتی رہتی تب بھی کم نہ پڑتی اور اب تو بیٹی بھی نہیں۔

ہم نے روایات کے پیچھے مذہب کو بھلا دیا' اسی لیے اسلام نے دیور بھابھی کا بھی پردہ کروا دیا۔ نامحرم کے ساتھ تنہائی کو منع کیا۔

یہ کتنا آسان تھا اگر ہمارا معاشرہ رسم ورواج اور روایتوں کی زنجیر میں نہ جکڑا ہوتا۔

اگر شادی سے قبل حمیرا سے رضامندی پوچھ لی جاتی۔

اگر معاشرہ اسے طلاق لے کر پسند کی شادی کرنے کی اجازت دیتا۔

نہ وہ ڈرامہ کرتی نہ وہ قاتل بنتی۔ اپنی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے اسے اتنے گھناؤنے کام نہ کرنے پڑتے۔

طلاق کو ناپسندیدہ فعل ہونے کے باوجود جائز قرار دیا گیا' ایسے ہی ناپاک گناہوں کو نابود کرنے کی خاطر۔

چور دروازے بند کرنے کی خاطر اسلام نے ہر جائز دروازہ فطرت انسان کی کمزوری کی بنا پر کھلا رکھا' اس لیے محض رسم ورواج کا مذہب نہیں۔

پورا ضابطہ حیات اور دین فطرت ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جو صرف مجھ سے ہی نہیں بلکہ میری خوشبو میری پرچھائیوں سے بھی محبت کرتی تھی وہ میرے انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی۔

جو کفارہ بنی کسی گناہ کا' وہ مجھے گناہ گار کر گئی۔

وہ جس کا وجود آنکھوں کی لالی' سوہنا سراپا' سب محبت تھی۔

میں نے اس کو الٹ دیا۔

لبوں کی لالی کو آنکھوں کی لالی میں بدل دیا۔

طلب کو مسلا اس کے سراپے پر نفرت کا داغ لگایا' مگر اس کے باوجود وہ خوب صورت ہی رہی۔ کملا مرجھا کر بھی۔

بس میں ہی کور چشم رہا۔

وہ کس سے محبت کرتا' اپنے دل سے جو ماتم زدہ تھا۔

اپنے ان شفیق چچا سے جنہوں نے ماضی کا کوئی شائبہ تک ظاہر نہیں ہونے دیا' ہمیشہ محبت وشفقت سے پیش آتے۔

وہ پورے تین دن بعد گھر آیا تھا' وہاں اس کی غیر موجودگی نے کہرام مچایا ہوا تھا۔

"غضب خدا کا' وہ اس کے سوگ میں حسین رضا کے ہاں بیٹھا ہوا ہے۔" حمید کا غصہ تو کسی طور کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔

وہ آیا تو دوپہر کا کھانا میز پر لگ چکا تھا۔

"آیئے کھانا کھالیں۔" گو کہ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور حلیہ دیکھ کر ہاشم کو دھچکا ضرور لگا تھا' مگر اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم اس کا غم منا رہے ہو بیٹا' جو تمہارے والدین کے قاتلوں کی بیٹی تھی' اچھا ہوا جو حسین رضا اور حمیرا کو اپنی زندگی میں کیے کی سزا مل گئی' خس کم جہاں پاک۔"

آخری بات نے اس کو بے حد طیش دلا دیا' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس کریں ماموں! بہت ہو چکا۔ حمیرا کو سزا مل گئی حسین رضا نے بھی سزا بھگت لی۔ لیکن مختصر حسنین نے جو کیا' ایک بے گناہ کو سزا دی۔ اس کا حساب بھی کہیں درج ہو رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کے بار بار یاد

دلانے پر' بھڑکانے پر اس سے انتقام لیتا رہا جس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ جو صرف محبت کرنا جانتی تھی۔ ان لوگوں نے جو بھی جوانی کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر جو کیا' اس کی تلافی کرنا چاہتی' مجھ سے معافی مانگ لی۔ مگر جو میں نے ایک بے گناہ کے ساتھ کیا۔ اس کی کیا تلافی ہے؟ میں کس سے معافی مانگوں' یہ سمجھا دیجیے۔

"اصولاً" تو میں آپ لوگوں کا خیال رکھ سکتا تھا۔ الگ گھر میں بھی رکھ سکتا تھا۔ آپ کو "محبت و عزت سے" اور بخشش کو بھی بھاری رقم دے سکتا تھا۔ اس کی اور اس کی بیٹی کی زندگی سنوارنے کے لیے اور خود حیا کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکتا تھا۔ اس محبت سے بھری لڑکی کا کیا قصور تھا۔ جس کو آپ لوگوں کے طیش دلانے پر میں نے ہر طرح سے انتقام کا نشانہ بنایا۔ میں بھی اپنے باپ کی طرح کانوں کا کچا ہی نکلا۔

آپ دونوں تو اپنا ذاتی انتقام بھی میرے ذریعے لیتے رہے تھے اور مجھے یہ بات سمجھنے میں اتنے سال لگ گئے۔ جب کچھ بھی باقی نہ بچا۔"

وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ طلب تھا' ملک بن کر دکھا دیا' اس وقت وہ سب اس سے ... کی تک رہے تھے۔

"آپ لوگوں نے ماہم کو آگے بڑھایا۔ اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حمیرا نے حسین رضا کو پانے کے لیے جال بچھایا تھا۔ ماہم نے حیا کی بدولت اس کے شوہر کو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اپنی اداؤں سے مجھے محبت کا اسیر کیا۔

حمیرا اور حسین رضا کی سزا پر خوشی منانے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ ماہم اور میری بھی ایک بیٹی ہے اور ایک بے گناہ کو میں بھی قتل کرنے کا مرتکب ہوا ہوں۔ اور اس میں ماہم کی کوشش بھی شامل رہی ہے۔ ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟"

ماہم کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ وہ آسمان سے فرش پر آگری۔ وہ جیت کر بھی ہار گئی تھی' اور حیا ہار کر بھی جیت گئی تھی۔

اسے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں حیا کی محبت' کرم نوازیاں' اعلا ظرفی خنظر کو اس سے چھین نہ لے۔

ایسا ہی ہوا' وہ اس کا تھا' مگر اب لگتا ہے کہ ایسا تو کبھی بھی نہیں تھا۔ اسے اپنی کم حیثیتی کا جو لاوا اک تھا۔ وہ آج نکل کر سامنے آگیا تھا۔ ہم کو اپنی کم ظرفی کا احساس ہوا تھا اور حیا بہت بلندی پر نظر آتی تھی۔

"کچھ لوگ زندگی میں ہی مر جاتے ہیں' اور کچھ لوگ مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ حیا مر کر خنظر کے دل میں زندہ ہو گئی۔ اور میں اس کی زندگی میں ہو کر بھی اب نہیں رہی۔"

ماہم نے ... سے آنسو پونچھے۔

خنظر جا چکا تھا' ان سب کو آئینے میں ان کے چہرے دکھا کر۔

☼ ☼ ☼

وہ ان سب کے پاس پھر آیا تھا۔ ان کے پاس بیٹھا تھا۔

وہ ان کی بیٹی کا قاتل تھا اور وہ اس کے باپ کے قاتل' دونوں حساب میں برابر تھے۔

دونوں کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ایسے مواقع پر ویسے بھی ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

وہ جس خاموشی سے آیا تھا' اسی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا' یہ نشانی تھی اس بات کی کہ وہ اب ان کے ساتھ رابطہ رکھنے کا خواہش مند ہے' اور جو اس کے ساتھ رابطہ رکھنے کی خواہش مند تھی' وہ اپنی خواہشوں کے ساتھ منوں مٹی تلے جا سوئی۔

حسین رضا اب بہت کم آفس جاتے' ان کی بزنس ڈیلنگز منیجرز کرتے' فائلیں دستخط کے لیے گھر لے آتے۔

ان کا معمول تھا' روزانہ کچھ وقت حیا کے کمرے میں گزارتے۔

سکینہ سے روز اپنی نگرانی میں صفائی کرواتے۔ بیٹی کے لکھے ہوئے لفظ پڑھتے' روتے اور اللہ سے اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کرتے۔

حیا نے ایک جگہ ڈائری میں لکھا تھا۔

"میں ایک مٹی کے بت کی پوجا کرتی رہی اور خالی ہاتھ رہی۔ واقعی بت کسی کو کچھ نہیں دیتے جیسے ابو جہل اور ابو لہب مقسوم ٹھہرے۔

محبوب تو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ میں اس کو منا نہیں پائی مگر میں نہیں چاہتی۔ اللہ مجھ سے روٹھ جائے۔"

وہ لفظ لفظ پڑھتے' روتے۔

کاش میری بیٹی صنم سے صمد تک آجاتی تو اسے اپنی ریاضتوں کا صلہ بارگاہ الٰہی سے لبیک کی صورت ملتا۔

ہائے انسان! ہائے انسان... انا کا مارا ہوا۔

فنا کی طرف دوڑنے والا... وہ روتے رہتے۔

"یا اللہ تو میری بیٹی پر رحم کر۔ اس کی روح کو شاد رکھ۔ اسے اپنی رحمت سے نواز۔"

وہ حمیرا کی تیمارداری اور دل جوئی کے بعد اپنا زیادہ تر وقت حیا فاؤنڈیشن کے کاموں کی نگرانی میں گزارتے۔ مختلف فلاحی کام کرتے۔

لوگ کہتے' کتنے رحم دل ہیں۔ فرشتہ ہیں فرشتہ۔

وہ سن کر شرمندہ ہو جاتے۔ اندر ہی اندر احساس ندامت مار ڈالتا۔ وہ بھٹکے ہوئے انسان تھے۔ بھٹک کر سیدھی راہ پر آئے تھے۔ مگر ماضی کے گناہ کا داغ سینے پر پیوست تھا۔

"یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ یہ لوگ نہیں جانتے میرا گناہ' پر تو تو ہر گناہ کو جانتا ہے۔ میرے گناہوں سے درگزر فرما۔"

☼ ☼ ☼

وہ اکثر بے قراری سے سمندر کے کنارے آتا۔ بے چینی اسے کھینچ کے لے آتی۔

ماہم کی محبت بے لوث ہوتی تو شاید اسے واپس لے آتی مگر اس کے پیچھے تو دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ بیٹی پر نظر پڑتی تو اپنے گناہ یاد آجاتے ماہم کی طرف بڑھتا تو حیا کا سراپا اس کے سامنے آجاتا۔ یہ ماہم ہی تھی جس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اپنے حسن کی پٹی باندھ دی تھی۔

اس نے اس دن کے بعد ان کو کسی اور بات کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ لیکن ان سے بہت دور ہو گیا تھا بلکہ خود سے بھی دور ہو گیا۔

وہ اپنی ذات میں بہت تنہا ہو گیا تھا۔ حیا کی باتیں' یادیں پل پل اس کے ساتھ تھیں۔

میں کہیں سے گزروں' وہ مجھے یاد آتی ہے۔

میں کہیں رکوں' وہ مجھے یاد آتی ہے۔

اک لفظ سے اللہ نے کائنات بنائی۔

محبت بھی اک لفظ ہی ہے۔

جس کا نزول کسی بھی قلب پر کائنات باطن سجا دیتا ہے۔

خوشیوں کے گل بوٹے غم کے بنجر بیاباں ابھر کے صحرا وصل کے دریا بہا دیتی ہے۔

وہ اس کے سامنے آجاتی ہنستی کھلکھلاتی۔

"زندگی میں جو لوگ ایک بار ٹوٹ کر محبت کرلیں' پھر ان کو دوسری محبت کی ضرورت نہیں رہتی۔"

ہنی مون کا خوش گوار لمحہ اس کے تصور کی اسکرین پر آموجود ہوا' منتظر حسنین کی اب سمجھ میں آیا کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تھی ورنہ محبت اس طرح ٹھکرائے جانے والی چیز تو نہیں تھی۔

مجھے چین کیوں نہیں آتا

ایک ہی شخص تھا' جہاں میں کیا

اس کی جدائی کے بعد اس کے بالوں کا رنگ سرمئی ہو گیا اور کنپٹیوں پر سفیدی اگ آئی تھی۔

عمر کی فصل پک چکی اور محبت کے کھیت اجڑ چکے تو وہ عقل کے میدانوں کا شہسوار بنا' عقل اسے زمان و مکان کے بیچ لٹکائے رکھتی۔

وہ کبھی محبت کے زمانے میں سانس لیتا۔

کبھی اپنے لٹے مکان میں فرستادہ ملتا۔

وہ جو منتظر حسنین تھا۔ منتظر ہی رہ گیا۔

اس کی گھنی گانی پلکوں تلے اداسیوں کے ڈیرے جم گئے۔

"ایک دن آئے گا' جب تم میری محبت سے بار

جاؤ گے۔"

یادوں نے آنکھیں بھگو دیں۔

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے نفرت سے ہنکارا بھرا تھا۔

اس کے کہے لفظ اس کا منہ چڑا رہے تھے' وہ دن آگئے تھے۔ وہ پورے کا پورا خود کو ہار بیٹھا تھا۔

وہ ہر وقت صرف اس کی محبت کے زمانے میں سانس لے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر زندگی جاری ہے۔

مگر میری زندگی تو اس کے ساتھ جا سوئی ہے۔

میں اس کے بعد ہنسا۔ مگر دل سے نہیں۔ کھایا پیا' بچوں بیوی کے ساتھ آؤٹنگ' میل ملاپ' بزنس سرکل میں اٹھا بیٹھا۔

سب ہو رہا ہے' مگر صرف دنیا کو یقین دلانے کو کہ میں زندہ ہوں۔ میری موت سے صرف میں ہی واقف ہوں۔ میرے اندر بسا اک اندھیرا جہاں۔ جس میں اندھوں کی طرح بھٹکنا میرا مقدر ہے۔

محبت سے منہ موڑنے اور کسی بے قصور کو قصور وار قرار دے کر سزا دینے کی سزا بھگت رہا ہوں۔

اندھیرے غاروں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔

تجھے یاد تو دلائیں

تجھے یاد بھی تو آئیں

کبھی عہد جو کیے تھے

ہمیں قول جو دیے تھے

کبھی کانپتے لبوں سے

کبھی اشک کی زباں میں

کبھی کنج گلستاں میں

کسی کوئے رہ رواں میں

کسی دوست کے مکاں میں

تو کہاں چلی گئی تھی

سمندر کی موجیں ابھر کر ساحل کی طرف آتیں پھر واپس تھما پلٹ کر چلی جاتیں۔

منچلے موجوں سے چھیڑ خانی کرتے پھر خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔

تو کہاں چلی گئی تھی۔

تیرا بے قرار انشا

تیری جستجو میں حیراں

تیری یاد میں سلگتا

کبھی بستیوں' بنوں میں

کبھی سوئے کوہ صحرا

کبھی شور شمع رکوایا

کبھی بے کس و تنہا

لیے [illegible] تمنا

[illegible] آرزو سراپا

[illegible] پھر جگہ پکارا

تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ ہارا

[illegible] زندگی تھی

تو [illegible] چلی گئی تھی

انشا جی کی نظم اسے رلا رہی۔ اس نے تھکے ماندے مسافر کی طرح واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے پتا نہیں۔ وہ بھی صنم سے صمد تک سفر کر پائے گا یا نہیں۔

☼

بی سحر ملکہ

چھ سوالوں

"رضوان۔ تمہاری اور حسنہ کی شادی طے کر رہے ہیں ہم لوگ۔"

تو یہ خبر تھی یا بم جو میرے سر پر پھٹا تھا۔ دل چاہا "فوراً" جواب دے دوں۔ لیکن کیا کروں اپنی فارن ڈگریوں کا لحاظ کرنا پڑا۔ کیونکہ ابا میاں "فوراً" سے پیشتر الماری سے میرے کاغذات نکلواتے اور جلانے کا حکم صادر فرما دیتے۔ ویسے بھی جب سے میں لندن سے واپس آیا تھا وہ گاہے بگاہے اپنے نادر خیالات مجھ تک پہنچاتے رہتے تھے۔

"بھئی۔ وہ اور لوگ ہوں گے جنہیں [illegible] دھن دولت چاہیے ہوگی۔ ہمیں تو ادب و احترام ملنا چاہیے۔ نافرمان اولاد کو دھکے دے کر گھر سے نکال دینا چاہیے۔ ہاں اس کی ڈگریاں اپنے پاس رکھ لینی چاہئیں۔ آخر ماں باپ کی محنت اور پیسے سے پڑھے لکھے ہیں۔ جب ان کی عزت نہیں کی جاتی تو ان کی محنت کی ڈگریوں پر بھی کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔"

بھلا ابا میاں کو کیا پتا کہ مجھ سے لائق فائق طالب علم موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر رات دن ایک کر کے گھر سے دور رہ کر یہ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں تو بھلا اس میں ماں باپ کی محنت کہاں سے آ گئی۔

خیر ابا میاں کو میں یہ سب تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ البتہ اماں کے سامنے اپنا رونا ضرور رو سکتا تھا اور میں رو دیا بھی مجال ہے جو اماں نے روایتی فلمی ماؤں کی طرح مجھے گلے سے لگایا ہو' پچکارا ہو' ماتھا چوما ہو۔ اس کے برعکس اماں نے ٹھیک ٹھاک کھری کھری سنا ڈالیں۔ انہیں بھی یہ سب میری ڈگریوں کا فتور لگ رہا تھا۔ ان کے مطابق مغرب کے نافرمان معاشرے کا رنگ چڑھا ہوا تھا مجھ پر۔ سوچ سوچ کر میرا دل ہول رہا تھا۔ اصل میں حسنہ میری ماموں زاد ہے۔ ہوگی کوئی بیس اکیس سال کی۔ دیکھے ہوئے تو اسے اک عرصہ گزر گیا۔ سو شکل و صورت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں حسنہ کے تصور سے ذہن کے پردے پر اک چھ سات سال کی موٹی سی لڑکی۔ جس کے ایک ہاتھ میں آئس کریم مطلب قلفی' جو اس وقت ایک روپے کی ملتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں رومال سے ملتی جلتی کوئی چیز ہمہ وقت ناک پونچھنے کے لیے ہوتی تھی۔ کی شبیہ لہراتی تھی۔ وہ گلا پھاڑ کر چلاتی تھی کہ الاماں۔ بال اس کے چڑیا کے گھونسلے جیسے تھے۔ باقی اس کے بارے میں کچھ خاص یاد نہیں۔

میں نے اماں سے اس ناانصافی کی وجہ پوچھی تھی کہ اتنا پڑھا لکھا کر اگر قربانی ہی کرنی تھی تو پانچ' دس سال پہلے بتا دیتے۔ لندن میں دو چار گوریوں سے عشق لڑا کر میں بھی عرف عام میں خوش ہو جاتا۔ خیر وہ وقت تو گیا۔ اماں کا کہنا تھا بچپن سب کا ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اماں نے میرے بچپنے کی تعریف میں چند ٹھیک ٹھاک کلمات کہے تھے جو بوجہ شرم و شرمندگی لکھنے سے قاصر ہوں۔ بچپن سے مجھے نمو یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی میری کزن ہی تھی۔ خالہ زاد نمو مجھے شروع سے پسند تھی۔ گورنمنٹ اسکولوں کی کھڑوس پرنسپل کی طرح نک چڑھی اور مغرور۔ نہ مٹی میں کھیلتی تھی نہ کھانے کے اوقات کے علاوہ کھاتی تھی۔ صاف ستھری اور نفیس طبیعت والی۔

اماں سے دبے لفظوں کہا بھی تھا کہ نمونہ سہی۔ لیکن لڑکی کم از کم اس کے جیسی عادات و اطوار والی دیکھیں۔ لیکن اماں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔

"اگر یہی کام میں کروں تو نالائق' نافرمان اور پتا نہیں کیا' کیا کہوں۔ تمنے وہ غلط ہوتے ہیں نا یہ اصول بھی۔"

آج کل اماں اور ابا میاں نے میری زندگی برباد کرنے کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے۔ اس پر عمل در آمد کروانے کے لیے ماموں کے گھر جانے کا سوچ رہے ہیں۔ تاکہ ضابطہ کارروائی عمل میں لا سکیں۔

کیا تھا اگر میں پاکستان میں ہی رہتا۔ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا احساس کچھ کم ہوتا کہ چلو جی میری اوقات ہی یہی ہے' لیکن اب۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ لڑکیاں اکثر روتی کیوں رہتی ہیں۔ ہر معاملے میں دب دل مارنا پڑے تو پھر رونا ہی آتا ہے نا۔

"رضوان یہ گلی کے کونے سے ہو تمہیں۔ میں گھو اور بسکٹ تو لے آؤ ذرا۔"

"اماں۔" میری احتجاجی آواز اتنی لرزیدہ تھی کہ مجھے لگا میں نے کسی زنانے ۔۔۔ بھی ہے۔

"پہلے یہ سامان۔۔۔ آ کر بات کرنا۔ اور ہاں۔" اماں نے سر سے پاؤں تک مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھے لگا میری شرٹ یا پتلون پھٹی ہے۔ کہیں سے جو اماں کے تاثرات ایسے ہو رہے ہیں۔ "واپس آکر ڈھنگ کے کپڑے پہن لینا تیرے ماموں آ رہے ہیں۔" اماں کے لہجے کی مٹھاس نے میرے حلق میں کونین انڈیل دی تھی۔ میرے قدموں سے تیں پیسے لے کر گلی میں آ گیا۔

ایک تو سزائے موت کی سزا سنا دی۔ دوسرا رو دھونے کا بھی وقت نہیں دیتے۔ لندن میں جہاں بھی میں جیسے بھی رہا لیکن سوچتا تھا واپس پاکستان جاؤں گا تو طرح طرح کی اسٹائلش شرٹس' ٹراؤزرز' جینز پہنوں گا۔ لوگوں کو پتا چلے کہ آخر لڑکا لندن سے پڑھ کر آیا ہے۔ لیکن یہاں آکر تو سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ جن ڈگریوں کے بل بوتے پر میں نے اکڑ دکھائی تھی۔ وہ میرے لیے طعنے کا روپ اختیار کر چکی تھیں۔ میرے کپڑوں پر اماں سے زیادہ ابا میاں کو اعتراض تھا۔ پچھلے ایک مہینے سے کم و بیش ہزار بار "فرنگیوں کا لباس' بیہودیوں کا پہناوا" کہہ کہہ کر میری بے عزتی کر چکے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنی بے عزتی کے بعد بھی انہیں مجھ سے محبت کا دعوا کیسے تھا؟

گلی میں لوگوں کا کٹنا نہ ہوتا تو میں وہیں رو پڑتا۔ گھر لوٹنے تک ماموں صاحب قدم رنجہ اور میری خوشیوں پر وبال کا پتہ پھوڑ چکے تھے۔

"شکر ہے اب کچھ پہچان میں آ رہا ہے۔ ورنہ مہینہ بھر پہلے جب آیا تھا بالکل ہی چھوٹا سامنہ ہو رہا تھا۔" گھر کی ماموں نے بڑی محبت سے گلے لگا کر یہ ارشاد فرمایا تھا۔ پر بھی مجھے ان کی ہنسی طنزیہ لگی۔ یوں جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہوں' کون تھا یہاں جو میرا دکھ سمجھتا؟ آج بڑی شدت سے زندگی میں دوستوں کی کمی کا



احساس ہو رہا تھا۔ کوئی دوست ہوتا کوئی غم گسار ہوتا تو میں بھی اپنا حال دل کہہ لیتا۔ حال دل سے مجھے حالی یاد آگیا۔

مولانا حالی نہیں۔ میرا لندن کا دوست حالی۔

دوست ہی ہے۔ وہ میرے خیال سے ورنہ دشمنی تو اس نے ہزار بار دکھائی ہے۔ کرایہ ادا کرنے کے دنوں میں سرے سے ہی غائب ہو جاتا۔ کھانے کا بل دینے کی باری پر اس کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور پھر وہ ایسا ٹوائلٹ جاتا کہ فلیٹ پر ہی اس سے ملاقات ہوتی۔

کہتے ہیں پتھر بھی پاس رکھا ہو تو کام آجاتا ہے۔ یہ تو پھر انسان تھا۔ پہلی فرصت میں۔ میں نے حالی کو کال ملائی۔ انٹرنیشنل کال تھی۔ اس لیے مختصر لفظوں میں حالت زار سنا کر مشورہ مانگا۔

"مزکیوں میں بھلے عقل کی کمی ہو عزت نفس کی کمی نہیں ہوتی' کسی طرح اپنا انکار اس تک پہنچا دے۔ وہ خود ہی انکار کر دے گی۔"

"کمینے۔ اب تو دشمنی سے باز آجا۔ اگر اس عقل کی اندھی نے ابا میاں تک یہ بات پہنچا دی تو قبر کی جگہ چالیسواں ہو جائے گا میرا۔" میں نے بتایا تھا کہ یہ دشمن تمہارا دوست ہے۔

"بدھے۔ "اس نے فوراً" بدلہ چکایا۔ "انکار اس طرح کر کہ بعد میں کہہ سکو کہ سامنے مکر گئی اور اگر بالفرض تمہاری اس سے شادی ہوگئی تو تم اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دو گے وغیرہ وغیرہ۔" میرا دل عش عش کر اٹھا میری صحبت کا اثر رنگ لے ہی آیا کہ حالی عقل مندانہ باتیں کرنے لگا تھا۔

اب میں اس تاک میں تھا کہ کہیں سے ان محترمہ کا فون نمبر مل جائے اور میں اپنے دل کی بھڑاس نکالوں۔ برا ہو اس وقت کا جب میرے ماں' باپ ان پڑھ رہ گئے۔ انہوں نے سب کے نمبر انگلش کے حرفوں سے محفوظ کیے تھے۔ تصغر آنٹی کا "اے" سے عظمی بھابھی کا "یو" سے اور اسی طرح زیڈ تک نمبر محفوظ تھے۔ ایسے میں بھلا اس کا نمبر کہاں سے ڈھونڈ تا۔ کزنز سارے ہی سنجیدہ' بردبار' وقت سے پہلے بوڑھے تھے۔

ان سے پوچھنا عبث تھا۔ اتوار کو اماں اور ابا میاں نے بات پکی کرنے جانا تھا اور اب صرف دو دن باقی تھے۔

پہلے کی نسبت میں اب کم پریشان تھا۔ اب میں نے مردانہ وار جا کر آمنے سامنے بات کرنے کی ٹھانی۔ ابھی تک ماموں کے گھر بات نہیں پہنچی تھی۔ سو مجھے "خوش آمدید" کہنا ان کی مجبوری تھی۔ صبح ہی صبح میں نے نہا دھو کر کلف لگا شلوار قمیص پہنا۔ جیل سے بال سیٹ کیے۔ بائیک جو کہ ابا میاں کی ملکیت تھی دھو دھلا کر باہر نکالی اور اک فرضی دوست سے ملاقات کے بہانے گھر سے نکل گیا۔

اب یہ میری بدقسمتی تھی یا کم ہمتی نہیں ابا میاں کی بائیک کا قصور۔ جیسے ہی میں اس کا رخ ماموں کے گھر کی طرف موڑتا یہ مڑ جاتی' نکل کے کہیں اور جا نکلتی۔ مجھے لگ رہا تھا یہ وائیک نہیں' بلکہ ابا میاں کا سدھایا ہوا ازلی گھوڑا ہے۔ تین گھنٹے شہر کی گلیوں اور بازاروں کی خاک پھانکنے کے بعد آخر کار میں ماموں کے گھر پہنچ ہی گیا۔

"بیٹے اگر گھر پتا چلے کہ میں ادھر آیا ہوں تو میری کیا درگت بنے؟" فی الحال اس خوف کو تسلی کی چادر اوڑھا کر سلاتے ہوئے میں بائیک سے نیچے اترا۔ پکی چوڑی سڑک کی بائیں جانب بنا لوہے کا بڑا گیٹ حسب سابق کھلا ہوا تھا۔ چھوٹا سا باغ نما حصہ پار کر کے میں مرکزی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔

دل زور' زور سے چلا رہا تھا۔ اسے ڈپٹ کر چپ کرواتے میں نے گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' سات' سوا سات' ساڑھے سات' پونے آٹھ' آٹھ' پھر آٹھ' پھر آٹھ' پورے آٹھ' پکے آٹھ۔

اصل میں دل ہی دل میں میں نے سوچ رکھا تھا کہ دس تک گنتی پوری ہوتے ہی میں ادھر سے بھاگ جاؤں گا اور اہل خانہ اسے محلے کے کسی بچے کی شرارت گردانیں گے۔ میرے مستقبل کا مسئلہ نہ ہوتا تو کون بے وقوف ادھر کا رخ کرتا۔

"جی کون؟" اک سریلی سی ترنم۔ آواز مجھے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔

"جی میں رضوان۔"

"کون رضوان؟" اک لمحے کی تاخیر سے جواب آیا تھا۔

"آپ دروازہ تو کھولیں۔"

"آپ جیسی لوگوں کے لیے اس گھر کے دروازے نہیں کھلا کرتے۔ تعارف کروائیے اپنا۔" اس کے لہجے میں عجیب سی کھنک تھی۔ ماہی ہو نہیں سکتیں اور... اور حسنہ؟

"آپ غالباً" حسنہ ہیں۔ میں آپ کا ہونے والا منگیتر ہوں رضوان۔" اندر مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ویسے منگیتر کی جگہ میں "نکرا" کہنے والا تھا۔

"گھر پر کوئی موجود نہیں۔ آپ کسی اور وقت تشریف لائیے گا۔" اب کی بار آواز کچھ اور دھیمی ہوئی تھی۔

"دیکھیں میں آپ ہی سے بات کرنے آیا ہوں۔ آپ پلیز دروازہ کھولیں۔" اس کی مترنم آواز بھی مجھے میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اپنے... یہ لگا دل کو میں یہ بات ہر دس سیکنڈ بعد بتا رہا تھا۔

"میرا دروازہ کھولنا مناسب نہیں۔" [illegible] تھا کہ فدا ہوا جا رہا تھا۔

"شریعت بھی ایک بار تو سامنے ہونے کی اجازت دیتی ہے اور پھر... یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔" میں کہنے والا تھا دل کا معاملہ ہے رخ زیبا کی زیارت بخش کر میرا نصیب فروزاں فرمائیں۔ لیکن بروقت زبان پر قابو پا لیا۔

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد چوبی منقش دروازہ چرمرا کر کھلا۔ اس کے ساتھ ہی میرا منہ اور آنکھیں بھی۔

"واللہ... کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی شبیہہ دن رات مجھے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔"

اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں زمین سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس کی لرزتی پلکوں پر میرا دل لرزنے لگا تھا۔ ستواں ناک میں نازک سی لونگ چمک رہی تھی۔ اس کے کٹاؤ دار خوب صورت ہونٹوں پر دل کٹ مرنے کو تیار تھا۔ متناسب سراپا و خوش قامت۔ اس کی مرمریں گردن شاخ گل کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

"اب آپ جائیں۔ کسی نے آپ کو ادھر دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔" اس کی آواز میں گویا سات جھرنوں کا ساز تھا۔ میں بالکل ساکت و صامت کھڑا تھا۔ وہ شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن مجھے تو ہوش بھولا ہوا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی یہ نظر میرے انکار کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ متحیر کی کانچ جیسی شفاف بلوریں آنکھیں۔ دل چاہا اماں اور ابا میاں کا مرید ہو جاؤں۔ میری خاموشی پر سٹپٹا کر وہ اندر چلی گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں ہوش میں آیا۔ گویا طلسم ٹوٹا ہے۔ وہ اک پری کی طرح نکلی اور مجھے مسحور کر گئی۔ ابا کی رفرف پر اڑتا ہوا میں گھر پہنچا تھا۔ دل و دماغ پر کامنی سی حسنہ چھائی ہوئی تھی۔ مجسم [illegible]

خیر میں کب ابا میاں اور اماں جا کر بات پکی کر آئے اور کب منگنی کا دن آیا۔ انھیں یہ لگ رہا تھا کہ ان کی ضد کے آگے تھک ہار کر میں نے سمجھوتا کر لیا ہے۔ سو میری دلجوئی کے لیے ابا میاں طرح طرح کے وعدے کر رہے تھے۔ سرفہرست میری پسندیدہ گاڑی دلوانے کا وعدہ تھا۔ میں بھی میسنی عورتوں کی طرح دل میں پھوٹتے لڈوؤں کو چھپا کر چہرے پر مظلومیت طاری کیے بیٹھا تھا۔ سب سے مزے کی بات یہ ہوئی کہ ابا میاں فخر سے ہر ایک کو میری ڈگریوں کی تفصیل معہ سعادت مندی فراہم کر رہے تھے...

دوسری بار یہ کہ مجھے حسنہ کو یہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی کہ وہ کسی سے میری آمد کا ذکر نہ کرے کیونکہ وہ بے چاری خود از حد ڈری ہوئی تھی۔

نبیلہ عزیز

قصہ ایک شام کا

مادرا مرتضیٰ، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگائی ہوئی ہیں۔ مادرا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ فی الحال اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ وہ سارا پہلے بہت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئرپورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً سماشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ، ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بیٹے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بہترین دوست ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی منگنی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں گھوم رہا ہوتا ہے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں لے لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔ مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔



اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجہ خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت' تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی مارخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا' عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ماشا سے بیان کر دیتی ہے۔ ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر' ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کر دیتا۔ تیمور' ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات قیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق تو مہی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور' فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکیج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کر لیتی ہے۔

— ۱۲ —
بارہویں قسط

کراچی ریلوے اسٹیشن پہ بے حد رش تھا۔

طرح طرح کی آوازیں اور طرح طرح کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن اس بہت زیادہ رش اور شور شرابے کے باوجود عافیہ بیگم پچیس سال پیچھے چلی گئی تھیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے پچیس سال پہلے کا وہ کرب ناک منظر تازہ ہو گیا تھا جب بی گل نے گھٹ گھٹ کے روتی عافیہ بیگم کو بڑی مشکلوں سے سہارا دے کر ٹرین میں سوار کیا تھا اور عافیہ بیگم کراچی شہر کی سرزمین سے جدا ہوتے ہوئے تڑپ گئی تھیں۔ اور وہ یونہی روتے ہوئے ٹرین کی چھک چھک کی آواز کے ساتھ اس شہر سے چلی گئی تھیں اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر سے دور ہو گئیں۔

اور آج ایک طویل عرصے بعد عافیہ بیگم کراچی شہر کی سرزمین پہ پاؤں نکالتے ہوئے حوصلہ مجتمع نہیں کر پا رہی تھی۔

"بہن جی۔! راستہ دیجئے۔" ٹرین کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی عافیہ بیگم کو ایک قلی نے متوجہ کیا تھا۔ وہ چونک کر ایک طرف ہو گئیں۔

"امی پلیز۔ کب تک کھڑی رہیں گی۔ لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔ پلیز نیچے آئیے۔" ماورا نے ذرا خفگی سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا۔ انہوں نے آہستگی سے گردن موڑ کر بی گل کی سمت دیکھا۔ اس وقت بی گل کے علاوہ کوئی ان کے جذبات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ان کی سگی بیٹی بھی نہیں۔

اسی لیے بی گل نے اس بار بھی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں اسی پرانے مضبوط سہارے کا سا احساس دلایا تو اور عافیہ بیگم قدرے سنبھل گئیں۔

"امی۔۔۔!" ان کا دوسرا مضبوط سہارا بھی ان کے ساتھ ہی تھا جب ہی انہوں نے اپنی آنکھوں کے نم گوشے پونچھتے ہوئے اپنے پاؤں ٹرین سے نیچے اتارے۔

"وصی مرتضیٰ۔۔۔!" ان کے دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی اور یوں لگا جیسے پورے شہر میں پھیل گئی ہو۔

"ماورا۔۔۔!" اک بہت ہی پُرجوش سی پکار تھی جو اتنے زیادہ شور کو چیرتی ہوئی ان تک پہنچی تھی۔ ان تینوں نے بیک وقت چونک کر اس جانب دیکھا۔

فارہ اور آفاق اتنے ہجوم میں رستہ بناتے ہوئے ان ہی کی طرف آرہے تھے۔

"ماورا۔۔۔!" فارہ قریب آتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ ماورا نے بھی اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"کیسی ہو۔۔۔؟" ماورا نے بہت اپنائیت سے پوچھا اور فارہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"میں جیسی بھی تھی، مگر اب بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی ہوں کیوں کہ تم یہاں آگئی ہو۔ آج تمہارا نہیں، میرا خواب پورا ہوگیا ہے۔" فارہ چہکتے ہوئے بولی۔

"سیم ہیئر۔۔۔! میری فیلنگز بھی کچھ ایسی ہی ہیں۔ ایزی رہو۔۔۔ السلام علیکم آفاق بھائی۔۔۔!" ماورا ذرا ہٹ کے کھڑے آفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! کیسی ہیں آپ؟" آفاق بھی فارہ کی خوشی میں خوش تھا۔

"السلام علیکم آنٹی۔۔۔! السلام علیکم بی گل۔۔۔! کیسے ہیں آپ لوگ۔۔۔ سفر کیسا رہا؟" فارہ عافیہ بیگم کے مزاج کے پیش نظر ذرا جھجکتے ہوئے ہی ان سے مخاطب ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔!" عافیہ بیگم مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گئیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! جیتی رہو، خوش رہو، اللہ سدا سہاگن رکھے۔۔۔! ہم بھی اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں اور سفر بھی الحمدللہ بہت اچھا گزرا ہے۔" وعا سلام کی باقی کسر بی گل نے پوری کر دی تھی اور فارہ سر جھکا کے رہ گئی۔

"لائیے آنٹی۔۔۔! سامان مجھے دیجئے، میں گاڑی میں رکھواتا ہوں، آپ لوگ چلیے گاڑی میں بیٹھئے۔" آفاق نے آگے بڑھ کر عافیہ بیگم کے ہاتھ میں پکڑا بیگ تھاما۔

"آئیے بی گل۔۔۔!" فارہ انہیں ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن کے خارجی دروازے کی طرف بڑھی۔ ان کا باقی سامان آفاق نے ڈرائیور اور قلی سے گاڑی میں رکھوایا۔

فارہ انہیں اپنے ساتھ لے کر چلے آئی تھی اور آفاق ان کے پیچھے ان کا سامان دوسری گاڑی میں لے کر آیا تھا۔

فلیٹ کی چابی فارہ کے پاس تھی۔

فلیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی بی گل اور عافیہ بیگم کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

✲ ✲ ✲

انتہائی وسیع و عریض اور لگژری فلیٹ ماورا مرتضیٰ کی توقع کے عین مطابق تھا۔ البتہ بی گل اور عافیہ بیگم کی توقعات سے بہت بڑھ کے تھا جس کی وجہ سے عافیہ بیگم کے دل میں اعتراض کا ابال اٹھا تھا مگر وقتی طور پر اس ابال کو دل میں ہی دبا گئی تھیں۔ کیوں کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب اس طرح کے چھوٹے چھوٹے اعتراض کرنے اور نکتے اٹھانے سے کیا حاصل تھا۔ سو انہوں نے خاموشی بہتر جانی۔

"ٹھیک ہے فارہ۔۔۔! میں چلتا ہوں، تم ڈرائیور کے ساتھ آجانا۔" آفاق دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ دونوں سہیلیاں بہت عرصے بعد ملی ہیں اس لیے ان کی باتوں کو ابھی کچھ وقت لگے گا۔

"او کے تھینک یو... میں آجاؤں گی۔" قارہ حقیقتاً "آفاق کے اتنا ٹائم دینے پہ اندر سے بہت خوش ہوئی تھی۔

"تھینک یو آفاق صاحب! آپ نے ہمارے لیے اتنا ٹائم نکالا" اتنی مدد کی خوشی ہوئی کہ آپ اپنی بیوی کی فرینڈ کا اتنا خیال کرسکتے ہیں تو آپ اپنی بیوی کا بھی اسی طرح خیال رکھتے ہوں گے۔"

ماورا اسے دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کرید بھی گئی تھی۔

آفاق جاتے جاتے ٹھہر گیا تھا۔

"ابھی تو مجھے اس کا خیال رکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ ہر وقت اسی کے خیال میں رہتا ہوں۔" آفاق کے لہجے میں محبت تھی۔

"اچھا... تو وقت کب ملے گا؟" وہ آفاق کا چہرہ کھوج رہی تھی۔

"وقت ملا تو بتاؤں گا آپ کو۔ فی الحال اجازت چاہتا ہوں۔" آفاق آہستگی سے مسکرایا اور ماورا خدا حافظ کہہ کر اسے رخصت کرکے اندر آگئی۔

تھوڑی دیر بعد ان لوگوں نے مل کر کھانا کھایا تھا اور کھانے کے آخری مرحلے پہ ماورا نے عافیہ بیگم کے کلیجے پہ ہاتھ ڈال دیا۔

"میں قبرستان جا رہی ہوں... بابا کی قبر پہ۔" وہ پانی کا گلاس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے بولی بڑے اطمینان سے، لیکن عافیہ بیگم کے حلق میں پانی اٹک گیا۔ لی گل نے بھی بری طرح چونک کر اس سمت دیکھا تھا۔ وہ کرسی دھکیل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوچکی تھی۔

"ماورا...!" لی گل کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"لی گل... میں اس شہر میں پہلی بار آئی ہوں اور اپنے بابا سے بھی پہلی بار ہی ملوں گی۔ مجھے ان سے ملے بغیر رات کو نیند نہیں آئے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں قارہ کے ساتھ ہی چلی جاؤں۔ بعد میں کس کے ساتھ جاؤں گی...؟" اس کی لاپروائی اور اطمینان ہنوز تھا۔

"لیکن تمہیں قبر کا کیسے پتا؟"

"میرے پاس آپ کی ڈائری ہے۔ ڈھونڈ لیں گے، ساری معلومات مل جائیں گی۔" وہ سکون سے کہتی پلٹ گئی۔

"لیکن ماورا...!" عافیہ بیگم کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ ٹھہر گئی۔

"امی... مجھے جانے دیں پلیز! میرا نہیں تو ان کا ہی کچھ خیال کرلیں۔ اتنے سال بیت گئے ہیں کوئی ان کی قبر پہ نہیں گیا ہوگا اور اب آپ... آپ مجھے بھی روک رہی ہیں۔ پلیز! ایسا مت کریں۔ مجھے جانے دیں۔ کل میں آپ کو اور لی گل کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

ماورا کا لہجہ روہانسا سا ہوگیا تھا اور قارہ کے ساتھ ساتھ لی گل اور عافیہ بیگم نے بھی اسے اس روپ اور اس کیفیت میں پہلی بار دیکھا تھا ورنہ انہوں نے آج تک اس کی آنکھ نم نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کی آواز کبھی بھیگی ہوئی محسوس کی تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ عافیہ بیگم نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ماورا ان کی تسلی کے لیے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر قارہ کے ساتھ فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

کراچی کی سڑکوں پہ بھاگتی دوڑتی گاڑی اور پیچھے کی طرف رواں مناظر ماورا مرتضیٰ کے لیے بے شک نئے تھے، لیکن اجنبی پھر بھی نہیں تھے۔

یہ سڑکیں' یہ گاڑیاں' یہاں کے لوگ اور یہاں کی طرز زندگی سب کچھ اسے بہت جانا پہچانا اور اپنا اپنا سا لگ رہا تھا اور ایک عجیب سا سکون تھا جو اس کی رگ و پے میں اترتا محسوس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ادھوری زندگی آج مکمل ہو گئی ہو۔

آج وہ پرائے شہر سے اپنے شہر میں آبسی تھی' آج اس کا اعتماد اور زیادہ بڑھ گیا تھا اور اس کے ارادے اور بھی پختہ ہو گئے تھے۔ کیوں کہ آج وہ اپنی منزل کے راستے پہ پہلا قدم رکھ چکی تھی۔

"کیسا فیل کر رہی ہو۔؟" ماورا کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی' جب فارہ کے سوال پہ اسے فارہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔

"آج میری کچھ ایسی فیلنگز ہیں۔ جنہیں میں شاید کبھی بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔" ماورا کی کیفیت آج واقعی بہت عجیب سی ہو رہی تھی اور آج واقعی اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہوں۔ آئی کین انڈر اسٹینڈ۔!" فارہ نے آہستگی سے سرہلایا۔

"تیمور بھائی کا کوئی فون وغیرہ آیا تمہارے پاس۔؟" فارہ نے موضوع بدلا۔

"نہیں۔!" اس کا ایک لفظی جواب اس کے موڈ کی عکاسی کر رہا تھا۔

"تو کیا تم نے بھی نہیں بتایا کہ تم کراچی پہنچ گئی ہو؟" فارہ جان بوجھ کر اس موضوع پہ بات کرنا چاہتی تھی۔

"تم جو کچھ پوچھنا چاہتی ہو' سیدھے طریقے سے پوچھ لو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس طرح پہیلیاں بجھوانے کی اور بات کو گھمانے پھرانے کی کیا ضرورت ہے۔؟" ماورا بہت تیکھے لہجے میں بولی تھی کیوں کہ وہ فارہ کی بات کا مقصد سمجھ چکی تھی۔

"نہیں' ایسی بات نہیں۔ بس بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہوں جو کہ مجھے مل ہی نہیں رہے۔" فارہ بھی لائن پہ آ ہی گئی تھی۔

"میں سوچتی ہوں لوگ پتا نہیں کیوں مرطلب وقت اور مناسب الفاظ کی تلاش میں رہتے ہیں؟ جو وقت ان کے پاس موجود ہوتا ہے اور جو الفاظ انہیں میسر ہوتے ہیں وہ انہیں مناسب کیوں نہیں بناتے۔" ماورا تلخ ہوئی تھی۔

"تم اس چیز کو نہیں سمجھ سکتیں کیوں کہ تم اپنا ایک الگ مزاج اور الگ نظریہ رکھتی ہو جبکہ ہم اس دنیا میں رہ کر اس دنیا کے ساتھ چلنے والے لوگ ہیں' ہمیں مناسب اور غیر مناسب کا فرق دیکھنا ہی پڑتا ہے۔" فارہ نے اپنی سوچ بیان کی۔

"پھر بھی مجھ سے زیادہ آپ لوگ پریشان رہتے ہو۔ مناسب اور غیر مناسب کا فرق دیکھنے کے باوجود بھی۔" اس نے طنز کیا۔

"بس یہی تو زندگی ہے۔" فارہ نے کندھے اچکائے۔

"لیکن میری نظر میں یہ زندگی کوئی زندگی نہیں ہے۔ انسان کو اپنی ذات اور اپنی سوچ کے ساتھ چلنا چاہیے۔ دنیا تو دو دھاری تلوار ہے۔ نجانے کب کس طرف سے وار کر جائے' دنیا کو رنگ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنی ذات کا رنگ اپناؤ' جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا تمہاری پہچان بن کر۔"

ماورا کا فلسفہ اور دلیلیں ہمیشہ ہی ایسی ہوتی تھیں کہ فارہ کو چپ ہونا ہی پڑتا تھا یا پھر یہ کہنا بھی ٹھیک رہے گا کہ فارہ کو قائل ہونا ہی پڑتا تھا۔

"خیر چھوڑو۔ تم اپنی بات مکمل کرو۔" ماورا نے بات کرنے کے لیے اس کا حوصلہ بڑھایا اور فارہ اپنے آپ کو کمپوز کرنے لگی۔

"میں تیمور بھائی کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی۔" اس نے الفاظ مناسب کر ہی لیے تھے۔

"ہوں۔ آگے بات۔ سن رہی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے متوجہ ہوئی۔

"تمہیں پتا تو ہو گا کہ تیمور بھائی تمہارے لیے کیا فیلنگز رکھتے ہیں اور یہ سب وہ کیوں کر رہے ہیں؟"

قارہ پہلے ہی سب کچھ واضح کر دینا چاہتی تھی کیوں کہ اسے ماورا کے مزاج کا بخوبی علم تھا۔ اسی لیے اس کے ذہن میں کھٹکا سا تھا کہ ماورا تیمور حیدر کے لیے وہ جذبات ہرگز نہیں رکھتی، جو وہ اس کے لیے رکھ رہا ہے۔

"ہاں۔! پتا ہے کہ وہ کیا فیلنگز رکھتا ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔" اس نے ڈنکے کی چوٹ پہ اعتراف کیا تھا۔

"پھر۔؟" قارہ تذبذب کا شکار ہونے لگی۔

"پھر کیا۔ جو کہنا ہے کھل کے کہو۔" ماورا بہت پرسکون تھی۔

"پھر یہ کہ تمہاری کیا فیلنگز ہیں ان کی فیلنگز کے متعلق؟" اس نے پوچھ ہی ڈالا تھا۔

"سچ سننا چاہتی ہو؟" ماورا کا لہجہ دو ٹوک اور بے دھڑک تھا۔

"ظاہر ہے۔ جھوٹ سننے کا خواہش مند تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔" قارہ نے کندھے اچکائے۔

"ہوتے ہیں تیمور حیدر جیسے کچھ لوگ۔ وقتی خوشی کے لیے جھوٹ سننے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔" ماورا نے تلخی سے سر جھکا۔

"کیا مطلب۔؟" وہ ہر سوال اور ہر جواب کے بعد الجھتی ہی جا رہی تھی۔

"قارہ۔! تیمور حیدر مجھ میں انٹرسٹڈ ہے لیکن میرا سچ یہ ہے کہ میں تیمور حیدر میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی ہو سکتی ہوں۔" ماورا نے اپنے ازلی دو ٹوک انداز میں جواب دے کر قارہ کو تڑپا دیا تھا۔

"کیوں۔ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" قارہ کی تڑپ اس کے لہجے سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیوں کہ مجھے معلوم ہے۔ میرے اندر کبھی بھی تیمور حیدر کے لیے کوئی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔" اس کا لہجہ اور انداز ہنوز تھے دو ٹوک مضبوط اور بے لچک۔

"دیکھو ماورا۔! تم بہت ہوشیار سہی، لیکن تھوڑی بہت عقل تو اللہ نے ہمیں بھی دے ہی رکھی ہے اور ہماری عقل اور ہمارا مشاہدہ تو یہی کہتا ہے کہ ہمیں کبھی کسی چیز کا اور کسی بات کا دعوا عمر بھر کے لیے نہیں کرنا چاہیے تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے اندر کبھی بھی تیمور بھائی کے لیے کوئی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے؟ زندگی میں انسان پتا نہیں کیا کیا دعوے کرتا ہے' لیکن جب اللہ انہیں پورا نہیں کرنا چاہتا تو سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ تم کہاں تھیں۔ فیصل آباد میں اور تیمور بھائی کہاں تھے۔ کراچی میں۔ کیسے تم لوگوں کی ملاقات ہوئی۔ کیسے رابطہ بڑھا اور تم آج اسی تیمور حیدر کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچی ہو۔ اگر سوچو تو یہ سب بھی تو اللہ کی ہی کرم نوازیاں ہیں نا؟ ورنہ تم وہی لڑکی ہو جس نے آج تک کسی لڑکے سے بات تک نہیں کی۔ کسی سے مراسم نہیں رکھے۔ کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا' لیکن تیمور حیدر کو نمبر بھی دے دیا' بات بھی کرلی اور مراسم بھی بڑھا لیے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے' جذبات پیدا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اس کی مثال بھی ہمارے سامنے ہی ہے۔ تیمور بھائی کو آج تک لڑکیوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں رہا' لیکن جب انٹرسٹ ہوا ہے تو اپنی زندگی کے ہر مقام' ہر معیار اور ہر اصول کو ہی بھول گئے ہیں' لگتا ہی نہیں کہ وہ وہی تیمور حیدر ہیں' جو اپنے کام سے کام رکھتے تھے' جن کے لیے ان کا بزنس ہی سب کچھ تھا اور آج۔"

قارہ کہتے کہتے چپ ہو گئی تھی۔ اور چپ تو ماورا بھی تھی' لیکن اس کی چپ کے پیچھے بہت سے جواب مچل رہے تھے جن کو وہ بڑی مشکل سے قابو کیے ہوئے تھی۔

"اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنے پہلو میں دھڑکتے پتھر کو ذرا نرم رکھو' تاکہ اس کے چاہنے والوں کو اس کے

ساتھ ۔۔ ٹکرا ٹکرا کر سر نہ پھوڑنا پڑے۔" آج فارہ اسے مشورہ دے رہی تھی۔

"فارہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تیمور حیدر کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی۔" ماورا کے اس قدر بے مہر جواب پہ فارہ ایک بار پھر تڑپی تھی اور اس نے چونک کر ماورا کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"میری تیمور حیدر سے ملاقات ہوئی' یہ ایک اتفاق تھا۔ میری اس سے بات ہوئی' وجہ تم تھیں' کیوں کہ وہ تمہارا کزن تھا۔ رابطہ کیوں بڑھا۔ اس کے پیچھے میری ایک سوچ تھی اس نے مراسم بڑھائے' اور میں نے اپنا مقصد بڑھالیا' اس نے میرے قریب رہنے کے لیے مجھے جاب آفر کی میں نے اس سے دور رہنے کے لیے سرسری سا انکار کردیا' اس نے مجھے فورس کیا' میں مان گئی' وہ مجھے یہاں دیکھنا چاہتا تھا' میں آگئی وہ مجھے نہیں جانتا' لیکن تم تو مجھے جانتی ہو نا۔۔۔؟

اور جب تم مجھے جانتی ہی ہو تو یہ بات تمہاری عقل میں کیوں نہیں آرہی کہ تمہاری دوست ماورا مرتضیٰ جو کبھی کسی کے ساتھ فری نہیں ہوئی' جس نے کبھی کسی کے ساتھ بات تک نہیں کی' جس نے کبھی کسی کو نمبر نہیں دیا' جس نے کبھی کسی کے ساتھ مراسم نہیں بڑھائے اور جو کبھی اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹی' وہ اگر ایسا کررہی ہے تو کیوں کررہی ہے؟ محبت میں کررہی ہے یا اپنے مفاد میں کررہی ہے؟"

ماورا کہتے کہتے حد سے زیادہ تلخ ہوگئی تھی' جبکہ فارہ اس کی بات کے آخری جملے پہ گنگ سی رہ گئی تھی۔

"ہونہہ! تمہیں تیمور حیدر کی محبت تو نظر آگئی' لیکن میرا مفاد نظر نہیں آیا۔" ماورا نے سر جھٹکا۔

"تم ٹھیک کہتی ہیں کہ جب ایک انسان کے ذہن میں محبت' احتیاج ہے یا مفاد سما جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کرگزرتا ہے۔ اور یہ بات جب میں نے تیمور حیدر اور ماورا مرتضیٰ کے ساتھ رکھ کے سوچی ہے تو مجھے سو فیصد سچ لگی ہے میں واقعی تیمور حیدر کے اصرار یا اس کی محبت سے مجبور ہو کر یہاں نہیں آئی میں اپنے مقصد' اپنے مطلب اور اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر یہاں آئی ہوں۔"

ماورا نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا جس کو سمجھنا فارہ کے لیے بہت مشکل ہورہا تھا' وہ الجھی ہوئی اور ناسمجھ سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی' اسے آج اپنے سامنے وہی ماورا نظر آرہی تھی' مقصدی' اٹل اور پتھریلی چٹان سی مضبوط۔

"مفاد۔؟ کیسا مفاد' ماورا۔ کہنا کیا چاہ رہی ہو؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔؟" فارہ کا سوال بھی الجھا ہوا سا تھا۔

"تیمور حیدر بہت اچھا لڑکا ہے' صاف سادہ اور سچا کھرا' کردار بھی مضبوط ہے اور پرسنالٹی بھی ایک آئیڈیل پرسنالٹی ہے۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے کوئی بھی لڑکی اس پہ بڑی آسانی سے فدا ہوسکتی ہے' کیوں کہ وہ ہے ہی ایسا۔ لیکن معذرت کے ساتھ کہ وہ لڑکی ماورا مرتضیٰ نہیں ہوسکتی۔" اس نے بہت آہستگی اور بہت تحمل سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"لیکن ماورا۔!" فارہ ہکابکا سی ہوچکی تھی اسی لیے اس کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور وہ کیا سن رہی ہے؟

"دیکھو فارہ۔! میں نے کہا نا تیمور حیدر بہت اچھا لڑکا ہے' میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اسے سیڑھی نہیں بنانا چاہتی تھی' میں اپنے بل بوتے پہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی' اپنے پیروں پہ خود کھڑا ہونا چاہتی تھی' مگر میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ باز نہیں آیا' وہ پیچھے نہیں ہٹا' وہ خود میرے لیے سیڑھی بن گیا' یہ سچ ہے کہ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا' آسانیاں کس کو اچھی نہیں لگتیں سو میرا اور اس کا ساتھ جڑ گیا ہے اس سفر میں۔۔ البتہ سفر ختم ہونے کے بعد اور منزل تک پہنچنے کے بعد اس سیڑھی' اس پاؤں اور اس منزل کا کیا انجام ہوگا' یہ تو اب وقت آنے پہ ہی پتا چلے گا۔ ہاں تم چاہو تو اس سیڑھی کو کھینچ بھی سکتی ہو۔" ماورا کی مبہم سی باتیں فارہ کو پاگل

لیے دے رہی تھیں۔

"میں۔۔۔؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تم۔۔۔! کیوں کہ تمہارا اور اس بیڑھی کا تعلق بھی تو بہت گہرا ہے۔۔۔"

"ماورا پلیز۔۔۔! خدا کے لیے۔۔۔ مجھے صاف صاف بتاؤ۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔ اصل وجہ کیا ہے اس قصے کی؟" فارہ بے چاری جھنجلائی۔

"بتادوں۔۔۔؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔!" اس نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔

"چلو تو۔۔۔ بتاتی ہوں تمہیں اور دیکھتی ہوں کہ تمہارا تعلق کس کے ساتھ زیادہ گہرا ہے؟ بیڑھی کے ساتھ؟ بڑوں کے ساتھ؟ یا منزل کے ساتھ۔۔۔؟ اور ہاں یہ بھی یاد رکھنا کہ یہ سب میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں تمہیں اپنی بہت اچھی اور بہت گہری دوست سمجھتی ہوں اور دوستی میں، میں اپنی دوست کو دھوکا نہیں دینا چاہتی اور نہ ہی آئندہ کبھی دوں گی۔"

ماورا انتہائی سخت لہجے میں کہتی ہوئی فارہ کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتر آئی تھی کیوں کہ ڈرائیور قبرستان کے باہر گاڑی پارک کرچکا تھا۔

اور ماورا قبرستان کے پہرے دار سے کچھ بات چیت کرنے کے بعد اور تھوڑی بہت انفارمیشن لینے کے بعد فارہ کو ساتھ لیے اندر آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے بہت دنوں سے اپنے لیے بوتیک پہ کچھ شرٹس اور کچھ کرتیوں کا آرڈر دے رکھا تھا۔ اور آج وہ آرڈر تیار ہوچکا تھا اس لیے وہ ڈزائنر کی کال پہ یونیورسٹی سے فری ہوتے ہی بوتیک چلی آئی تھی۔ وہ اپنے تمام ڈریسز ٹرائی کرکے دیکھ ہی رہی تھی کہ جب اچانک ایک لڑکی کے ساتھ مونس مرزا بوتیک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

اور جہاں وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی وہاں وہ بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتا، عزت ذرا سا منہ موڑ کر ڈزائنر کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

"یہ سارے پیک کردیں۔۔۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔۔۔" اس نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور اپنے بیگ سے بل نکال کر ادائیگی کرنے لگی۔

"ایکسکیوزمی مس عزت۔۔۔!" وہ بیگ لے کر بوتیک سے نکلی ہی تھی کہ مونس مرزا بھی اس کے پیچھے لپکا۔

"سوری۔۔۔! میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔۔۔ مجھے جلدی ہے۔" وہ رکی نہیں تھی۔

"یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں، میرے پاس بھی زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ مجھے بھی جلدی ہے۔" وہ کہتے ہوئے یک دم اس کے سامنے آگیا تھا اور عزت کو ایک دم رک جانا پڑا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"مطلب کہ میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیج رہا ہوں۔" مونس مرزا نے مارکیٹ میں کھڑے کھڑے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ اچھل کے رہ گئی تھی۔

"کیا۔۔۔؟" عزت کی آواز خاصی بلند تھی۔

"یس۔۔۔! ان فیکٹ میں کسی بھی معاملے کو یا کسی بھی سلسلے کو زیادہ طول دینے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں ہر کام بس منٹوں میں ہوجائے اور اس معاملے میں تو مجھ سے ویسے ہی صبر نہیں ہو رہا۔" وہ ہمیشہ کی طرح آخر

میں اور منفی بات کہہ گیا تھا۔
"دیکھیے مسٹر مونس مرزا۔! معاملے کو طول دینے کی عادت تو مجھے بھی نہیں ہے' اس لیے آپ کو پہلے سے ہی سمجھا رہی ہوں کہ اپنے پیرنٹس کو میرے گھر بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ورنہ ان کو جو جواب میں دوں گی' وہ آپ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔"
عزت نے اسے اپنے ازلی منہ پھٹ طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"کیوں۔ جواب کیوں دیں گی آپ؟ کوئی خاص ریزن؟" اس نے عزت کو سرتاپا بڑے غور سے دیکھا اور کھوجنا چاہا تھا۔
"یہی سمجھ لیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"ہوں۔ لیکن میں ریزن ختم کرنا بھی جانتا ہوں۔" مونس مرزا نے دھمکی دینے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور عزت کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔
"جسٹ اسٹاپ اٹ۔! میں اس طرح کی بکواس سننے کی عادی نہیں ہوں' بہتر ہے آپ اپنی لمٹ میں ہی رہیں اور آئندہ میرے بارے میں سوچیں بھی مت۔ کیوں کہ میں آپ سے زیادہ کسی اور کے بارے میں سوچتی ہوں۔ مجھے آپ۔۔؟" وہ غصے سے ۔ پاؤں پٹخ کر کہتی وہاں سے ہوا ہوگئی تھی اور مونس مرزا وہیں کھڑا اس کی پشت گھور تا رہ گیا تھا۔
"کون تھی یہ لڑکی؟" مونس مرزا کی گرل فرینڈ بوتیک سے نکل کر اس کے قریب آئی۔
"عزت حیدر۔!" مونس مرزا نے اپنی سوچ کی گرہ کھولی۔ بھولا ہیں آتے ہوئے بتایا۔
"اوہ۔! تو یہ ہے تمہاری عزت حیدر۔۔؟" اس کی گرل فرینڈ اس کا غائبانہ تعارف سن چکی تھی۔
"ہاں۔! یہ ہے میری عزت حیدر۔ میری ہونے والی ... نہیں ہو سکتی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور پلٹ کر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شاپنگ مال کی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا' لیکن دھیان ابھی بھی عزت کی طرف ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماورا۔!" فارہ کے ہونٹ کپکپائے تھے۔
"تمہارا جو بھی فیصلہ ہو' تم مجھے بتا دینا۔ میں تمہاری دوستی کو کسی آزمائش کے ترازو میں نہیں تولنا چاہتی۔ باقی جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا کیونکہ ۔ میرا اللہ میرے ساتھ ہے' میں ہمت نہیں ہاروں گی۔"
قبرستان سے واپسی پہ ماورا اپنا فیصلہ اسے سناتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر گئی تھی اور فارہ اس کے پیچھے کچھ کہنے کی ہمت کرتی رہ گئی۔
جبکہ ماورا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی مضبوط اور متوازن قدم اٹھاتی بلڈنگ کے اندرونی حصے کی طرف غائب ہوگئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کردی تھی اور پھر گھر آکر ہی بریک لگائے تھے۔
"بی بی جی۔ ہم گھر آگئے ہیں۔" ڈرائیور نے اسے ذہنی طور پہ غیر حاضر دیکھ کر خود ہی دروازہ کھولتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔
"ہوں۔" وہ بجھی ہوئی سی گاڑی سے اتر گئی تھی۔
"ارے فارہ۔ آگئی ہو بیٹا۔ ملاقات ہوگئی اپنی فرینڈ سے۔" ثمینہ یزدانی کہیں جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھیں۔ فارہ کو دیکھ کر وہیں گاڑی کے پاس ہی رک گئیں۔
"جی۔ ہوگئی ملاقات۔" وہ آہستگی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ثمینہ یزدانی اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر

تھیں لیکن تب بھی اسے گھر سے جاتے ہوئے تو وہ بے حد خوش تھیں۔

"اسے کیا ہوا ہے غفور؟" انہوں نے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"مجھے کچھ خاص پتا تو نہیں ہے بیگم صاحب۔ بس اتنا علم ہے کہ بی بی جی اپنی دوست کے ساتھ قبرستان گئی تھیں۔ ان کے والد صاحب کی قبر پہ۔" ڈرائیور بے چارے کو جتنا علم تھا اس نے بتا دیا تھا اور ثمینہ پریشانی سے سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

آفاق ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب اس کی نظر تیسری مرتبہ بھی فارہ کی سمت اٹھی تو اسے تیسری مرتبہ بھی ایک ہی پوزیشن میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے گم صم سے انداز میں بیٹھے ہوئے دیکھا اب کی بار وہ رہ نہیں سکا تھا اور اپنی آستین کے بٹن بند کرتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ کے اس کے قریب آگیا تھا اور اپنی پینٹ کو گھٹنوں سے پکڑ کے ذرا سا اوپر کھینچتے ہوئے اس کے پاس بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

"ہیلو۔" اس نے فارہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ ابھی بستر پہ ہی تھی مگر سوچوں کا گھوڑا نہ جانے کہاں سے کہاں دوڑ رہا تھا۔

"ہوں۔؟" وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"کیا بات ہے۔ تم جب سے ماورا سے مل کر آئی ہو بہت چپ چپ اور گم صم سی ہو؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟ اگر کوئی مسئلہ ہے کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے شیئر بھی کر سکتی ہو۔" آفاق اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کے نرم سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اور فارہ اس کے ایسے استفسار پہ بے ساختہ مسکرا کر مزید سمٹ سی ہو بیٹھی تھی۔

"نہیں۔ ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ ان فیکٹ کل ہم لوگ ماورا کے پاپا کی قبر پہ چلے گئے تھے۔ ماورا بہت اداس تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اس لیے میں بھی اس کے دکھ پہ بہت دکھی ہو گئی تھی۔

کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی بار ماورا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ورنہ وہ ایسی اسٹرانگ لڑکی ہے کہ چھوٹی موٹی بات کا تو نوٹس ہی نہیں لیتی۔"

فارہ نے رسانیت سے آفاق کی تسلی کروا دی تھی اور وہ واقعی کسی نہ کسی حد تک مطمئن ہو بھی گیا تھا۔

"کیا واقعی یہی بات ہے؟" اس نے ذرا سے استفسار کیا۔

"جی۔ یہی بات ہے۔" فارہ ہولے سے مسکرا کر کہتی۔

"اوکے۔ تو پھر جلدی سے اٹھو اور فریش ہو جاؤ۔ میں آفس جاتے ہوئے تمہیں ماورا کی طرف ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آج کا دن اس کے ساتھ رہو اور اس کو بھی فریش کرنے کی کوشش کرو۔ آج اس شہر میں اس کا پہلا دن ہے۔" آفاق اس کا ہاتھ تھپکتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ میں اس کی طرف نہیں جا سکتی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیوں۔؟" آفاق پھر ٹھٹکا۔

"کیونکہ ماورا گھر پہ نہیں ہو گی۔ اس نے آج آفس جوائن کرنا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ارے۔ اتنی جلدی۔ تھوڑا سا ٹائم تو دیتا۔" آفاق کو عجیب لگا تھا۔

"وہ تو ٹائم دینے کو تیار تھے لیکن ماورا ہی ٹائم نہیں لینا چاہتی تھی۔" فارہ بھی عجیب سے لہجے میں کہتی ہوئی بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر آفاق کے جانے کے فوراً بعد اس نے فون اٹھا کر ماورا کا نمبر ڈائل کیا اور اپنا فیصلہ اس کے حق میں سنا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کا تعلق پاپا کے ساتھ زیادہ گہرا ہے۔

قاریہ کی فون کال سننے کے بعد نجانے کیوں ماورا ایک دم سے جیسے پُرسکون سی ہو گئی تھی اور اپنا سیل فون بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے تیار ہونے کے لیے چلی گئی کیونکہ اس نے آفس جانا تھا۔

اور جیسے ہی وہ تیار ہو کر باہر نکلی بی گل اور عافیہ بیگم اندر ہی اندر دہل کے رہ گئی تھیں۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" بی گل نے بے ساختہ اس کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔

"آج میرا پہلا دن ہے بی گل۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔" وہ بی گل سے کہتی ہوئی عافیہ بیگم کی سمت پلٹی۔ وہ اس کے سامنے سے اٹھنے ہی والی تھیں کہ ماورا نے یک دم ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"میری کامیابی کی طرف آج میرا پہلا قدم اٹھ رہا ہے اور آپ مجھ سے رخ موڑ رہی ہیں۔ کیا ماں ایسا کرتی ہیں؟ آپ اس طرح کریں گی تو مجھے ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے پلیز۔ میرے لیے دعا کیجئے۔ میں ہمیشہ کہتی ہوں مجھے آپ کی دعا کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کی دعا میرے ساتھ ہو گی تو میں زندگی کے کسی بھی مقام پہ کسی سے بھی شکست نہیں کھاؤں گی۔"

ماورا کا لہجہ ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ عافیہ بیگم نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں کہ بی گل اور ماورا سے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ کل سے کراچی آئی ہوئی تھیں اور کل سے ہی ان کے اندر آنسوؤں کا اک غبار سا جمع تھا۔

"امی پلیز۔ سنبھالیں اپنے آپ کو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل بھی فکر مت کریں۔ آپ کو فخر ہو گا اک دن۔ دیکھ لیجئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔"

وہ انہیں اپنے ساتھ بھینچے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر تسلی دے رہی تھی اور وہ بھی بے تحاشا رونے دھونے کے بعد ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر سنبھل گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آیئے میڈم۔" وہ تھوڑا فاصلے سے اتر کر نیچے آئی ہی تھی کہ ایک باوردی ڈرائیور بڑی مستعدی سے اس کی طرف بڑھا اور گاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ۔۔؟" ماورا چونکی۔

"مجھے سر تیمور حیدر نے بھیجا ہے۔ حیدر گروپ آف انڈسٹریز کی طرف سے۔ جب تک آپ ڈرائیونگ نہیں سیکھ لیتیں۔ آپ کو پک اینڈ ڈراپ دینے کی ڈیوٹی میری ہے۔"

ڈرائیور نے آگے بڑھ کے اپنا تعارف کروایا تھا اور ماورا سر ہلاتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گاڑی کے قریب آ گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور پھر اپنے گھر سے آفس تک وہ تیمور حیدر کے متعلق ہی سوچتی ہوئی آئی تھی اور آفس آ کر اس کی سنجیدگی دس گنا بڑھ گئی تھی۔

آفس کی بلڈنگ دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی تھی اور اس پہ یہ قیامت کہ بلڈنگ کے ماتھے پہ "حیدر" لکھا ہوا تھا۔

"آیئے میڈم۔ آپ رک کیوں گئیں؟" شوفر نے قریب آ کر متوجہ کیا تھا اور ماورا بڑی ہمت اور بڑے حوصلے سے ایک گہری سانس خارج کرتی بلڈنگ سے نظریں ہٹا کر اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس حسن زادی سے ہو نا ہم
اس خاک زادے کو ہم سفر کر لے

"ویلکم ٹو کراچی۔" وہ اپنے کیبن میں کھڑی ایک سرسری سا جائزہ لے رہی تھی۔ جب اچانک اس کے عقب سے ایک بہت ہی پرسکون اور گمبھیر آواز ابھری تھی۔ وہ ایک سیکنڈ میں پہچان گئی تھی کہ یہ آواز تیمور حیدر کی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی سمت بڑے سکون سے پلٹی تھی۔

"تھینک یو۔" اس نے کہتے ہوئے تیمور حیدر کے ہاتھ میں تھاما ہوا بکے تھام لیا تھا۔ بہت ہی خوب صورت پھولوں سے سجا یہ بکے تیمور حیدر کے جذبات کی تازگی اور سرشاری کا اظہار کر رہا تھا۔ ماورا نے بھی یہ اظہار قبول کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔

"کیسی ہیں؟" تیمور کی نظریں بے اختیار اس کے چہرے کی سمت اٹھی تھیں اور ایک نظر دیکھ کر ہی دل پہ قرار کی پھوار برسی تھی۔

"اچھی ہوں۔" ماورا آہستگی سے کہتی پھولوں کا بکے ٹیبل پہ رکھ کر اس میں سے چند کلیاں نکالنے لگی۔

"سفر کیسا رہا؟" وہ اس کے خوب صورت مخروطی ہاتھوں میں پکڑی پھولوں کی کلیوں کو دیکھنے لگا۔

"کامیاب۔" اس کا جواب خاصا عجیب تھا۔

"کامیاب یا اچھا۔؟" تیمور کو اس کے جواب پر حیرت ہوئی تھی۔

"کامیاب۔ کیونکہ مجھے سفر کے اچھے یا برے ہونے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ میں بخیریت کراچی پہنچ گئی۔ میرے لیے یہی میری کامیابی تھی۔ اس لیے یہی کہنا ٹھیک ہے۔ کہ سفر کامیاب رہا۔"

ماورا نے ذرا تفصیل جواب دیا تو تیمور حیدر بھی سر ہلانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"ہوں۔ ویسے کراچی کیسا لگا؟" اس نے اگلا سوال پوچھا، اور ماورا ہاتھ میں پکڑی پھولوں کی کلیوں کو ٹیبل کی سائیڈ پہ رکھے لمبے سے نازک کرسٹل کے گلدان میں سجانے لگی تھی۔ وہ خالی گلدان تین چار کلیوں سے ہی سج گیا۔

"ابھی تو میں نے یہاں صرف قدم نکالے ہیں۔ ابھی میں نے کراچی دیکھا ہی کب ہے؟" اس نے پلٹ کر تیمور کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دکھا دوں کراچی چلیں گی میرے ساتھ؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"نو تھینکس۔ میں کراچی خود دیکھوں گی۔ اپنی نظر اور اپنے نظریے سے۔"

"اوہ۔ یعنی میرے ساتھ نہیں دیکھیں گی؟" وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"ہوں۔ یہی سمجھ لیں۔" وہ بنوز لاپروا تھی۔

"اوکے۔ اچھی بات ہے۔ مگر پھر بھی کسی راستے یا کسی موڑ پہ میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں۔" وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہر بار سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔

"اب آپ کا اگلا سوال یقیناً" یہی ہو گا کہ کراچی کو میں کیسی لگی؟" ماورا نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ اور تیمور اس کی اس کوشش پہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"نہیں۔ یہ سوال تو اب میں کراچی والوں سے ہی کروں گا۔ آپ سے نہیں۔" تیمور نے مسکرا کر کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے۔ مجھے بھی بتا دیجئے گا کہ کراچی والوں نے میرے بارے میں کیا جواب دیا آپ کو۔"

"شیور۔ ضرور بتاؤں گا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"بنی ویسے فی الحال آپ مجھے یہ بتا دیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا کام ہو گیا۔" ماورا اب اپنے مقصد کی طرف آگئی تھی۔

"آپ نے کیا کرنا ہے ہوں۔۔۔ آیئے میرے ساتھ۔۔۔ اور اپنی فائل بھی لے لیجیے۔" تیمور چند سیکنڈز سوچتے ہوئے بولا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر اس کے کیبن سے نکل گیا۔ ماورا اپنا بیگ اور اپنی فائل لے کر اس کے پیچھے اس کے کمرے میں ہی آگئی تھی۔

اس کی پی اے اور اس کے منیجر صاحب بھی وہیں تھے۔ تعارف کے بعد اس کی ان لوگوں کے ساتھ تقریباً" ایک گھنٹہ میٹنگ ہوئی تھی۔ تیمور نے ماورا کے تیار کردہ کئی ڈیزائن دیکھے اور سلیکٹ کیے تھے۔ اس کا کام ایسا تھا کہ تیمور کئی بار متاثر ہوا اور کئی بار اس نے اس کے کام کو سراہا تھا۔

تین سال کے ایگری منٹ کے بعد ماورا کی جاب اوکے ہوگئی تھی اور ماورا نے اگلے آدھے گھنٹے میں اپنا کام شروع کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ولید اپنے ایک پروگرام کی ریکارڈنگ میں مصروف تھا۔

ایک آخری نیوز چل رہی تھی 'جب اس کی نظر شیشے کے دروازے کے پار گئی جہاں ملازم کے پاس کھڑی عزت حیدر یقیناً" اسی کے متعلق کچھ پوچھ کچھ کررہی تھی۔ اسے اس طرح شہود چینل کے آفس میں یوں اس کے متعلق پوچھتے دیکھ کر ولید کا دماغ گھوم گیا۔

"ولید۔۔۔ ولید۔۔۔ کہاں دیکھ رہے ہو؟ ادھر دیکھو سامنے۔" کیمرا مین نے اسے متوجہ کیا مگر ولید سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جسٹ فائیو منٹس پلیز۔۔۔ میں ابھی آیا۔" اس نے بڑے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"لیکن یہ کام۔۔۔" کیمرا مین نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ولید دروازہ کھول کر باہر نکل چکا تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہال کمرے کے احاطے سے باہر آگیا جہاں عزت حیدر ابھی بھی ملازم کے ساتھ الجھ رہی تھی۔

"ایکسکیوز می۔۔۔ میں یہاں ہوں۔" ولید نے بڑی سنجیدگی اور بڑی عجلت کے ساتھ اسے متوجہ کیا تھا۔

عزت ولید رحمن کی آواز سن کر یکدم اس کی سمت پلٹی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" عزت نے بھی بڑے سنجیدہ موڈ میں اسے ہیلو کہا تھا۔ جس پہ ولید ایک لمحے کے لیے چونکا بھی۔ کیونکہ عزت حیدر آج تک اسے اس موڈ میں ذرا کم ہی نظر آئی تھی۔

"خیریت۔۔۔؟" اس کے موڈ کے پیش نظر ہی ولید اس سے خیریت پوچھنے پہ مجبور ہوگیا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ کرنے والا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے سیدھی سیدھی بات کی۔

"بات فون پہ بھی ہوسکتی تھی۔" ولید نے نارمل انداز اپنایا۔

"تمہارا فون آف جارہا تھا۔" عزت نے اس کا یہ اعتراض بھی دور کردیا۔

"میں بزی تھا۔" ولید نے بے ساختہ اپنے موبائل کی تسلی کرنے کے لیے اپنی پینٹ کی جیبوں کو ٹٹولا۔

"اور اب۔۔۔؟" عزت نے ابھی کا پوچھا۔

"اب بھی بزی ہوں۔۔۔ کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔۔۔" اس نے شیشے کے پار اندر کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن اس وقت میری بات آپ کے کام سے زیادہ اہم ہے۔۔۔ اسی لیے پلیز پہلے میری بات سن لیں۔" عزت اسے مخاطب کرنے کے حوالے سے کبھی بھی توازن نہیں رکھ پائی تھی۔ کبھی آپ کہہ لیتی تھی اور کبھی تم تک پہنچ جاتی تھی۔

"بس چند منٹ۔" اس نے وقت مانگا۔

"چند منٹ۔ مطلب چند منٹ" عزت نے زور دے کر کہا۔

"اوکے۔ آپ انتظار کریں۔ میں ابھی آیا۔" ولید عجلت میں کہہ کر واپس بھاگا۔ جہاں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"ولید۔ یہ کیا سلسلہ ہے یار۔؟" وہاں کام پہ موجود سب ہی لوگوں نے اعتراض کیا تھا۔ لیکن ولید سنی ان سنی کر کے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

میں نعرہ مستانہ
میں شوخیٔ رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں
پی کر بھی کہاں جانا۔
میں شمع فروزاں ہوں
میں آتش لرزاں ہوں
میں سوزش ہجراں ہوں
میں منزل پروانہ
میں نعرہ مستانہ۔

وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ہمیشہ کی طرح عابدہ پروین کا نعرہ مستانہ اونچی آواز میں سن رہی تھی۔ جب ولید اپنا کام ختم کر کے تقریباً" پون گھنٹے میں واپس آیا تھا اور اسے باہر پارکنگ میں ہنوز اپنے انتظار میں موجود دیکھ کر ولید کے قدموں میں اور زیادہ تیزی آگئی تھی۔ اس نے قریب آکر گاڑی کی کھڑکی پہ دستک دی تھی۔

"ہیلو۔" اتنی تیز آواز کے باوجود اس نے دستک سن لی اور گاڑی کا دروازہ بھی کھول دیا۔ مگر ولید نے اس کی پیشکش قبول نہ کی۔

وہ اس سے بات کرنے کی غرض سے ڈرائیونگ سائیڈ پر۔ ہی کھڑا رہا تھا۔ جس پہ مجبوراً" عزت کو گاڑی کا شیشہ نیچے کرنا پڑا تھا۔

"میری بات اتنی غیر اہم نہیں ہے کہ یوں سڑک پہ کھڑے کھڑے سنا دوں۔" عزت کا لہجہ غصے اور خفگی سے بھر گیا تھا۔

ولید کو مجبوراً" کھلے دروازے کی طرف قدم بڑھانے پڑ گئے اور پھر جیسے ہی وہ گاڑی میں بیٹھا' عزت نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

ولید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا تھا۔

عابدہ پروین کا نعرہ مستانہ اب بھی گونج رہا تھا۔ جس کو ولید نے ہاتھ بڑھا کر اپنی طرح خاموش کرا دیا تھا۔

اور یہ خاموشی تب تک قائم رہی' جب تک وہ لوگ شہر کے ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں نہ پہنچ گئے تھے۔

وہ گاڑی مقفل کر کے ریسٹورنٹ کی طرف بڑھی ولید کسی سدھائے ہوئے بیل کی طرح چلتا اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا تھا۔

ایک الگ کیبن کی ٹیبل اور کرسیوں پہ بیٹھتے ہوئے۔

ولید نے اپنی نظریں عزت حیدر کے چہرے پہ جمادیں۔ جو عین اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھی تھی۔

"مجھے پتا ہے تم منتظر ہو۔" اس نے بہت دیر بعد لب کشائی کی۔

"میں پریشان بھی ہوں۔" ولید نے انتظار کے علاوہ بھی اپنی کیفیت بیان کی۔

"تو پھر اندازہ کرو... جس بات کو سننے سے پہلے ہی تم اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ اس بات کو سن کر میری پریشانی کا عالم بھلا کیا ہوگا۔" اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہا۔

"لیکن کچھ پتا بھی تو چلے۔" ولید واقعی اچھا خاصا پریشان اور متجسس ہو گیا تھا۔

"مونس مرزا کو جانتے ہو؟" اس نے بات شروع کی۔

"دیکھا ہے۔ جانتا نہیں ہوں۔" ولید نے مونس مرزا کو تفاق کی شادی میں دیکھا تھا۔ تیمور نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

"میرے بابا کے ایک بیسٹ فرینڈ کا بیٹا ہے۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"پھر۔؟" وہ کھٹک گیا۔

"بابا ان لوگوں کے ساتھ بہت کلوز ہیں' بہت پسند کرتے ہیں ان کو۔"

"ہوں۔ مگر اس بات سے میرا کیا تعلق ہے؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔

"تمہارا تعلق یہ ہے کہ تم تیمور حیدر کے بیسٹ فرینڈ ہو۔ اور میں اپنے بابا کے دوست کی فیملی کے بجائے اپنے بھائی کے دوست کی فیملی میں انٹرسٹڈ ہوں۔ مجھے مونس مرزا کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ میری تمام دلچسپیوں کا مرکز ولید رحمن ہے۔ وہ ولید رحمن جو میرے سامنے سے بھی بھاگتا پھرتا ہے۔ جس کے لیے میرے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھنا بھی محال۔ جو دنیا سے بھی ڈر رہا ہے اور مجھ سے بھی۔ جو نہ اپنا بن رہا ہے اور نہ میرا۔" عزت کہتے کہتے روہانسی سی ہو گئی تھی اور ولید یک دم غصے سے پھٹ پڑا تھا۔

"تو کیا چاہتی ہو تم۔ سارے ڈر۔ سارے خوف پھینک دوں۔ جینا دشوار کرلوں اپنا بھی اور تمہارا بھی۔ میری نظر میں تم ابھی معصوم بچی ہو۔ تمہیں ابھی اپنے سینے کے اندر دھڑکتا خون کا سرخ لوتھڑا نظر آرہا ہے۔ اس دنیا کی سیاہی کا تو تمہیں علم ہی نہیں۔ جب یہی خون کے سرخ لوتھڑے دھڑکنا شروع کرتے ہیں۔ وہیں اس دنیا کے ستم ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اور میں ڈر رہا ہوں تمہاری معصومیت سے۔ تمہارے جذبات سے۔ تمہاری محبت سے اور محبت کی شدت سے۔ کیونکہ جہاں پہ معصومیت' جذبات' محبت اور شدت زیادہ ہوتی ہے وہیں آزمائش زیادہ ہوتی ہے اور وہیں شکار بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ تمہارے اور میرے جیسے کئی لیلیٰ مجنوں یہ دنیا بہت پہلے ہی نگل چکی ہے۔ ہم کوئی نئے نہیں ہیں اور میں اسی واسطے چپ ہوں کہ شاید تم بھی چپ ہو جاؤ۔ اور دنیا کا یہ وار خالی چلا جائے۔ مگر تم ہو کہ۔"

ولید نے کہتے ہوئے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"میں کیسے چپ ہو جاؤں۔ کیسے؟ مونس مرزا میرے گھر پرپوزل بھیج رہا ہے۔" عزت بے بسی سے چیخ اٹھی اور ولید پرپوزل کا سن کر یک دم چونک گیا تھا۔

اور پھر اگلے چند سیکنڈ وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

"میں تمہاری طرح چپ نہیں سادھ سکتی۔ یہ دنیا مجھے نگلتی ہے تو نگل جائے۔ میری محبت اور میری شدت بس وہی رہے گی۔ ولید رحمن۔ اور صرف ولید رحمن۔"

عزت نے با آواز بلند اپنا فیصلہ سنایا تھا اور ولید اس کے فیصلے پہ چکرا گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

"امریمیم کا اگر کوئی لاؤ کا نام ہوتا تو وہ "سرما کی دھوپ" ہوتا۔" چمکیلی' روشن' مسحور کر کے' باندھ کے' سر اٹھوا کر' بازو پھیلوا کر آسمان کی اور اڑا لے جانے والی یہ سرما کی دھوپ۔۔۔

باہر کو اندر سے پرسکون کر دینے والی۔۔۔ اندر کو باہر سے لاتعلق کر دینے والی۔۔۔

سونا سونا ہوتی۔۔۔ سونا سونا پھیلتی۔۔۔ مگن مست بماراں کر دینے والی سرما کی دھوپ۔

سر سرگم کے سارے گھاس۔۔۔ ابتدا کی طرف۔۔۔ انتہا کی جانب جیسے راج ہنسوں کے غول کے غول جھوم جھوم جاتے ہوں۔۔۔ اور اسی غول میں یکدم۔۔۔ اور ہزار رنگی سارے جہاں کی تتلیاں آن شامل ہوئی ہوں

"سرما کی دھوپ" اگر محبوب کا کوئی لاؤ کا نام ہوتا تو وہ بس یہی ہوتا۔۔۔ اور خوب ہوتا۔

اسی دھوپ میں وہ لان کے ایک کونے میں بیٹھی ہے۔۔۔ وہ کونوں میں ہی بیٹھتی ہے۔۔۔ کیونکہ اسے منظر عام پر آتے ڈر لگتا ہے۔۔۔

کیوں ڈر لگتا ہے۔۔۔؟

کیونکہ اسے ڈرایا جاتا رہا ہے اور پھر اس کی حیثیت اپنے ہی گھر میں کچھ ایسی ہے جو جھاڑو کی ہوتی ہے۔۔۔ ضروری بھی اور۔۔۔ تھی۔ گندی بھی۔ ایک طرف

مکمل ناول



—تھیں۔ دادی زیرلب بڑبڑاتے ہوئے اپنے بالوں کا خود ہی مساج کر رہی ہیں۔ انہوں نے دانیہ سے کہا تھا لیکن اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے تو کچھ سنا ہی نہیں — اور وہ کامل توجہ سے "ملن بائی کی بیٹی" پڑھتی رہی ساتھ مالٹے کی پھانکیں بھی منہ میں ڈالتی رہی۔

اماں فون پر بات کر رہی ہیں — اور حماد کانوں میں ایئر فون لگائے میوزک سے لطف اندوز ہو رہا ہے — کیونکہ اسے چلنے میں خاصی دشواری ہو رہی ہے اور اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے مڑ مڑ کر لہرا رہے ہیں جیسے خدانخواستہ اسے ٹہلتے ٹہلتے مرگی کا دورہ پڑ رہا ہو۔

اور وہ کونوں میں خود کو چھپانے والی موبائل انٹرنیٹ پر مصروف ہے — نہیں نہیں وہ کسی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر نہیں ہے — وہ کسی سے چیٹ بھی نہیں کر رہی — ارے نہیں وہ گوگل امیجز پر مشہور ڈیزائنرز کے کپڑوں کے ڈیزائن بھی نہیں نوٹ کر رہی — وہ تو — وہ تو مانچسٹر یونیورسٹی کے پاکستانی اسٹوڈنٹ سوسائٹی کے گروپ لیڈر کی ای میل پڑھ رہی ہے۔ اور اس کے ہاتھ پیر ایسے کانپ رہے ہیں جیسے ابھی ابھی اسے فریزر سے نکال کر دھوپ میں رکھا گیا ہو — یا جیسے اس کے کان میں کہا گیا ہو کہ جہاں تم بیٹھی ہو ٹھیک وہیں خزانہ دفن ہے — چپکے سے نکال لو اب وہ یہ خزانہ چپکے سے ہی نکالے گی — اس سے اپنی چیخ دبائے نہیں دب رہی — اور اس نے ہلکی سی چیخ مار ہی دی۔

سب سے پہلے تو دادی نے ہی اپنا ہاتھ روک کر اسے ناگواری سے دیکھا پھر سوائے دادا کے سب نے اس پر ایک ہلکی سی ناگوار سی نظر ڈالی مگر کسی نے اس سے پوچھا نہیں کہ کیا ہوا؟ کیوں چلائی ہو؟

دادا جو توبتہ النصوح پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اس کے پاس آئے۔

"امرحہ — کیا ہوا؟" پیارے دادا صرف وہی پوچھتے تھے وہ دادا کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی — تھوڑی دیر بعد دادا توبتہ النصوح کو سینے سے لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"اولے لینے ہیں منڈی سے — مجھ سے کہاں اٹھائے جائیں گے اتنے — امرحہ! تم آجاؤ ساتھ۔"

"اسے لے جا رہے ہو — لُٹ گئے پھر — منڈی بند ہو جائے گی یا آگ لگی ہو گی منڈی میں۔" دادی کی باریک آواز دنالی ہتھوڑے کی طرح برسی۔

"ہم دوسرے شہر کی منڈی میں چلے جائیں گے — اگر وہاں بھی آگ لگی ہوئی تو ہمارا انتظار نہ کرنا۔ ہم شہر شہر منڈی منڈی آگ لگا کر آئیں گے۔"

"شہر شہر کیوں — ملکوں ملکوں کیوں نہیں —؟"

"ہاں بھئی اب تیار رہنا سب — دنیا میں آگ بھڑکنے والی ہے۔"

"اب کیا — کب کی بھڑک چکی۔" دادی نے فوراً ٹوکا۔

"بابا جگر ہے — رہ ناگا سا کی۔"

"بس چپ — میرا دماغ نہ کھاؤ۔"

"بی بی ایا امرحہ نے ذرا گھور کر دادی کو دیکھا اور دادی نے اپنا رخ بدل لیا۔

"تو اب یہ مجھے بھسم کرے گی۔" انہوں نے خود پر آیات مبارکہ پڑھ کر پھونکیں۔

امرحہ وہیں کھڑی انہیں گھور رہی تھی اور وہ مزید رخ موڑ کر زیرلب دعائیں پڑھ پڑھ خود پر پھونکنے لگیں — بہت خوفزدہ رہتی تھیں اس کی نظروں سے — سب ہی رہتے تھے — تباہی اور بربادی تھی وہ —

عین اس کی پیدائش کے دن بڑے تایا چل بسے — پھوپھی پھوپھا کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا — چھوٹی پھپھو کے گھر شارٹ سرکٹ سے آگ لگی اور سارے ساز و سامان کو نگل گئی — چچا کی بیٹی کی منگنی اس دن ہونا تھی تایا کی وفات سے وہ ملتوی ہوئی۔ بعد ازاں رشتہ ہی ختم ہو گیا — اور تو اور ماموں کی الیکٹرونکس کی دکان میں پورے چار لاکھ کی چوری ہوئی ماموں صدمے سے چار دن ہسپتال رہے۔ امرحہ سے بڑے علی کی چھت سے گر کر بائیں ٹانگ کی ہڈی

ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ پورے دو سال لنگڑا کر چلتا رہا۔ ساتھ کے گھر کی ملائکہ آنٹی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے شوہر کا فرانس میں ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا ۔۔۔ اودھر دوسری لین والوں کی بہو کے مردہ بچے کی پیدائش ہوئی۔

یہ سب تو اوپر اوپر کے واقعات تھے ۔۔۔ فہرست کافی لمبی تھی اور دن بہ دن لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔ مثلاً" اگر کوئی کہتا۔

"بس اماں جی! اپنے دھیان میں تھی۔ پتا ہی نہ چلا کب منا ہاتھ جلا بیٹھا۔۔۔"

دادی پوچھتیں کیا دن تھا ۔۔۔؟

"یہی منگل ۔۔۔ آج ہی کے دن ۔۔۔ بلک بلک کر رویا میرا حاشر ۔۔۔ میں بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔"

"اچھا منگل ۔۔۔ اور تاریخ کیا تھی ۔۔۔"

"تاریخ کیا ہے ۔۔۔"

"اچھا ۔۔۔ دو اور لو پھر سے منگل ۔۔۔ مدد یا علی! منگل کی دو کو ہمیں یہ دیل (ویل) نصیب ہوا تھا ۔۔۔ اس دنیا پہ بھی امر جہ عذاب بن کر آئی تھی ۔۔۔ ہمارے خاندان میں تو ہر تاریخ دو پیران منگل ۔۔۔ کیا کریں گناہوں کے عذاب بھی تو بھگتنے ہی پڑتے ہیں نا۔"

اگلی بار منے کے ہاتھ جلنے کا واقعہ بھی یادوں کی منحوس جنم پتری میں شامل کر دیا جاتا۔

اماں بھی چڑی رہتیں اس سے ۔۔۔ اتفاق سے ہر سال لگ بھگ اسی دن ماموں کی دکان پر تین بار چوری ہو چکی تھی۔ تنگ آ کر ماموں نے دکان ہی بیچ دی اور دوسرا کاروبار کرنے لگے۔ اماں کو بھولتا ہی نہیں تھا کہ کیسے ان کے بھائی کی چمکتی دمکتی شاندار دکان بک گئی اور بھائی کنگلا سا ہو گیا۔

ایک دادا تھے جو پانچ وقت نماز پڑھتے اور صرف اللہ سے ڈرتے ۔۔۔ احادیث پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ۔۔۔ جاہلانہ باتوں اور خیالات کو اپنے اندر رتی برابر جگہ نہ دیتے ۔۔۔ ورنہ جمعرات کے جمعرات ان کے گھر چراغ جلتے ۔۔۔ تین یا پانچ ۔۔۔ بس طاق ۔۔۔

جفت نہیں ۔۔۔ دادی مرنے والوں کے نام سے چھت کے کونے والے کمرے میں چراغ روشن کرواتیں۔

"کا مذہب ہو سب کے سب ۔۔۔ کیا کبھی روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چراغ جلتے دیکھے ہیں ۔۔۔ کیوں خلاف مذہب ایسے کام کرتے ہو؟"

دادی ہاتھ سے اشارہ کرتیں کہ جاؤ اپنا کام کرو۔

بابا نے اعظم مارکیٹ میں دکان کی نئے سرے سے آرائش کروائی تو افتتاح کے وقت ناریل پھوڑا ۔۔۔ اعظم مارکیٹ کے دوسرے دکان دار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے رہے ۔۔۔ بابا صرف اتنا ہی کہتے رہے کہ وہ فلموں میں دیکھتے تھے تو انہیں بڑا اچھا لگتا تھا ۔۔۔

"کیا ہوا ہو بابا تو ۔۔۔ تم سب تو کسی کو خوش بھی نہیں دیکھ سکتے۔ جمعرات کے جمعرات بابا چادر دیکھیں دیتے ۔۔۔" دادا نے کہا۔



"کام والی ماسی کی بچی کے کان کا آپریشن ہونا ہے۔ پیپ رستی ہے اس کے کان سے۔ رات دن کی جان لیوا تکلیف الگ سے۔۔۔ اور نہیں تو دو تین جمعراتوں کے پیسے دے دو۔۔۔ چکھ میں ڈال دوں گا۔ اس کا آپریشن ہو جائے گا۔"

بہت بحث ہوئی۔۔۔ بابا نے دادا کو لادین قرار دے دیا اور دادا نے بابا کو بے حس۔۔۔ خیر دیگیں تو پکتی رہیں کام والی کی بچی کا جیسے تیسے دادا نے آپریشن کروا دیا۔

تو بس یہ ماحول تھا گھر کا اور یہ حال تھا گھر والوں کا۔۔۔ غلط باتوں کو پکڑ کر بیٹھے رہتے۔۔۔ بحث بھی کرتے اور اسی پر لڑ مرتے۔۔۔ دادا تو بہت بے زار آکتائے آکتائے رہتے۔۔۔ لیکن کسی پر بس ہی نہیں تھا۔

"نہیں ملے نا ولے۔" جب دونوں خالی ہاتھ گھر آئے تو دادی چمک کر بولیں۔ "تم تو کہہ کر گئے تھے دنیا میں آگ بھڑکا کر ہی واپس پلٹیں گے اب ایسے کیسے واپس آگئے۔۔۔ اور امرحہ! تم اتنا بن سنور کر ابا کے ساتھ منڈی گئی تھیں۔" دادا پوتی دونوں خاموشی سے کھسک گئے۔

ایسا نہیں تھا کہ ایک دادی ہی اسے منحوس مانتی تھیں۔ دادی اور اماں کی دیکھا دیکھی پھپھیاں تینوں، بہن بھائی بھی دادی کے کہے پر یقین رکھتے تھے اور کچھ سے زیادہ بابا بھی۔۔۔

علی کی پتنگ کٹ جاتی تو چلاتا۔

"کس منحوس نے کہا تھا اوپر آنے کو۔۔۔ کٹ گئی نا میری پتنگ۔" وہ علی کو وہ سنا کر چھپ کر رونے لگتی اور خود کو کوستی جاتی۔

"میں منحوس ماری۔۔۔ میں منحوس ماری۔"

وانیہ چپکے سے اماں سے کہا کرتی۔

"میرے کپڑے لایا کریں تو امرحہ کو نہ دکھایا کریں۔ نہیں کیوں پھٹ جاتے ہیں میرے پہننے سے پہلے وہ دیکھ لیتی ہے تو مجھے زہر لگنے لگتے ہیں۔"

امرحہ غصے میں کپڑوں پر سیاہی، چکنائی کا داغ لگا دیتی اور وہاں لگاتی جہاں سے صاف ہو کر بھی صاف نہ ہوتا۔۔۔ اور پھر رات کو کہیں چھپی بیٹھی روتی جاتی۔

"میں منحوس ماری۔۔۔ میں منحوس ماری۔۔۔"

اس منحوس ماری کو دادا نے ذرا سنبھالا۔۔۔ ان ہی کے کمرے میں ایک طرف اس کا بیڈ رکھا تھا۔۔۔ ان ہی کے ساتھ بازار جاتی، مسجد کے گھر جاتی۔۔۔ ان ہی سے پیسے لیتی۔۔۔ دادا ہی اس کے اماں بابا، بہن بھائی بن گئے۔ ایک رات اس نے بابا کو اماں سے کہتے سن لیا۔

"دکان پر چار لاکھ کا لکڑی کا کام کروانے جا رہا ہوں۔۔۔ کسی کو بتانا نہیں۔ نظر لگ جاتی ہے۔۔۔ خاص کر اپنی امرحہ کو۔"

وہ رات بھر روتی رہی۔۔۔ ہچکیاں لیتی گئی۔ بد دعا مانگتی گئی کہ وہ مر جائے یا لکڑی کے ساز و سامان کو آگ لگ جائے۔۔۔ لیکن نہ وہ مری نہ سامان کو آگ لگی۔ البتہ بابا کے چار لاکھ روپوں میں سے پورے ڈیڑھ لاکھ گم ہو گئے۔۔۔ چھوٹی پھپھو آئیں اور اپنی کوئی ضرورت بتا کر پیسے لے گئیں۔۔۔ بابا اماں سے چڑ گئے۔

"کہا تھا نا کسی کو مت بتانا۔۔۔ لو کروا لو دکان کا کام۔"

سارا عذاب امرحہ پہ نہ آجائے، دادا نے اپنے دوست سے لے کر دیے پیسے اور پھر کہیں جا کر ہوا ممکن دکان کا کام۔

تو یہ حیثیت ہے ہماری ہیروئن کی کہ پیدائش سے لے کر بڑے ہونے تک ایسا ہزاروں بار ہوا۔۔۔ وہ بول لیتی۔۔۔ بہن بھائیوں کو مار بھی لیتی لیکن رات رات بھر روتی بھی رہتی۔۔۔ اس کا جی چاہتا کہیں بھاگ جائے چھپ جائے۔۔۔ گم ہو جائے کہ کسی کو یاد نہ رہے کہ اس کی پیدائش کی خبر سنتے ہی دادی کے دماغ میں یہ سوچ آ گئی تھی۔۔۔ بعد ازاں اماں کے کمزور نے بھی اماں کو سکون کا سانس نہ لینے دیا۔

وانیہ، حملو، علی کبھی جل کر کبھی مذاقاً اور کبھی صرف اسے روتے دیکھنے کے لیے اسے اس کی نحوست کے قصے سناتے رہتے کہ وہ بھول نہ جائے کہ وہ کون ہے۔ اسکول میں ایک بار ٹیچر کی کرسی کا پایہ جو عرصے سے ٹوٹ جانے کے قریب تھا ٹوٹ گیا اور ٹیچر جی دھڑام سے نیچے آگریں تو وہ فوراً" کھڑے ہو کر

رونے لگی اور اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔
"تیچ... میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ کرسی خود بخود ٹوٹی ہے۔ میں سچ بول رہی ہوں۔"
تیچر کبھی سر پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دیتیں کہ سر میں درد ہے تو وہ سہم جاتی۔ "میں نے آپ کے سر کو نہیں دیکھا۔ سچ بالکل نہیں دیکھا۔"
خاندان کی تقریبات میں وہ انہی کارناموں کی وجہ سے جانی جاتی نہیں تھی کہ جو سارے خاندان میں ایسے مشہور تھے جیسے شالوں میں کشمیری شال اور میووں میں چلغوزہ۔

ایک بار وہ گئی تو بارات جسے دن دو بجے دوسرے شہر سے آنا تھا' آئی ہی نہیں۔ شام سے رات ہو گئی۔ ان کی گاڑیاں موٹروے پر خراب کھڑی تھیں۔ دولہا باراتیوں کے بغیر آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب تک لاہور سے نئی کاریں بھیجی اور وہ سب اس میں بیٹھ کر آئے' رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سب مہمان جا چکے تھے اور صرف قریبی عزیز ہی موجود تھے۔ وہ بھی دادا کے ساتھ چپکے سے گھر واپس آ گئی اور اپنے بچے ڈزائنر ڈریس کو آگ لگا دی۔ اس کے سب عزیز اس کے گرد گھیرا بنائے اس کا ریکارڈ لگانے میں مصروف تھے۔
"تیتا! ذرا پوچھے کھانا جل گیا یا بچ گیا۔ امرحہ آئی ہیں نا آج۔ بجلی کے کنکشن بھی چیک کروا لیجیے گا۔ شارٹ سرکٹ سے آگ نہ بھڑک اٹھے۔"
"میں تو دعا کرتی ہوں کہ دولہا بھائی خیریت سے آجائیں۔"
"مجھے تو دلہن کی فکر ستائے جا رہی ہے۔ سنا ہے دو لاکھ کا لہنگا جلتے جلتے بچا ہے۔"
"لہنگا تو بچ گیا لیکن اس کے بال جل گئے۔ ویسے آئرن مشین بال جلاتی تو نہیں۔ مگر خیر۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے آج تو۔"
"ہم سب تو مذاق کر رہے تھے امرحہ تو سنجیدہ ہی ہو گئی۔" وہ رونے جیسی ہو جاتی تو کوئی کہہ دیتا۔
تین گھنٹے بعد اس کا خالہ زاد جلا بھنا آیا۔

"چار پانچ گھنٹے سے پہلے بارات نہیں آئے گی۔ سب امرحہ سے سوری کہو۔ اس نے ہمارا سوری قبول کر لیا تو شاید بارات جلدی آجائے۔"
"شٹ اپ۔" وہ اتنی زور سے چلائی کہ دس بارہ کا گروپ سن سا ہو گیا۔
"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی حسان۔"
"منہ تو تمہارا توڑا جانا چاہیے جو اپنی ساری نحوست لے کر میری بہن کی شادی خراب کرنے آگئیں۔"
امرحہ کا جی چاہا' وہ سارے پنڈال میں آگ بھڑکا دے۔ کاش واقعی شارٹ سرکٹ ہو جائے اور سارے روشن قمقمے بجھ جائیں۔ تاکہ اس کے دھاڑیں مار مار کر رونے' تاریک چہرے اور کپکپاتے وجود کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ وہ کب سے سب کے مذاق میں چھپے طنزوں کو جھیل رہی تھی۔ لیکن حسان تو دندناتا وہ اس پر الزام لگانے ہی آگیا تھا۔
"وضو کرنے کے بعد مسجد جانے سے پہلے خود کو آئینے کے سامنے کھڑا کر کے ضرور دیکھنا۔ شاید دوبارہ کبھی مجھے یہ سب کہتے تمہاری زبان لڑکھڑا جائے۔ اور تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے کہ کچھ بھی برپا اور تباہ کرنے کی طاقت انسان کے ہاتھ میں ہے نہ اختیار میں۔ وہ حکم کن اور عمل فیکون "رب کی خوبی ہے اس کے بندوں کی نہیں۔" بمشکل خود کو رونے سے بچاتے اس نے کہا۔
دادا کو لے کر وہ چپکے سے گھر آ گئی۔ اس کی سگی خالہ زاد کی شادی تھی اس کے دل میں بھی ارمان تھے شادی کو لے کر۔ اس نے خاص اس شادی کے لیے بہت تیاریاں کی تھیں۔ لیکن سب نہ صرف بے کار گیا بلکہ اسے دکھ دے کر گیا۔ اس نے ایک سفید کاغذ پر "میں کبھی کسی تقریب میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ وعدہ" لکھ کر اپنی الماری کے اندرونی شیلف پر چپکا دیا۔ جب کبھی اس کا کہیں جانے کو دل چاہتا' وہ الماری کھول کر اپنے وعدے کو یاد کر لیتی۔
یہ سب وہ کرتی تو تھی لیکن بہت اکیلی بھی ہو گئی تھی۔

وہ آسانی سے رو پڑتی۔۔۔ اسے آسانی سے رلایا جا سکتا۔

جیسے کہ کوئٹہ والے ماموں سال میں کبھی ایک بار آجاتے تو لحاف میں دبک کر کلفی کا بڑا مگ پیتے ہوئے کہتے۔

"بلاؤ ذرا امرحہ کو۔۔۔ اسے رلائیں۔"

وہ نہ جاتی تو ماموں کھینچ کھانچ کر لے جاتے۔۔۔ ہنس ہنس کر سب لوٹ پوٹ ہوتے۔۔۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہوتی اور ماموں اس کی نحوست کا ایک ایک قصہ حوالہ جات کے ساتھ سنائے جاتے۔ اماں اسے ڈانٹتی۔

"مذاق کر رہے ہیں ماموں امرحہ۔۔۔ کیوں ایسے دھاڑیں مار رہی ہو۔" دادا آتے سب کو ڈانٹ کر لے جاتے۔

"جاہل لوگ ہیں امرحہ! ان پر توجہ نہ دیا کرو۔"

وہ کون سی عالم تھی جو خود کو اچھی طرح سے سمجھا لیتی۔۔۔ نو عمر۔۔۔ نازک دل کی۔۔۔ بس رو دینے والی لڑکی ہی تو تھی اور پھر ہر بار تو خود کو لاف زنوں سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"سب جاہل ہیں۔" پر سکون ہو جاؤ۔

"سب پاگل ہیں۔" بالکل ٹھیک۔

ایسا سوچا جا سکتا ہے۔۔۔ کہا جا سکتا تھا۔۔۔ لیکن ایسا ٹھیک ٹھیک ہو نہیں پاتا۔۔۔ رزلٹ اگر سو فیصد ہوتا بھی تو اگلی بار "صفر" ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ جتنا خود کو "یہ سب جاہل ہیں" کہہ کر بہلاتی اتنا ہی اگلی بار ان سب جاہلوں کی باتوں پر ہچکیوں سے روتی۔ دلوا کی باتیں اسے ٹھیک ٹھیک کر سلاتی تھیں تو اسی نیند میں وہ ان سب کی باتوں پر کراہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

دلوا گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری میں لائبریرین تھے۔ اسکول کی چھٹیوں میں وہ سارا دن پنجاب لائبریری میں گھومتی پھرتی رہتی۔ ویسے بھی اسے کم سے کم گھر میں رہنے دیتے تھے وہ اسکول سے پیدل چل کر لائبریری آجاتی دونوں دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے۔ اسی ملازمت سے دادا حضور نے ہزاروں کتابیں پڑھی تھیں اور اسی لیے وہ جمعرات کو مرنے والوں کے نام کے دیے نہیں جلاتے تھے۔ شام کو دونوں چہل قدمی کرتے۔ مال کی لمبی سڑکوں سے ہوتے سردی گرمی بھنے چنے اور راکھ کی چھلی کھاتے رات گئے گھر آتے۔ امرحہ کا تو دل چاہتا کہ رات کو بھی گھر نہ جائے اور بھلے سے مال کے فٹ پاتھ پر سو جائے۔

گھر پر نظر پڑتے ہی دلوا کہتے۔

"لو آگئی جیل۔"

"نکما ہو گئے ہو تم تو کتابیں پڑھ پڑھ کر۔۔۔ ڈھنگ کی نوکری مل جاتی تو عقل تو نہ جاتی۔"

لیکن دادا کو ڈھنگ کی نوکری تو نہ ملی لیکن ڈھنگ سے عقل ضرور مل گئی۔ بابا نے اپنے زمانے کی آٹھ کو بھی جیسے اپنی دوکان پر رکھ کر سیل کر دیا۔۔۔ پتا ہی نہ چلتا کہ آٹھ جماعتیں پڑھے ہیں یا آٹھ تک گنتی۔۔۔ علی بڑا تھا اور کمال کا بڑا تھا۔ ہر جماعت میں سینئر ہی رہتا دو سال ضرور ہی لگاتا۔۔۔ پھر حملہ تھا۔۔۔ اسے دنیا بھر کے گانے والوں' ناچنے والوں' انہیں نچانے والوں کے نام' گھر' شہر' قومیت' مذہب' شادی' بچوں' افیئرز کے بارے میں تو معلوم تھا لیکن یہ نہیں کہ ایف اے کے بعد کی ڈگری کو کیا کہتے ہیں اور اسے پاس کیسے کرتے ہیں۔۔۔ کتنا چاہا دادا نے کہ ایک انجینئر بن جائے' ایک کم سے کم دیال سنگھ کالج میں لیکچرار۔۔۔ ورنہ ایک کسی ہسپتال میں ڈاکٹر اور ایک پاک آرمی میں کپتان۔۔۔ لیکن دلوا کے سوچنے سے تو کچھ نہیں ہوتا نا۔۔۔ ویسے ان کے کہنے سے بھی کچھ نہیں ہوا۔۔۔

پھر امرحہ کا نمبر تھا' کم وہ بھی نہیں تھی اور کیوں تک۔ منحوس لڑکی' تھی تو ہر وقت روتی رہتی۔۔۔ بڑی مشکل سے دلوا نے اسے آٹھ جماعتیں پاس کروائیں اپنے رونے کے دوران ایک بار تو اس نے پڑھائی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور عمل بھی۔ سارا سارا دن دلوا کے ساتھ لائبریری رہتی۔

دادا نے منت کی "امرحہ میٹرک کر لو۔"

پرنسز امرحہ کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ بس ہر بات پر ایک ہی رٹ "بھاگ جاتے ہیں گھر سے نہیں۔"

دادا کے پاس تھوڑے سے جو پیسے تھے ان سے اسے اپنے دوست کے گھر بلوچستان لے گئے ہفتہ رہ کر آئے۔ خاندان میں تو کہیں وہ جاتی نہیں تھی۔ وہاں بہت خوش رہی۔ پھر دادا سے کہنے لگی۔

"دادا آپ دبئی چلے جائیں پھر مجھے بھی وہیں بلا لینا ۔۔۔ بڑے خوش رہیں گے ہم دونوں۔"

دادا اس عمر میں کیا دبئی جاتے "ہاں" پھر بھی اس سے وعدہ کر لیا۔

"میٹرک کر لو پھر چلا جاؤں گا۔۔۔"

اس نے دبئی کے لیے ۔۔۔ میٹرک کر لیا ۔۔۔ خوب جی جان لگا کر کیا مگر اتنی جی جان لگانے پر بھی سیکنڈ ڈویژن میں ۔۔۔ جو ہر کس و ناکس کے ہاتھ آ ہی جاتی ہے۔

٭ ٭ ٭

انہی دنوں نیا نیا واقعہ ہوا تھا کہ بابا کا ہاتھ جل گیا۔ دادی بولنے لگیں اس نے آگے سے جواب دیے تو بابا نے غصے سے جلا ہوا ہاتھ تو اس کے گال پر ٹھونک دیا ۔۔۔ اور مزید غصے سے اس نے ایسا سر دیوار میں زور سے دے مارا ۔۔۔ اس کے خون نکلا ۔۔۔ سر میں بہت درد ہوا اور اس درد اور خون کو بھلا کر وہ بابا کے تھپڑ کو لے کر روتی رہی ۔۔۔ رات کے پہلے پہر سے آخری پہر تک ۔۔۔ پھر اسے اسکول بیگ میں اپنے چند کپڑے رکھ کر گھر سے نکل گئی ۔۔۔ چلتی گئی ۔۔۔ چلتی گئی ۔۔۔ گھر کی سڑک کو پار کیا۔ بڑی سڑک تک آئی۔ اسے بھی پار کر گئی۔ چلتی گئی ۔۔۔ چلتی گئی ۔۔۔ حد تو یہ کہ پہلی بار سڑک پر یہاں وہاں پھرتے آوارہ گندے مندے کتوں سے بالکل نہیں ڈری ۔۔۔ وہ آنکھوں میں اشک لیے ۔۔۔ کندھے پر اسکول بیگ لٹکائے ایسے چلتی جا رہی تھی جیسے خدانخواستہ دنیا میں اکیلی ہو۔

کچھ دور آگے جا کر سمجھ میں نہ آیا کہ اب کہاں جائے ۔۔۔ تو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"تھکا ڈالا تم نے مجھے امرحہ!" دادا بھی فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ پہلے خود پانی پیا پھر اسے پلایا۔

"میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" پانی پی کر وہ چلائی۔

"ایک دن تو تمہیں وہ گھر چھوڑنا ہی ہے ۔۔۔ وہ تمہارا گھر ہے بھی نہیں میرے بچے۔"

"جانے کیوں نہیں ہیں آپ دبئی ۔۔۔ کر لیا ہے نا میں نے میٹرک ۔۔۔"

دادا گڑبڑا گئے۔ "میں بوڑھا کمزور بیمار شیمار دبئے والا بندہ اب کہاں جاؤں گا ملک سے باہر وہ بھی کمانے ۔۔۔ خود سوچ بچے۔ کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں میں ۔۔۔ اور بہرا بھی تو ہو گیا ہوں۔"

"وعدہ کیوں کیا تھا؟"

دادا بے بسی سے چپ ہی رہے ۔۔۔ تو عمری پھر امرحہ جیسا کچھ نہیں ۔۔۔ اب کوئی جھوٹی تسلی اسے نہیں دی جا سکتی تھی۔

"ہم کیوں نہیں چلی جاتیں امرحہ؟"

"کہاں۔" اس نے کندھے سے اسکول بیگ اتارا۔

"دبئی، امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا، فرانس۔"

"میں امریکا، فرانس۔" وہ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی کہ دادا کو کیسے کیسے لطیفے یاد آ رہے ہیں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

"ہاں نا ۔۔۔ مرزا کمال کی نواسی نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا ہے اس سال۔ اسے اسکالرشپ ملا ہے۔ دو دن ہوئے وہ کینیڈا چلی بھی گئی ۔۔۔ امرحہ! تو بھی ایف ایس سی میں ٹاپ کر لے۔"

"میں ۔۔۔؟"

"ہاں امرحہ بچے ۔۔۔ ٹاپ کر اور چلی جا ۔۔۔ مرزا کمال کی نواسی سات سال بعد آئے گی بلکہ سمجھ آئے گی ہی نہیں ۔۔۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد اسے کینیڈا میں ہی تین سال لازمی سروس کرنی ہو گی ۔۔۔ یوں ہو

گئے دس سال۔۔۔ دس سال وہ بھی کینیڈا میں۔۔۔ جہاں میں پچیس لاکھ لگا کر جایا جاتا ہے وہ مفت چلی گئی۔ دیکھو تو امرحہ۔ پڑھائی کے کتنے فائدے ہیں آپ خود کو منوالو تو دنیا آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔" رات کے آخری پہر سڑک کے کنارے بیٹھے دادا اسے فلسفہ کے معلم اول ارسطو سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ جو سکندر اعظم کو تاریخی فاتحوں کی فتوحات بڑے سلیقے سے سمجھا رہا تھا۔

اور پھر سکندر اعظم بھی تو فاتح رہا تھا۔

اور یوں اس نے بہت دل سے دادا کے ساتھ جا کر کالج میں داخلہ لیا۔۔۔ رات دن پڑھائی۔۔۔ بس پڑھائی۔۔۔ تلپ کرنا ہے اس نے خود پر لازم کر لیا۔ اسے اتنا یقین تھا خود پر کہ وہ خود ہی سب فرینڈز کلاس فیلوز کو بتاتی پھرتی۔

"مجھے تو کینیڈا جانا ہے۔۔۔ پورے دس سال رہوں گی وہاں۔"

"ڈاکٹر بن جاؤں گی۔۔۔ مزے سے اپنی زندگی گزاروں گی۔"

"ہاں ہاں میرے پلان میں ہمیشہ سے یہی شامل تھا مجھے اپنی زندگی کسی یورپین کنٹری میں ہی گزارنی تھی۔"

"بس کسی طرح۔۔۔ یہ دو سال گزر جائیں۔۔۔ امتحانات ہوں اور میں جاؤں۔۔۔"

ان دو سالوں میں وہ بہت خوش رہی۔ اس نے کینیڈا کی اتنی معلومات اکٹھی کر لیں کہ خود کینیڈین بھی وہ سب نہیں جانتے ہوں گے جو وہ جاننے لگ گئی تھی۔ دادا نے اسے وہ ساری کتابیں لا دیں جن میں لفظ کینیڈا شامل تھا۔

اور پھر رزلٹ آگیا۔۔۔ لیکن افسوس۔۔۔ وہ اسے پاس بھی نہ لے سکی۔۔۔ رو رو کر اس نے اپنا حشر کر لیا۔ دادا نظریں چرائے چرائے پھرتے۔ چھپکے چھپکے دو تین جگہ اپلائی کیا اسکالرشپ کے لیے لیکن جہاں ڈبل پس والوں کی بھرمار ہو وہاں خالی خولی "اے گریڈ" کو کون پوچھتا ہے۔ دادا کو ان دنوں معلوم ہوا کہ ملک میں کتنی بڑی تعداد اولائق فائق لوگوں کی ہے۔ جہاں جہاں وہ اس کا فارم جمع کروانے گئے تھے وہاں ہم غفیر دیکھ کر انہیں خوشی تو ہوئی لیکن اپنی امرحہ کے لیے افسوس بھی ہوا۔ وہ اسی وقت سمجھ گئے کہ اسے مشکل سے ہی کوئی اسکالرشپ ملے گا۔۔۔ اور وہی ہوا۔ اسے معذرت کے تین آفیشل لیٹر آگئے اداروں کی طرف سے ایڈمیشن فارم نہ آئے۔

گھر والوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ دادا پوتی کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ امرحہ کا تو فارا تر نے کا نام کیوں نہیں لے رہا۔۔۔ امرحہ اور دادا میں بات چیت کیوں بند ہے۔۔۔ امرحہ سے دادا جی دادا جی کیوں نہیں کہتی پھرتی۔۔۔ اور یہ کہ کلاس فیلوز اور فرینڈز کے فون آتے رہے۔

"کب جا رہی ہو کینیڈا۔۔۔ دیکھو بھول کر جانا۔"

"بہت بے تمہاری جو اتنی دور جا رہی ہو۔۔۔ میں تو سوچ کر ہی مرنے لگتی ہوں۔"

اس نے دو سالوں میں اتنے یقین سے اپنے جانے کے بارے میں کہا تھا کہ سب کو کامل یقین تھا کہ اب بس وہ گئی۔۔۔ وہ سب طنز نہیں کرتی تھیں پر امرحہ کو تو طنز ہی لگ رہے تھے نا۔۔۔

☼ ☼ ☼

بابا نے اس کی منگنی کر دی۔۔۔ اس نے بھی کروائی کہ کینیڈا تو گئے نہیں دوسرے گھر ہی چلو۔۔۔ لیکن دوسرے گھر بھی نہ جا سکی۔۔۔ چھ ماہ بعد ہی منگنی ٹوٹ گئی۔ ظاہر ہے انہیں بھی خبر ہو گئی کہ اس لڑکی کی پیدائش اور بعد از پیدائش سے کیسے کیسے واقعات جڑے ہیں۔۔۔ بابا کو غصہ تو بہت آیا لیکن کیا کر سکتے تھے۔۔۔ اماں اور دادی پر ناراض ہوئے کہ کیوں ایسی ایسی باتیں کر کے اسے اتنا مشہور کر دیا ہے کہ اس کا رشتہ ہی ختم ہو گیا۔ اماں اور دادی پچھتائیں پر اب تو دیر ہو چکی تھی۔۔۔

پھر دوسرا رشتہ ہوا۔ بابا نے فوراً" شادی کی تاریخ دے دی لڑکے والوں کو۔۔۔ نہ منگنی نہ نکاح فوراً" شادی اور عین شادی سے پندرہ دن پہلے جس دن وہ اپنا شرارہ

بہن کر دیکھ رہی تھی ' اسے لڑکے کی جوان بہن کے بیوہ ہونے کی خبر ملی۔۔۔ قصہ ہی ختم۔

اور اس بار اسے خاندان سے وہ وہ کچھ سننے کو ملا کہ اس نے دادی کی نیند کی گولیاں کھالیں۔

ہفتے بعد جب وہ ٹھیک ہو کر گھر آئی تو اس کا جی چاہا کہ پھر سے گولیاں کھالے اور فوراً" مرجائے۔۔۔ اماں بابا کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر روتے ہوں۔۔۔ دادی "ہائے میری جوان بچی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" کہہ کہہ ہچکیاں لیتی ہوں۔۔۔ اور دادا ہمیشہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ دیں اور بابا ' دادی دیوانوں کی طرح دادا کو ڈھونڈتے ہوں اور دادا رات کو چھپ کر اس کی قبر پر آتے ہوں۔ اسے اپنی موت کے تصور سے ایسے راحت ملی کہ سب روتے پھریں گے جنہوں نے اسے رلایا ہے۔ مگر وہ صرف یہ تصور ہی کرتی رہی ' دوبارہ ہمت نہ ہوئی موت کو گلے سے لگالے۔ دادا اس سے بات کرنے کی اسے منانے کی کوشش ہی کرتے رہتے۔

جوان لڑکی نے خود کو ختم کرلینے کی کوشش کی اور یہ سب ان جاہلانہ باتوں کی وجہ سے ہوا تھا جو وہ بچپن سے اپنے لیے سن رہی تھی۔ اگر وہ نیند کی گولیوں سے نہ مرتی تو ذہنی دباؤ سے مرجاتی۔

"میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں امرحہ! کہ میں تمہیں پڑھنے کے لیے باہر ملک بھیج سکوں۔۔۔ شادی بھی تمہاری نہیں ہو رہی۔۔۔ میں نے تمہارے بابا سے بات کی تو وہ الٹا مجھ پر ہنسنے لگا کہ وہ تم پر اتنے لاکھوں روپے لگا کر تمہیں پڑھنے کے لیے بھیجے اس سے اچھا ہے وہ تمہارے لیے سونے کے زیورات بنوا کر رکھ لے یا تمہارے نام کے پیسے بینک میں رکھوا دے تاکہ تمہاری شادی میں کام آسکیں۔

امرحہ! میں بے زار ہوں ایسے لوگوں سے جو مقدس راتوں کو لمبی لمبی عبادتیں کرتے ہیں اور سال کے بارہ مہینے گناہ کی مختلف حالتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔۔۔ جھوٹ ' حسد ' بے ایمانی ' غیبت سے خود کو بچانے کی رائی برابر جدوجہد نہیں کرتے اور وضو کرکے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تمہاری سابقہ ساس جنہوں نے شادی کو ختم کیا ' وہ مذہبی جلسوں میں احادیث کا حوالہ دے کر مذہبی تقاریر کرتی ہیں۔۔۔ میں اسی لیے بہت مطمئن تھا کہ تمہاری شادی وہاں ہو جائے۔۔۔ پر وہ بھی وہی خوش رنگ پھل نکلیں جو اندر سے گلا سڑا اور بدبودار ہوتا ہے۔۔۔ ہماری یہ منافقت معاشرے کے سکون کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔۔۔ ہم جو خود کو سیدھے راستے کی طرف سمجھتے ہیں ' نہ جانے کس طرف جارہے ہیں۔۔۔ الٹے پیروں جارہے ہیں۔

امرحہ! میرے دل کے ٹکڑے ' دوبارہ مرنے کی کوشش نہ کرنا ' ورنہ میں بھی خود کو مار ڈالوں گا۔۔۔ اپنی تعلیم کو محنت سے ذمہ داری سے حاصل کرو۔۔۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور بن جائے گا۔"

دادا نے اسے بلوچستان کا ایک اور پندرہ روزہ دورہ کروا دیا اور جیسے تیسے اسے منا کر کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ لیکن اب اس کی زندگی تھوڑی سے زیادہ تلخ ہو چکی تھی کہ اب اس کی دو منگنیاں ٹوٹ چکی تھیں۔۔۔ خاندان سے کوئی اسے لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ماموں نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے وامیہ کا ہاتھ مانگ لیا۔

اماں اور دادی نے خود سے امرحہ کا کہا بھی لیکن ماموں وامیہ کے لیے ہی اصرار کرتے رہے۔

"اتنے ڈرپوک ہیں سب کہ رسک لینے کے لیے تیار ہی نہیں۔" وہ تلخی سے دادا سے کہتی۔

"جو خدا سے دور ہوتے ہیں وہ ایسے ہی خوف زدہ ہوتے ہیں۔"

میں تو خدا سے دور نہیں پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں؟

"کبھی کبھی قدرت بے خبر سوئے پڑوں کے سر پر کنکر مارتی ہے تاکہ وہ بیدار ہو جائیں اور اپنے مقصد حیات کی طرف لپکیں۔"

☼ ☼ ☼

اسی دوران کچھ یہ بھی ہوا کہ جس سے اس کی منگنی ٹوٹی تھی اس کی شادی اس کی خالہ زاد عائزہ سے ہو گئی

—— مزید یہ کہ اس لڑکے کی فوراً" پروموشن ہو گئی اور کمپنی کی طرف سے اسے ایک بہترین گھر مل گیا۔ شادی کا تحفہ یورپ کا ایک ماہ کا ٹور —— مائرہ نے ایک دن اسے فون کیا۔

"میں نے تو افراسیاب سے کہا کہ مجھ سے شادی کر کے بچ گئے ورنہ اگر امرحہ —— خیر —— چھوڑو —— ویسے اچھے خاصے کنگلے ہو جاتے اور پتا نہیں کیا کیا ہو جاتا ان کے ساتھ۔"

وہ خاموشی سے مائرہ اور افراسیاب نامہ سنتی رہی —— عاجز آکر مائرہ نے پوچھا۔

"کچھ تم بھی بولو —— کچھ کہو۔"

اس نے فون بند کر دیا —— اتنا جواب ہی کافی تھا۔

کالج وہ جاتی رہی —— ولوا سے کم کم بات کرتی۔ ان سے ناراض تھی۔ دادی اور اماں اب اسے گھر میں کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ گھر میں آگ بھڑکتی دادی کے بیچ میں موج آجاتی۔ حماد کا موٹر سائیکل کا حادثہ ہوتا یا بابا کو دکان پر کوئی نیا نقصان اٹھانا پڑتا —— کوئی کچھ نہ کہتا کیونکہ اب یہ ٹھیک زور و شور سے دو مہینوں سے ... رکھا تھا —— امرحہ کو ایسا لگتا کہ تاریکی کا گہرا جنگل ہے جس میں وہ بھٹکتی پھر رہی ہے لیکن روشنی کی کرن ہے کہ آکر نہیں دے رہی —— اسے لگتا یہ دنیا سب کچھ بھول جائے گی لیکن اس سے متعلق کچھ نہیں بھولے گی —— وہ دعا کرتی کہ کاش کوئی ہوا چلے اور سب کے ذہنوں سے اس کا نام مٹا ڈالے —— نہ کسی کو اس کا نام یاد رہے نہ اس نام کی شخصیت سے جڑے واقعات —— گھر میں مہمان آتے تو وہ لائبریری چلی جاتی —— وہاں بھی شام تک ہی رہ سکتی تھی —— پھر دادا اسے لیے لیے گھومتے پھرتے وہ دادا سے بات نہ کرتی مگر ان کے ساتھ ساتھ گھومتی رہتی —— دادا جانتے تھے وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے خوفزدہ رہتی ہے خاص کر رشتے داروں اور جاننے والوں کا —— اور یہ خوف ان ہی لوگوں نے اس کے اندر پیدا کیا تھا۔

وہ خاندان کی تقریبات اور گھر میں کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی پھر بھی وہ ان سب میں بے حد مقبول تھی —— وہ ڈسکس کیے جانے کے لیے قہقہے لگانے کے لیے ایک بہترین موضوع تھی۔ سانپ سیڑھی کا وہ کھلاڑی جسے بار بار سانپ کھا لیتا ہے اور اس کی دم سے نکل کر وہ سب سے نچلے درجوں میں آجاتا ہے —— بار بار۔ امرحہ جیسی خوب صورت لڑکی کو بار بار نچلے درجوں میں دیکھنا خاندان کی حاسد لڑکیوں کا پسندیدہ مشغلہ بھی تھا اور وہ حاسد لڑکیاں ہی کیا —— کون ہے جو اپنے لیے پہلا نمبر اور دوسروں کے لیے آخری نمبر پسند نہیں کرتا۔

لیکن انسان تو وہی ہے نا جو اپنی خود نمائی بے شک کرتا ہے لیکن دوسرے کی خامی کی پردہ پوشی ہر حال میں کرے۔

اور ایسے انسان اب انسانوں کے ڈھیر میں کہاں ملتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے آپ سے تلخ اپنے ماحول سے غمگین امرحہ دن بدن بوجھل اور بے زار رہنے لگی۔ نہ معلوم یہ قدرت کا طریقہ کار تھا یا قدرت کی ترغیب کہ اپنے اس بدتر ہوتے ماحول سے نکلنے کے لیے اس نے کوشش تیز تر کر دی۔ ڈیڑھ سال کے دوران اس نے مختلف بیرونی کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالر شپ فارم بھرے —— ففٹی پرسنٹ، سکسٹی پرسنٹ، سیونٹی پرسنٹ اس نے کسی یونیورسٹی کے کسی بھی طرح کی اسکالر شپ کو جانے نہ دیا۔ ولوا نے اس دوران بابا کو منانے کی بہت کوشش کی کہ چند لاکھ کی بات ہے بیٹی پر لگا دیں۔ پڑھ لکھ کر لوٹا دے گی لیکن بابا کو یہ مشورہ ہی سراسر ایک مذاق لگتا۔

"بھلا پڑھنے لکھنے پر کوئی لاکھوں لگاتا ہے؟"

مانچسٹر یونیورسٹی کے طلبا کی سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے پانچ اسکالر شپ دے رہی تھی۔ اسے وہاں سے بھی انکار ہو گیا —— دو سالوں میں اس نے دو سو بار "سوری یو آر اے گڈ اسٹوڈنٹ، بٹ وی کانٹ ہیلپ —— بیسٹ آف لک۔" (ہم معذرت چاہتے ہیں آپ

اچھی طالبہ ہیں لیکن ہم آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کرسکتے) جیسی میلز پڑھی تھیں پھر اس نے گنتی چھوڑ دی تھی۔۔۔ لیکن ظاہر ہے انکار' ناکامی کی کوئی حد بلاشبہ نہیں ہوگی لیکن انکار سننے اور ناکامی سہنے والوں کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔

مانچسٹر یونیورسٹی کے اس انکار نے اسے ایک بار پھر گھٹنوں میں سر دے کر رلا دیا۔۔۔ اور اس نے بہت خفا ہو کر بہت جل کر ایک آخری میل انہیں ضرور کی۔۔۔

"میں ہوں ہی منحوس ماری۔۔۔ میں جل کر مرجاؤں تو ہی اچھا ہے۔۔۔ بھاڑ میں جاؤ تم سب اور تمہاری اسکالرشپ آفر۔"

اگلے ہی دن اسے ایک لمبی میل موصول ہوئی جس میں انتھک کوشش کرنے اور کبھی نہ ہار ماننے پر ایک بڑا سا لیکچر تھا۔ ساتھ ہی دنیا بھر کے ان کامیاب انسانوں کی مثالیں تھیں جنھوں نے بدترین حالات میں شاندار کامیابیوں کی بنیاد رکھی تھی۔ ان میں سرفہرست نام محمد علی کلے اور چارلی چپلن کا تھا۔۔۔ ساتھ ہی اسے بہت نرم انداز سے بتایا گیا تھا کہ میٹرک میں اس کا اے پلس ہے' ایف ایس سی میں صرف اے اور گریجویشن بی بہت مشکل ہے کہ وہ اسے پلس کے ساتھ کرے۔۔۔

ایسی صورت میں جبکہ اس کے پاس شاندار اکیڈمک رزلٹ نہیں ہے' کیسے اسے دوسرے شاندار تعلیمی قابلیت رکھنے والوں کے مقابلے میں اسکالرشپ دے دیں۔۔۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہوگی۔

"ہونہہ! آئے بڑے انصاف کے علم بردار۔۔۔"

آخر میں ایک چھوٹی سی سطر لکھی تھی۔ جو کچھ یوں تھی۔

"پھر بھی ہم سب سوچ رہے ہیں شاید آپ کے لیے کچھ کرسکیں۔ ہمیں وقت دیں۔"

اس نے وقت دے دیا۔ اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس دوران اس کا بی اے کا رزلٹ بھی آگیا۔ اے پلس تو جیسے بورڈ والوں نے اس پر حرام ہی کردیا تھا کہ جتنی بھی محنت کرلے امرحہ کو اے پلس نہیں دینا۔۔۔ وہ بہت خفا خفا سی رہی اپنے رزلٹ سے لیکن کیا کرسکتی تھی صرف اتنا کہ "اے پلس" کا سائن صفائی سے لگا کر اپنی ڈگری مانچسٹر میل کردی۔۔۔ اور اس کی ذرا سی چالاکی کام کرگئی۔ پورا ایک مہینہ سوچنے کے بعد انہوں نے اسے کہا۔

"ہم آپ کو سیونٹی پرسنٹ اسکالرشپ آفر کر رہے ہیں۔ وہ بھی تیس فیصد ہر حال میں دو سالہ ڈگری کے دوران واپس کرنا ہوگا۔۔۔ باقی کا پچاس فیصد آئندہ آنے والے پانچ سالوں کے دوران۔۔۔ اپنی رہائش' فوڈ آپ کو خود ہینڈل کرنا ہوگا۔ ہم صرف عارضی طور پر یہ سب مہیا کریں گے۔"

تو منحوس ماری اور جل مروں گی الفاظ کام کرگئے۔ انگریز نہایت ہی مستقل مزاج نکلے اور اسے اسکالرشپ آفر کر دیا۔

دادا کے ساتھ جا کر چپکے سے اس نے اپنا پاسپورٹ بنوا لیا۔۔۔ کچھ دادا کے اپنے اور کچھ دادا نے اپنے دوستوں سے قرض لیا اور باقی کا تیس فیصد جمع کرکے اس کے ہاتھ میں دیا۔

اب وہ دادا سے چہک چہک کر باتیں کرتی۔۔۔ لاڈ کرتی۔۔۔ کئی سالوں کی کٹی اب ختم ہوئی۔۔۔ دادا پوتی میں پھر سے خوب بننے لگی۔۔۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے' جیسے ہمیشہ کے لیے جارہی ہے۔۔۔ اور دادا کے یوں کہ وہ ڈگری لے کر آئے گی تو کافی بدل چکی ہو گی اور رونا دھونا مرنا مارنا بھول چکی ہوگی۔

وہ دادا کے ساتھ چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں کھانے کھاتی رہی۔۔۔ اور ہر ہر قدم پر آس پاس ایسے نظر دوڑاتی جیسے سب کو الوداع کہہ رہی ہو ہمیشہ کے لیے۔۔۔ دادا کچھ جذباتی سے ہوگئے۔

"امرحہ! پڑھنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔۔۔ صرف پڑھنا وہاں۔۔۔ یاد رکھنا صرف پڑھنے کی آزادی دے رہا ہوں باقی فیصلوں کی نہیں۔۔۔ باقی سارے اختیارات آج بھی میرے اور تمہارے بابا کے پاس ہیں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلا دیا۔۔۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ وہاں پڑھے گی جاب کرے گی اور وہیں رہے گی پتا نہیں دادا کیا کیا سوچ رہے تھے۔۔۔ اس کو

کبھی لڑکوں میں دلچسپی نہیں رہی اور وہ لکھ کر دینے کے لیے تیار تھی کہ ہوگی بھی نہیں۔

دونوں مال پر چلنے والی بگھی میں بیٹھے تھے جس کے آگے سفید گھوڑا جتا تھا۔ اس نے آج غور کیا تھا کہ یہ سب کتنا اچھا تھا۔ دادا کے ساتھ بیٹھنا اور جگمگ کرتی روشنیوں کو دیکھنا۔ کھوئے والی قلفی کھانا اور ہاتھ کو قلفی کے نیچے رکھنا۔ کھوئے والی قلفی جب گرتی ہے تو پھسل کر پوری کی پوری گرتی ہے اور یہ ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ کسی تسلی سے زائل نہیں ہوتا۔ مزید پانچ دس قلفیاں کھانے کے بعد بھی بس وہی ایک گر جانے والی قلفی یاد آتی رہتی ہے۔

عید کی روشن بڑی تاریخی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپ سے وہ موسیقی پیدا کی جو صرف لاہور کے گھوڑے مال پر دوڑتے پیدا کیا کرتے ہیں۔ وہ ہنستے مسکراتے ان دو بچوں کی طرف گھر آئے جو عید کے تین دن عیدی جمع کرنے میں لگا دیتے ہیں اور صرف اس لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ مبادا ان کے پیچھے کوئی مہمان آجائے اور ان کی عیدی ماری جائے۔ لیکن وہی عیدی جمع کرنے والے یہ دو بچے چوتھے دن گھر سے نکلتے ہیں اور کیا خوب نکلتے ہیں۔

* * *

"امرحہ دو دن بعد جارہی ہے۔" کھانے کی میز پر دادا نے اعلان کیا۔

"کہاں؟" دادی نے پوچھا۔ وہ سمجھیں اکثر بلوچستان جاتی رہتی ہے اب کے شاید پشاور کو نکل جائے اپنے ٹولے کے ساتھ۔

"مانچسٹر۔"

"وہ کیا ہے؟"

دونوں نے اپنی طرف سے دھماکا کیا تھا وہ پٹاخہ بھی نہ نکلا۔ نظر اتاری جانی چاہیے تھی ان سب کی جغرافیائی معلومات کی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ مانچسٹر شہر کا نام ہے اور یہ شہر برطانیہ میں ہے۔

"کوئی رشتہ آیا ہے امرحہ کا وہاں سے۔" اس اگلے سوال پر دادا خاموش ہی ہوگئے۔

"تمہاری بیٹی اتنی قابل ہے کہ مانچسٹر کے میئر نے خود خط لکھ کر اسے بلایا ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں آکر پڑھو۔" دادا نے طنز کیا۔

جیسے وائٹ ہاؤس سے خط آتا کہ اوباما کی اسسٹنٹ بنو آکر کوئی فرق کب پڑنے والا تھا۔ سب آرام سے کھانا کھاتے رہے۔

"امرحہ باہر جارہی ہے پڑھنے۔ دو دن بعد فلائٹ ہے اس کی۔"

اب فرق پڑا۔ اماں' بابا' دادی نے حیرت سے دادا کو دیکھا۔

"پیسے کہاں سے آگئے۔" بابا غصہ دبا کر بولے۔

"مفت پڑھنی ہے۔ سارا خرچہ یونیورسٹی نے کیا ہے۔"

"بابا آپ کیوں پاگل بنا رہے ہیں مجھے۔ آج کل کون مفت میں سب کرتا ہے۔ آپ نے اپنا پلاٹ تو نہیں بیچ دیا۔ وہ میں نے امرحہ اور دانیہ کی شادی کے لیے رکھا تھا۔"

پلاٹ کو بیچنے کی کوشش تو دادا نے بہت کی تھی پر وہ ایسی اجاڑ جگہ پر واقع تھا کہ بک ہی نہیں رہا تھا۔

"پلاٹ جہاں تھا اب بھی وہیں ہے۔ جا کر دیکھ آنا۔"

"کہیں نہیں آنا جانا۔ رشتہ دیکھا ہے اس کا ایک بس شادی ہوگی اس کی۔"

"رشتہ۔" امرحہ نے دادی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کمرے میں آگئی اور جلدی جلدی اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خود کو تھپکی دے کر کہتی جاتی۔

"مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ میں چلی جاؤں گی۔ میں چلی جاؤں گی۔"

دادی' اماں' بابا میں باہر تکرار بڑھتی جارہی تھی۔ یہ کون سا رشتہ تھا جو اس برے وقت میں اس کے لیے آیا تھا۔ اب اس کا جی چاہا بلکہ اس نے دعا کی کہ اس کے بارے میں جو جو کچھ مشہور ہے وہ سب ان رشتے

والوں تک پہنچ جائیں۔۔۔ اس کے خاندان والے انہیں فون کر کر کے بتائیں کہ لڑکی کیسی جنم جلی ہے منحوس ہے۔۔۔ کالی نظر۔۔۔ کالی زبان والی ہے۔۔۔ اور نہیں تو کوئی دادی کی زبانی تیار کردہ اس کا پیدائشی خلاصہ ان تک پہنچا دے کہ منگل کی دوکو کیا کیا ہوا تھا فقط ایک اس کی آمد سے۔

کوئی موقع تھا رشتے کا۔۔۔ اس کی انگلیاں گھس گئی تھیں میلز لکھ لکھ کر، آن لائن اسکالر شپ فارمز بھر بھر کر اور دادی اور اماں اس کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

وہ خود کو تھپکتی رہی اور کہتی رہی "میں چلی جاؤں گی۔۔۔ میں پرسوں جا رہی ہوں۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ دادا سب ٹھیک کر لیں گے۔" کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی سامان بھی پیک کرتی رہی، پاسپورٹ کو حفاظت سے چھپا دیا کہ بابا غصے میں آ کر اس کا پاسپورٹ ہی نہ جلا دیں۔

رات گزرتی رہی باہر سے ہنوز چاروں کی تیز آوازیں آتی رہیں اور پاسپورٹ کو چھپانے کے بعد بند کمرے کے دروازے کے ساتھ لگی زمین پہ بیٹھی کر سسکنے لگی لیکن ساتھ ساتھ بڑبڑاتی رہی۔

"میں چلی جاؤں گی۔۔۔ میں تو جا رہی ہوں۔"

دادا نے دروازہ کھلوایا تو اسے دروازے پہ ہی لوٹتے پایا اور اس کی بڑبڑاہٹ کو بلند ہوتے سنا۔

تکیہ لا کر اس کے سر کے نیچے رکھا۔۔۔ زندگی میں وہ پہلی رات اتنی خوش تھی اور اس خوشی کی اسے اتنی فکر تھی کہ وہ بنا بستر کے فرش پر سو گئی تھی۔۔۔ انہیں دکھ ہوا۔ اس ماحول نے اسے اتنے دکھ نہ دیے ہوتے۔ اس گھر میں اس کی ایسی حیثیت نہ ہوتی تو وہ ہر رات ایسے ہی سوتی۔۔۔ رو رو کر آنکھیں سرخ کیے خوف زدہ نیند نہیں بلکہ آنکھیں موند کر پریوں کا انتظار کرنے والی نیند۔۔۔ دادا اس کے پاس ہی بیٹھ گئے اور اسے دیکھتے ہی رہے۔۔۔ اولاد وہ ہی جس طوطے میں والدین کی جان ہوتی ہے وہ طوطا امرحہ تھی ان کے لیے۔

انہیں اتنا پیار امرحہ کے والد سے بھی نہیں تھا باقی کی اولادوں سے بھی نہیں تھا۔۔۔ ایک دن امرحہ ان سے خائف ہو کر پوچھنے لگی۔

"آپ بھی دوسروں کی طرح ہو جائیں نا۔۔۔ کیوں کرتے ہیں مجھ سے پیار۔"

وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکے۔۔۔ قدرت ہمیشہ انسان پر اتنی مہربان ضرور رہتی ہے کہ اگر ساری دنیا اس انسان سے نفرت کرنے لگتی ہے تو کوئی ایک ضرور اس پر جان چھڑکتا ہے۔ وہ انسان کوئی بھی ہو سکتا ہے اور کوئی چرند پرند یا دوسری مخلوق بھی۔۔۔ بلاوجہ کی نفرت ضرور ایک بلاوجہ کی محبت کو ساتھ باندھ لاتی ہے۔۔۔ جیسے جیسے وہ دوسروں کے لیے وہ ناپسندیدہ ہوتی گئی ان کے لیے پسندیدہ ترین ہوتی گئی۔۔۔ خدا بھی بھلا کبھی یہ بھولتا ہے کہ اس کے بندے کے آس پاس بہت کانٹے اگ آئے ہیں۔۔۔ اور اب اسے ایک مہکتے ہوئے تروتازہ مہکنے والے پھول کی اشد ضرورت ہے۔۔۔ تاکہ اس پھول کو پا کر وہ کانٹوں کی دی اذیت کو فراموش کر دے۔۔۔ دادا کیا جان سکتے تھے یہ تو خدا ہی جان سکتا تھا اور جو بہتر جان سکتا ہے وہی بہترین کر سکتا ہے۔۔۔ بے شک۔۔۔ بابا نے اسے دس ہزار روپے دیے کہ وہ ضروری خریداری کر لے۔۔۔ اماں اور دادی کا مزاج البتہ بہت برہم تھا۔۔۔ دادا کے ساتھ جا کر ہی اس نے ضروری خریداری کی۔۔۔ دانیہ نے اس کا سامان پیک کروایا۔۔۔ حماد اور علی دل مسوس کر اسے دیکھتے رہے۔۔۔ آخر وہ اتنی دور جا رہی تھی۔

دادا مسلسل دو دن سے اپنی آنکھوں کی جھڑی چھپا رہے تھے۔

"یہ پڑھنے جا رہی ہے بھاگ نہیں رہی۔۔۔ ماں باپ تو خوش ہوتے نہیں۔ تم دونوں اسے رخصت کرو خوشی سے، یہ نہ ہو کہ جہاز کریش ہوئے یا یہ لاپتا ہو جائے۔"

دادا نے یہ چھوٹا سا لیکچر دادی اور اماں کو دیا تھا۔۔۔ اس کا جہاز کریش نہ ہو جائے یا وہ لاپتا نہ ہو جائے۔ دونوں نے اپنی برہمی کو ایک طرف رکھا اور اسے

دعاؤں میں الوداع کہا۔

وہ مانچسٹر کے لیے روانہ ہو گئی۔

شہر اسباق کے لیے۔

شہر آزاد کے لیے۔

شہریار م کے لیے۔

☼ ☼ ☼

وہ برطانیہ کے تیسرے مصروف ترین ایئرپورٹ کی اونچی چھت تلے ایڑی کے بل گھوم گھوم گئی۔

"میں مانچسٹر آگئی ہوں آگ لگانے"

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چلا کر کہا۔ چند لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ گھیردار سفید شلوار اور گول دامن قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کا سفید لمبا دوپٹہ مانچسٹر ایئرپورٹ کی صفائی کر رہا تھا اور خاص کر ہر آنے جانے والے کے سامان کے ساتھ الجھ رہا تھا۔ اس نے پھر سے دونوں بازو پھیلا کر ایڑی کے بل گھوم کر کہا۔

"میں آگئی مانچسٹر۔ میں اب کبھی نہیں روؤں گی اور تم مجھے کبھی نہ رلانا۔"

برصغیر کے حاکم وقت کی سرزمین پر گھوم گھوم کر اس کا سفید دوپٹہ لہراتا بہت خوش ہو رہا تھا۔ خوش بختی کا اگر کوئی اشارہ تھا تو وہ اس وقت امرحہ نامی نعرہ تھا۔ مسرت و شادمانی کا اگر کوئی ستارہ تھا تو وہ یہی۔ یہی۔ ایڑی کے بل گھوم گھوم رہا تھا۔

سکون و راحت کے دریا کا اگر کوئی کنارا نہ تھا تو بس۔ وہ امرحہ کا وجود سارا تھا۔

اس کو کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تین گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی لیکن اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ تین دن بھی انتظار کر سکتی تھی۔ اب اسے کہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اسے اپنے نام کا بورڈ دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ لانگ کراس بیگ لٹکائے ایک چائنیز نقش کورین لڑکی بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔

"میں ہوں امرحہ۔" وہ لپک کر اس کورین لڑکی کی طرف لپکی۔

"اوہ ہیلو۔ سوری مجھے دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں چلیں۔۔۔؟"

"دراصل جسے تمہیں لینے آنا تھا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا آتے ہوئے۔ پھر مجھے آنا پڑا۔ زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔"

امرحہ کی شکل بنی پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔ ہانا آگے آگے چلنے لگی وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ امرحہ کے لیے اس کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ بلڈنگ تک آئیں۔ سامان اوپر لائیں اور فلیٹ کے اندر آگئیں۔

فلیٹ خالی تھا۔ دو کمرے سامنے۔ چھوٹا سا لاؤنج اور لاؤنج کے سامنے ہی اوپن کچن۔ امرحہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسا صاف ستھرا فلیٹ اس کے لیے واؤ۔

ہانا اسے ایک کمرے میں لے آئی جہاں دو سنگل بیڈ رکھے تھے اور آنے جانے کے لیے جگہ نکال کر فرش پر ایک فولڈنگ میٹرس بچھایا گیا تھا۔ جہاں میٹرس بچھا تھا یقیناً وہ ان کے چلنے پھرنے کی چند قدمی جگہ ہوگی۔

"یہ آپ کا بستر ہے۔" اس نے فرشی بستر کی طرف اشارہ کیا۔ اور امرحہ کا موڈ ہی آف ہو گیا۔ وہ کیوں سوئے نیچے۔

"برائے مہربانی اس کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ مت لگائیے گا۔" یہ فقرہ اس نے جبراً مسکرا کر لیکن بہت درخواست گزار انداز میں کہا اور کیونکہ ہاف چائنیز تھی تو ذرا سا جھک کر کہا۔

جب تک وہ فریش ہوئی۔ ہانا نے اسے کافی اور سینڈوچ بنا دیے۔ "یہ میری طرف سے۔" چھوٹی سی ٹرے کو آگے کرتے ہوئے اس نے عاجزی اور ایسی خوشی سے کہا جیسے اپنی قیمتی خزانے میں سے اسے کچھ عنایت کر رہی ہو۔ امرحہ دیکھ کر رہ گئی۔ اتنی لمبی فلائٹ کے بعد اسے یہ چھوٹا سا خوان پیش کیا جا رہا تھا۔

"شاید یہ ابتدائیہ ہو اور اصلی سوپر (کھانا) رات میں ہو۔" امرحہ سوچنے لگی۔

"میں لیٹ ہو رہی ہوں۔۔۔ مجھے جانا ہے۔" اور جاتے جاتے بھی وہ پھر کہہ گئی۔ "کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگائیے گا پلیز۔"

لیکن وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتی رہی۔۔۔ اسٹڈی ٹیبل پر رکھے نئی نئی اشکال والے پرفیومز کو اسپرے کرتی رہی۔۔۔ دراصل وہ صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ وہ کس قدر اصلی ہیں۔۔۔ یعنی کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں کتنا بھی مہنگا اور بڑی برانڈ کا پرفیوم لے لیا جائے وہ اصل کی کاپی ہی ہوتا ہے اصل نہیں۔۔۔ سب کے پرفیومز بے دریغ اسپرے کرتے اسے کچھ کچھ حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ پاکستان میں وہ اصل کی کاپی ہی خریدتی رہی ہے۔۔۔ پورا فلیٹ معطر ہو گیا اتنے ہائی کوالٹی پرفیومز سے۔ وہ۔۔۔ وہیں قریب ہی کچھ میک اپ کا سامان رکھا تھا وہ اسے دیکھتی رہی۔۔۔ کتابوں پر صرف ایک نظر ڈالی ایسے ایسے ٹائٹل تھے کتابوں کے جیسے عہد قدیم کی کتابیں عہد جدید کے لباس میں ملبوس پڑی ہوں۔۔۔

عہد قدیم سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔۔۔ واش روم گئی۔۔۔ ایک ایک آئٹم کو چیک کیا، فیس واش، باڈی واش۔ لوشنز کو دیکھا۔۔۔ حتیٰ کہ باتھ ٹب کے کنارے پر رکھی چھوٹی چھوٹی بوتلوں کو بھی۔۔۔ پھر وہ کچن میں آئی۔۔۔ ایک ایک کیبنٹ کو کھول کر دیکھا۔۔۔ فوڈ آئٹمز کو سونگھ کر دیکھا۔۔۔ دوسرا کمرا لاک تھا۔۔۔ لاؤنج میں رکھا ٹی وی اس نے آن کیا اور پہلے چینل چیک کرتی رہی پھر ایک میوزک چینل لگا کر کچن میں آ کر نوڈلز بنانے لگی۔۔۔ دو عدد نوڈلز کے پیکٹ بنائے۔۔۔ بڑے پیالے نما باؤل میں ڈالے۔۔۔ اور ایڈورڈ مایا کو سنتے سنتے کھا گئی۔ باؤل کو میز پر ہی رہنے دیا اور ٹی وی بند کر کے سنگل بیڈ پر آ کر سو گئی۔

"تمہیں یقیناً کیا تھا انہیں۔۔۔ کوئی مذاق تھا۔"

رات کو بارہ کے بعد کا وقت ہو گا جب اسے اٹھایا جا رہا تھا۔

"مس پاکستان۔۔۔ پلیز اٹھیں۔" ایک نیا چہرہ اسے اٹھا رہا تھا۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ یہ خواب ہے سو وہ بدستور سوئی رہی۔

"لیڈی امرحہ۔۔۔ پلیز۔۔۔ ورنہ میں آپ کی ناک کے پاس یہ ڈی ڈی اسپرے کر دوں گی۔۔۔ لینڈ ٹرسٹ ہی! اس کی اسمیل دنیا کی گندی ترین اسمیل ہے۔۔۔ کئی ہفتوں تک ناک میں گھسی رہتی ہے۔"

امرحہ تو خواب میں دلوا کے ساتھ بیٹھی نہاری کھا رہی تھی۔

اسپرے کا ڈھکن کھلا اور دنیا کی گندی ترین بدبو اس کی ناک کے قریب آئی۔۔۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی وہ کئی ہفتوں نہیں جانے والی تھی۔

"واٹ۔۔۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"ابھی میں نے اسپرے نہیں کیا۔۔۔" اس نے ذرا سا جھکا کر اسپرے کی بوتل پر ڈھکن رکھا۔

امرحہ نیند سے بوجھل آنکھوں سے گہری سبز آنکھوں والی کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔ اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔۔۔

ڈی ڈی کا ڈھکن پھر سے کھلا۔۔۔ اور اس کی ناک کے قریب آیا۔۔۔ اس نے ہاتھ سے پرے کیا۔۔۔ اس بار اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"کتنا غیر مہذب انداز ہے یہ۔" امرحہ کی آواز روٹھی ہوئی تھی۔ گہری سبز آنکھیں پھیل گئیں۔

"غیر مہذب۔"

"تم لوگ کتنی بھی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھ لو، بنیادی اخلاقی اصول کبھی نہیں سیکھ سکو گے۔"

اس بار سبز آنکھیں طنز سے اسے دیکھنے لگیں۔ "ذرا صبر کے ساتھ باہر آ جائیے۔" وہ کہہ کر چلی گئی۔

امرحہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ اس نے جان بوجھ کر زیادہ وقت لگایا کہ کر تی رہیں کھانے پر اس کا انتظار۔۔۔ لیکن باہر لاؤنج میں کوئی کھانے والے کی میز بچھی تھی نہ ہی کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آ رہی تھیں البتہ ایک نہ دو پورے پانچ کا مجمع باہر بیٹھا تھا اور

میز پر نوڈلز کا وہ باؤل رکھا تھا جس میں کچھ نوڈلز بچے تھے۔ وہ مجمع اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جائیے۔" بھورے بالوں والی نے کہا جس نے ایشیائی طرز کی بالوں کی چوٹی گوندھ کر دائیں شانے کی طرف ایسے لٹکا رکھی تھی جیسے کنڈلی مارے بھورا سانپ کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑا جھول رہا ہو۔ امرحہ بیٹھ گئی۔ شاید کھانے سے پہلے متعارف ہونا ہو گا۔

"یہ مس پاکستان ہیں۔ امرحہ۔" ہانا نے کہا۔

"ہائے۔ میں للی کول ہوں۔ اسکاٹ لینڈ سے۔" اسپرے والی نے اپنا تعارف کروایا۔

"میں شرلی مارگوٹ۔" بھورے بالوں والی نے کہا لیکن وہ مسکرانہ سکی۔

"آئی ایم بیٹی لو۔ میں جرمنی سے ہوں۔" بہت لمبی اور بہت پتلی بیٹی لو نے بے طرح مسکرا کر کہا امرحہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہنسی اس کی آمد سے ہی قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

"میں عذرا ہوں۔ شکاگو سے۔" لڑکھڑاتی اردو میں آواز آئی مردانہ ونیم اسٹائل کی حامل جسے وہ شارلٹ کرسٹینا ٹائپ سمجھ رہی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا۔؟" ہانا نے بولنا شروع کیا۔

"میں صرف واش روم گئی تھی۔" وہ صاف مکر گئی۔ ہانا کا منہ کھل گیا "یہ جھوٹ بول رہی ہیں شرلی۔" شرلی نے آنکھ سے اشارہ کیا ہانا کو۔ اور ہانا خاموش ہو گئی۔

"یہ۔" شرلی نے میز پر رکھے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے کیا معلوم اس کے بارے میں۔ یہ تو پہلے سے یہاں رکھا تھا۔" اب کی بار وہ حقیقتاً ڈر گئی تھی اور اسے افسوس ہوا اس نے سارے نوڈلز کھا کر باؤل کو دھو کر کیوں نہ رکھا۔

"ٹھیک ہے امرحہ! آپ جا کر سو جائیں۔ سوری آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"اور کھانا۔؟" وہ کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

وہ دونوں پہلے اسے پھر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ بیٹی لو نے گو منہ پر ہاتھ رکھ لیا لیکن امرحہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اپنی ہنسی کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"ابھی آپ کو اور بھوک لگی ہے۔؟" عذرا نے پوچھا۔

"نہیں بھوک تو نہیں لگی۔ پھر بھی کھانا تو کھاتے ہیں نا۔" اس سے بھی بات بن سکی لیکن حقیقت میں اسے بھوک لگی تھی اور بھوک سے زیادہ اسے یہ انتظار تھا کہ آخر اس کے لیے کھانے کا کس قسم کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا کیا بنایا گیا ہے اس کے لیے۔

"ہم بنا بھوک کے کھانا نہیں کھاتے لیڈی۔" شرلی نے کسی قدر محبت سے کہا۔

"کھانا تو بھی نہیں؟" اس نے اردو میں کہا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا بس عذرا نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ کمرے میں آئی اور فرشی بستر پر آ کر سو گئی۔ باہر بھنبھناہٹ ہوتی رہی۔ "ہوتی رہے میں فیصد ادا کیا ہے۔" وہ سو گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ اٹھی تو کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی "اف اتنی صفائی۔ اتنی خوب صورتی۔"

بلڈنگ کے جس راستے سے وہ اس فلیٹ میں آئی تھی یہ اس کی پچھلی طرف کا منظر تھا جہاں سرسبز گھاس کا ایک کھلا قطعہ تھا اور اس سرسبز گھاس پر جگہ جگہ مختلف کیاریوں میں ڈھیر سارے پھول کھلے تھے۔ قطعے کے پار سڑک جس پر دور دور تک گرد کا نشان نہ تھا۔ اتنی خاموشی جیسے کوئی نئی نوع انسان زمین پر اتر آئی ہیں۔

کسو خلل تھا۔ سارا فلیٹ ہی خالی تھا۔ بیڈ کورز بے شکن تھے' اسٹڈی ٹیبل پر ایک بھی پرفیوم موجود نہیں تھا۔ واش روم میں کل رات تک نظر آنے والے سب ہی شیمپوز فیس واش غائب تھے۔ وہ کچن

میں آئی تو کاؤنٹر پر ایک چٹ رکھی تھی۔
"یو آر بریک فاسٹ۔"

انڈا' جام' چار ڈبل روٹی کے پیس' دودھ اور شوگر ایک پلیٹ میں ——— کافی کے مگ میں ایک مگ جتنی کافی اور سائیڈ پر رکھا ایک عدد ٹی بیگ۔

باقی چاروں کیبنٹ کو ایک زنجیر سے پرو کر درمیان میں چھوٹا سا تالا لگا دیا تھا۔۔۔ امرحہ کو ایک معمولی سا جھٹکا لگا یہ سب دیکھ کر۔۔۔ بس یہی معمولی سا۔۔۔ اس کے پاس کوئی فون نہیں تھا رات بابا نے اس کی بات پاکستان کروا دی تھی۔۔۔ اب ظاہر ہے اسے خود ہی فون کرنا ہوگا اگر وہ اس معمولی سے جھٹکے کے بارے میں دادا سے لمبی بات کرنا چاہ رہی تھی تو۔۔۔ اور لمبی بات پر لمبا بل بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔

دوسری چٹ فریج پر لگی تھی۔ "نو بجے آ کر ڈیلی تمہیں لے جائے گی یونیورسٹی تیار رہنا۔"

ناشتا کر کے وہ تیار ہو گئی۔ ٹھیک نو بجے ڈیلی آ گئی چھوٹی سی عورت نما بچی کہ لڑکی تھی۔

"میں ڈیلی ہوں۔۔۔ مجھے شرلی نے کہا تھا کہ تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کرتی جاؤں۔"

"میں امرحہ ہوں۔۔۔ میں آج پہلی بار یونیورسٹی جا رہی ہوں۔"

"یہ تمہیں دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۔۔" وہ مسکرائی اور امرحہ کو وہ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگی' ان فیکٹ امرحہ کو اس کی گھسی ہوئی جینز اور گھسے ہوئے شوز بھی بہت اچھے لگ رہے تھے اور اس کے بریسز والے دانت بھی کیونکہ وہ مانچسٹر یونیورسٹی میں قدم رکھنے جا رہی تھی۔۔۔ اسے سب اچھا ہی لگنا چاہیے تھا۔

"جلدی کرو ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" ڈیلی تیزی سے باہر نکلی۔ فلیٹ کو لاک کر کے وہ اس کے پیچھے آئی۔۔۔ ڈیلی ایک منی سی سائیکل کو لیے تیار کھڑی تھی۔

"آ جاؤ بیٹھ جاؤ۔۔۔" اس نے اس منی سی سائیکل کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

تو اس پر ڈراپ کرنا تھا اسے۔۔۔ اس لیے خاص ڈیلی کو بھیجا گیا۔

"کیا ہوا امرحہ۔۔۔ آ جاؤ نا۔۔۔ مجھے اپنی کلاس بھی لینی ہے۔"

وہ اس منی سی لڑکی کی منی سی سائیکل پر بیٹھ گئی' پہلے اپنی شرمندگی چھپاتی رہی پھر اپنی ہنسی دباتی رہی۔۔۔ سڑکوں پر سے گزرتے اس نے کسی طرف بھی نہ دیکھا اور ڈیلی کے پیچھے منہ چھپائے وہ اپنی ہنسی کی رفتار کم کرتی رہی۔

"دادا۔۔۔" اس نے خیالوں میں دادا کو مخاطب کیا۔ "مجھے اتنی ہنسی آ رہی ہے کہ میرا جی چاہتا ہے اس سڑک پر کود جاؤں اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اتنی زور زور سے ہنسوں کہ سارا مانچسٹر اکٹھا ہو جائے۔ دادا! زندگی کیسے کیسے چھوٹے "معمولی" بے کار قسم کے بے تکلیف مزاح سناتی ہے۔۔۔ دادا! مجھے وقت کے یہ بہانے اچھے لگے۔۔۔ جو اس نے میری زندگی میں پرو دیے۔"

اس وقت بار بار اس کی نظر ڈیلی کے ان چند بالوں کی طرف اٹھ جاتی تھی جنہیں ڈیلی نے سر سے بہت اوپر اٹھا کر چنی منی سی پونی میں باندھ رکھا تھا۔۔۔ اور جو خدا معاف کرے پونی ٹیل کے نام پر خاصا کھرا کلنک کا ٹیکہ تھا۔۔۔ ہوا میں لہراتے وہ کسی چھوٹی چڑیا کی دم جیسے لگ رہے تھے۔

ڈیلی سنجیدگی و متانت سے اپنی سائیکل چلا رہی تھی جیسے شاہ اردن کی سونے کی بگھی دوڑا رہی ہو۔۔۔ سارا راستہ وہ امرحہ کی ہنسی کے فواروں کی بوچھاڑ سہتی رہی تھی۔۔۔ اسے اتارنے کے بعد وہ بولی بھی تو صرف اتنا "کتنی موٹی ہو تم۔۔۔ جاگنگ کیا کرو۔" ڈیلی جیسے اسے اپنی سائیکل پر گھسیٹ کر وہاں تک لائی تھی اس کی پیشانی کا پسینہ بتا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آکسفورڈ روڈ پر برطانوی طرز تعمیر کی تاریخ ساز عمارت کے عین سامنے کھڑی تھی۔ یونیورسٹی میں کیمپس کی آرک کے پیچھے۔۔۔ جس کے اوپر بڑے سنہرے حرف میں یونیورسٹی آف مانچسٹر جڑا تھا' جس

کی بنیاد 1824ء میں رکھی گئی تھی۔
علم، حکمت، انسانیت جس درسگاہ کا موٹو تھا۔۔۔ جو قریباً چالیس ہزار کے قریب اسٹوڈنٹس کو فیض یاب کر رہا تھا۔۔۔ دنیا کی دس بہترین درسگاہوں میں سے ایک "دی یونیورسٹی آف اچجسٹر"

وہ مین کیمپس کو۔۔۔ آرک کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس طرز تعمیر کی عمارتیں اس نے لاہور میں بھی دیکھی تھیں۔۔۔ یہ اسے کچھ کچھ لاہور کے عجائب گھر جیسی بھی لگی۔۔۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اندر کیسا جہان آباد ہے۔۔۔ دنیا کے کیسے لائق فائق قابل اساتذہ یہاں اکٹھے کیے ہیں۔۔۔ وہ کیسے کیسے شاگردوں کے استاد بنا دیے گئے ہیں۔۔۔ وہ ابھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ بہت جلد بہت کچھ جان جائے گی۔

اسٹوڈنٹس کا جم غفیر ایسے اندر جا رہا تھا جیسے اندر کوئی چیز مفت بانٹی جا رہی ہو جیسے کہ "بریانی" یا اتنی کلو مشہور و معروف ابو دائلی میں بھی نہیں ملتا۔۔۔

"آجاؤ امرحہ۔" ڈیلی کلاس آگے جا چکی تھی۔

امرحہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔۔۔ اس نے اپنے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔۔۔ یہ جس طرز کا سائیکل اسٹینڈ بھی امرحہ کے لیے نیا تھا۔ نیز اب لوگوں کے لیے بہت کچھ نیا ہونے والا تھا۔ اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف دیکھے۔ بس جی چاہ رہا تھا سب ایک ہی بار جلدی سے دیکھ لے۔۔۔ اسٹوڈنٹس کی آمد و رفت میں تیزی بھی تھی اور پھرتی بھی اور وہ ایسے تھی جیسے کہ پھرتی اور تیزی سے ہم کبھی ملے نہیں اور سست روی سے ہماری بہت دوستی چل رہی ہے۔

"امرحہ! تیز چلو نا۔۔۔" ڈیلی نے بیس قدم آگے جا کر گردن موڑ کر آواز لگائی۔۔۔ اس آواز پر اس نے ذرا سی تیزی دکھائی اور اس سے پندرہ قدم قریب ہو گئی۔ ڈیلی سرسبز گراؤنڈ میں ایک گروپ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ امرحہ کا اتنی دور سے ہی ذرا دم سا نکل گیا۔۔۔ وہ دس بارہ لڑکے لڑکیوں کا گروپ تھا اور ان میں شرلی کو اس نے فوراً پہچان لیا۔ باقی عذرا کو پہچاننے میں اسے تھوڑا وقت لگا کیونکہ اس نے سر پر سیاہ نیٹ باندھ رکھی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔" اس نے ان کے قریب جا کر ذرا دبی دبی آواز میں کہا اگر ڈیلی کے ساتھ اس کی سائیکل پر بیٹھے وہ چلنے سے ذرا جلدی فارغ ہو جاتی تو اس سے کچھ معلومات ہی لے لیتی۔

سب نے اپنا اپنا نام لے کر تعارف کروایا۔ اس دوران وہ جس خلوص سے مسکراتے رہے امرحہ ہلکی پھلکی ہوتی گئی۔۔۔ وہ بلاوجہ ان کے دباؤ میں آ گئی تھی۔ یہ سب تو بہت اچھے ہیں۔

ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اٹھیں اور اسے ساتھ لے کر یونیورسٹی کیفے میں آ گئیں اور اسے کافی پلائی۔۔۔ جب وہ کافی کی آخری چسکی لے چکی اور گروپ کے لیڈر دائم اور گروپ کی لڑکیوں نوال اور بریرہ کی خوب صورتی وہاں نہ صرف میں دادو دے چکی تو دائم نے کچھ یوں بات شروع کی۔۔۔

"مس امرحہ! کیا آپ مجھے مکمل سنجیدگی اور توجہ سے سننے کا وعدہ کریں گی۔۔۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" اس نے ٹھیک اسی انداز میں کہا جس میں بچے ایک ہاتھ میں چاکلیٹ چھپا کر اور دوسرے ہاتھ کو آگے کر کے کہتے ہیں۔ "پکا وعدہ میں رات میں چاکلیٹ نہیں کھاؤں گا۔۔۔"

"گڈ۔۔۔ کیونکہ مجھے کچھ شک سا ہے اس لیے پھر کہہ رہا ہوں کہ درمیان میں مت بولیے گا۔۔۔ ہم یہ تین لوگ جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔۔۔ ہم نے اور کچھ ان دوستوں نے جو تعلیم مکمل کر چکے ہیں یا جو ہم سے سینئرز ہیں نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ کیوں نہ ہم اپنی ذاتی کوششوں سے لائق فائق قابل پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اسکالرشپ دیں۔۔۔ ہم انہیں اپنے جمع کیے گئے فنڈز سے یہاں بلوائیں تاکہ وہ پاکستانی اسٹوڈنٹس کو جو لائق تو ہیں لیکن اچھی تعلیم افورڈ نہیں کر سکتے انہیں آگے بڑھنے کا اور غیر ملکی سطح پر اپنا آپ منوانے کا موقع ملے تاکہ یہ سب بھی پاکستان کی ترقی میں

اہم ثابت ہو سکیں۔ سادہ لفظوں میں ہم بے حد ذہین لیکن بے حد غریب اسٹوڈنٹس کو یہاں بلوا رہے تھے۔ جو پاکستانی یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے تیس لوگوں کے گروپ نے مختلف ذرائع سے فنڈز اکٹھے کیے۔ ہم نے مختلف ایونٹس میں اسٹالز لگائے، کچھ میوزک اور تھیٹر کیا۔ کچھ ہماری اپنی سیونگ تھی اور کچھ ہمیں ہمارے والدین، رشتے داروں، دوستوں اور مختلف کمیونٹیز کے مختلف افراد نے فنڈز دیے۔ اور ہم نے مطلوبہ ہدف پورا کر لیا۔

ہم صرف پانچ اسٹوڈنٹس ہی افورڈ کر سکتے تھے، وہ بھی اس صورت میں اگر وہ یہاں آتے ہی جلد سے جلد اپنی خوراک اور رہائش کی ذمہ داری اٹھا لیتے۔ اگر ہم انہیں خوراک اور رہائش بھی دیتے تو صرف تین ہی کو یہاں بلوا سکتے تھے۔

ہمیں ایک ہزار سے زیادہ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے ہم نے پانچ کا انتخاب کیا۔ باقی کے جو ہزار اسٹوڈنٹس تھے، وہ بھی کسی سے کم ذہین نہ تھے لیکن جن پانچ کا ہم نے انتخاب کیا تھا وہ بہت غریب اور بہت چھوٹے قصبوں کے رہنے والے تھے اور ان کے لیے مانچسٹر یونیورسٹی آکر پڑھنے کے چانسز صفر تھے۔

وہ سب یہاں ایک ہفتہ پہلے ہی آ پہنچے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آتے ہی انہوں نے اپنی رہائش اور خوراک کا انتظام کر لیا ہے کیونکہ وہ پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ ہنر مند بھی تھے۔ اس لیے انہیں فوراً یہاں جاب مل گئی۔ ان میں سے ایک گاڑیوں کے لاک ٹھیک کرتا ہے اور ایس بی ورکشاپ نے سیلوٹ مار کر اسے جاب دی ہے۔ مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ایک ایسے طالب علم کو یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس نے اپنی پرائیویٹ تعلیم میں پنجاب بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور یہ کام اس نے گاڑیوں کے لاک ٹھیک کرتے اور ایک دن بھی اپنی جاب سے چھٹی نہ کرتے کیا۔

ہمیں جتنی درخواستیں موصول ہوئیں وہ کم و بیش سب ہی ایسی تھیں لیکن ایک آپ کی درخواست سب سے مختلف تھی۔ آپ کی تعلیمی اسناد میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ آپ ان ہزار میں سے صفر تھیں۔ آپ لاہور جیسے بڑے تعلیمی شہر میں رہتی تھیں۔ جہاں اچھے تعلیمی اداروں کی بھرمار ہے۔ آپ پڑھنے کے لیے ایک اچھے کالج جاتی تھیں۔ آپ کے فادر کی پاکستان کے ایک بڑے بازار میں اپنی ذاتی دوکان تھی۔ آپ کے پاس اپنا ذاتی گھر تھا۔ آپ کوئی جاب بھی نہیں کرتی تھیں پھر بھی آپ کی تعلیمی قابلیت میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ آپ کسی بھی طرح اس اسکالر شپ کی مستحق نہیں تھیں۔ آپ کی درخواست پر جواب بھی نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن پھر ہم نے جواب دیا۔ آپ کی تعلیمی قابلیت دیکھ کر نہیں۔ آپ کی ذہنی حالت دیکھ کر۔ اپنی آخری میل میں آپ نے لکھا تھا "میں ہوں ہی منحوس... بس جل کر مر جاؤں تو ہی اچھا ہے۔" اس سطر پر ہم نے ذرا توجہ دی۔

ہماری ایک گروپ ممبر نے جو نفسیات کی طالبہ ہیں، آپ کی بھیجی گئی دوسری میلز بھی پڑھیں اور اس نے اپنی رائے دی کہ آپ کی ذہنی حالت بہت تباہ کن ہے اتنی ناکامیاں اٹھانے کے بعد مزید ناکامی آپ کو بالکل توڑ دے گی اور مایوس ہو کر آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں اس لیے ہم نے ایک مہینے کا وقت لیا آپ سے۔ ہم اس صورت حال پر حقیقتاً" کافی پریشان تھے ہم اپنے اسکالر شپ دے چکے تھے۔ آپ کو کیا دیتے۔ لیکن آپ کو اس کیفیت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اس لیے اس بار ہم نے اپنی پاکٹ منی نکالی۔ کچھ دوسرے اسٹوڈنٹس سے رابطے کیے۔ اور پھر چالیس اسٹوڈنٹس نے آپ کے لیے فنڈز اکٹھے کیے۔ اور بہت مشکل سے۔ اتنی مشکل سے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ان چالیس اسٹوڈنٹس میں عیسائی، مسلم، انڈین، بنگالی، جاپانی، امریکن، فرنچ سب شامل ہیں۔ اس لیے یہاں خاص طور پر میں آپ کو یہ ذہن نشین کروا دوں کہ ان افراد کی اقوام کا احترام

آپ پر لازم ہے۔

ہم نے آپ سے پوچھا۔ کیا آپ ففٹی پرسنٹ افورڈ کر سکتی ہیں؟ آپ نے کہا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس ففٹی پرسنٹ کے لیے آپ نے اتنی کوشش نہیں کی ہو گی جتنی ہم آپ کے لیے کر رہے تھے۔ لیکن آپ تھرٹی پرسنٹ لونگی پر مان گئیں۔ اگر آپ تھرٹی پرسنٹ پر نہ مانتیں تو آپ کے لیے مجھے اپنی وہ کار بیچنی پڑتی جو میں نے کالج کے زمانے میں اپنی پارٹ ٹائم جاب کی سیونگ سے خریدی تھی۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیے گا کہ جن چالیس اسٹوڈنٹس نے آپ کے لیے فنڈز دیے ہیں وہ بہت امیر کبیر نہیں ہیں۔ سب پڑھنے کے ساتھ جاب کرتے ہیں اور ایک ایک پینی بچاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ ہوا میں اڑ کر یا جادو سے یہاں نہیں آگئیں۔ ہر روز ہم نے آپ کے لیے میٹنگ کی ہے۔ صورت حال پر غور کیا ہے۔ کوئی ایک بھی ہاں کر کے پیچھے نہیں ہوا۔ کمائے گئے اور بچائے گئے ایک ایک پونڈ کو انہوں نے آپ پر انویسٹ کیا ہے۔ انویسٹمنٹ کرنا سمجھتی ہیں آپ۔ انویسٹمنٹ اس لیے کی جاتی ہے کہ پیسے لگانے والے کو نفع ہو۔ اور یہ فائدہ وہ اس طرح لے رہے ہیں کہ تیسری دنیا کا ایک باشعور تعلیم یافتہ ہو جائے۔ وہ اپنے ملک و قوم کا سہارا بنے۔ انہیں آپ ان کے دیے گئے پورے پیسے واپس کریں گی۔ ایک کے بدلے ایک پونڈ زیادہ۔ اور سارا منافع آپ لے جائیں گی۔ اس سارے منافع یا فائدے کے لیے انہوں نے انویسٹمنٹ کی ہے۔ میری بات کو برائے مہربانی سمجھیں اور یاد تو ضرور ہی رکھیں۔

جنہوں نے فنڈز دیے ہیں وہ آپ کو نہیں جانتے۔ کوئی ایک بھی آپ کا نام نہیں جانتا۔ شکل سے تو بالکل بھی نہیں۔ تاکہ آپ کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ ہم تین کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ فنڈز آپ کے لیے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ ہم نے آپ کی عزت نفس کا پورا خیال رکھا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ کوئی آپ کے پاس آکر آپ کو کچھ بھی جتائے۔ اب میں دوسری طرف آتا ہوں۔

آپ سے کہا گیا کہ اپنی رہائش اور کھانے کا ذمہ آپ کو لینا ہو گا۔ آپ نے کہا آپ یہاں آکر دیکھ لیں گی۔ گڈ۔ صرف یہی ایک اچھی اور مثبت بات تھی جو آپ نے کی تھی۔ جن پانچ لڑکیوں کے ساتھ آپ رہیں۔ ان سے ہم نے خاص درخواست کی تھی کہ وہ آپ کو عارضی طور پر چند دن اپنے پاس رکھ لیں۔ آپ کو ایئرپورٹ ریسیو کرنے کے لیے جانے والے جس شخص کا ایکسیڈنٹ ہوا وہ ہمارے لیے رضاکار بنا تھا جو آپ کو ایئرپورٹ سے لے کر گئی وہ اپنے اس دوست کے لیے آپ کی مدد کر رہی تھی جس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس بستر پر کل آپ سو رہی تھیں وہ مسٹر اینڈ مسز دونوں کے تھے۔"

اس نے نوال اور بریرہ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بھی باقی ماندہ بچی ہوئی سیونگ سے خرید کر وہاں رکھا۔ آپ کو ہانا نے منع کیا تھا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا لیکن آپ نے لگایا پرفیومز کو اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ سوائے کتابوں کے ہر چیز کو۔ آپ نے دو نوڈلز کے پیکٹ نکال کر کھائے۔ مس امرحہ وہ سب بہت اچھی میزبان ہیں۔ ان فیکٹ ہم سب جانتے ہیں کہ میزبانی کسے کہتے ہیں لیکن ہم سب اور وہ سب اپنے گھروں میں نہیں ہیں۔ ہم اپنے گھروں، شہروں، ملکوں سے دور یہاں اکیلے رہ رہے ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت۔

کاش رات ہی ہانا تھوڑا سا آپ کو اپنے بارے میں بتا دیتی۔ وہ صرف دو وقت کھاتی ہے۔ صبح وہ نوڈلز کا پیکٹ کھاتی ہے اور رات کو جہاں وہ جاب کرتی ہے وہیں سے اسے ایک برگر ملتا ہے اور ایک کپ کافی۔ وہ ایک ایک پونڈ بچاتی ہے کیونکہ اپنے تعلیمی اخراجات وہ خود ہی اٹھا رہی ہے۔ کوریا میں رہنے والے اس کے گھر والے اسے اخراجات کے نام پر ایک پاکستانی روپیہ بھی نہیں بھیج سکتے۔ اس نے تن تنہا مانچسٹر میں اپنے پڑھنے کا خواب پورا کیا ہے۔ شاید یہ باتیں آپ کو معمولی لگیں۔ آپ جو لاہور

کے تعلیمی اداروں میں پڑھتی ہیں اور جن کی فیس والدین ادا کرتے ہیں۔۔۔ آپ جنہوں نے کبھی کوئی جاب نہیں کی۔۔۔ نہ آپ کو جاب کی ضرورت پیش آئی ہے۔۔۔ آپ کو یہ سب معمولی لگے گا کیونکہ آپ نے کبھی زندگی میں سخت جدوجہد نہیں کی وہ بھی مسکرا کر حوصلے سے۔۔۔ یہاں بہت سے ایسے اسٹوڈنٹس ہیں جو زیادہ کھانا نہیں کھاتے کیونکہ انہیں زیادہ کتابیں خریدنی ہوتی ہیں۔۔۔ وہ ایک جینز دو ٹی شرٹس میں یہاں سے اپنی ڈگری لے جاتے ہیں۔۔۔ اور مسکراتے ہوئے آتے ہیں مسکراتے ہوئے ہی جاتے ہیں۔۔۔ شلی جن کے فلیٹ پر آپ رہ رہی ہیں ان کے ساتھ رہنے کے لیے آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ آج کی رات ہے۔۔۔ فائنل ڈیڈ لائن ٹھیک ایک مہینے کی ہے۔۔۔ آپ کے ایک مہینے کے کھانے کا سامان وہاں موجود ہے۔۔۔ آپ آج ہی اپنی رہائش اور جاب کا انتظام کرلیں۔" وہ رکا۔

"ویلکم ٹو مانچسٹر مس امرحہ۔۔۔" اس نے سانس بھی نہیں لیا اور پھر سے شروع ہوگیا۔

"یہ تو ہوگئیں آپ کے یہاں رہنے کے بارے میں کچھ تفصیلات۔۔۔ اب آپ کو میں کچھ تجاویز دیتا ہوں۔۔۔ یعنی اچھی باتیں۔" وہ مسکرایا۔

"برا مت مانیے گا لیکن یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان انڈیا سری لنکا اور ایسے ہی دوسرے ترقی پذیر ممالک سے آنے والے بہت شکایتی ہوتے ہیں۔۔۔ سست کاہل۔۔۔ بہانے باز۔۔۔ انہیں لگتا ہے بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ سب مشکلیں، مصیبتیں دکھ ان ہی کو مل گئے ہیں۔۔۔ رونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔۔۔ آپ کی شکل بھی کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔۔۔ رو دیں لیکن بہت بڑے دکھ پر، تکلیف پر۔۔۔ لیکن مشکل پر نہیں۔۔۔ یہاں آپ کو کوئی چپ نہیں کروائے گا۔۔۔ اس لیے نہیں کہ یہاں سب خود غرض ہیں جیسا کہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچا اور کہا جاتا ہے۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رونا بے وقوفی ہے۔۔۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔۔۔ نوال اور بریرہ بھی یہی سمجھتی ہیں۔۔۔ اگر چھوٹی بڑی مشکلات پر رونے والے کو بار بار چپ کروایا تو وہ بزدل بن جائے گا بہادر نہیں۔

مس امرحہ! اپنی سستی اور کاہلی کو بہانے بازی کو یہاں وہاں کوئی ڈسٹ بن دیکھ کر اس میں ڈال دیں یا آگ لگا دیں۔۔۔ اصل جل مرنا تو انہیں چاہیے۔۔۔ آپ لڑکی ہیں لیکن کمزور نہیں ہیں۔۔۔ ہمارے مذہب نے کہاں لڑکی کو کمزور کہا ہے۔۔۔ کہتے ہیں 'مرد رویا نہیں کرتے۔۔۔ لیکن یہ کہنا مرد کے لیے ہی کیوں ہے؟ عورت کے لیے کیوں نہیں یا مرد کے ہاتھوں بنا معاشرہ یہ مقولہ کہلواتا ہے تاکہ عورت کو ہر سطح پر کمزور ثابت کیا جاسکے۔

مس امرحہ! آپ مانچسٹر یونیورسٹی آچکی ہیں۔۔۔ آپ دوڑ میں شامل ہوچکی ہیں۔۔۔ یا تو گولڈ میڈل لیں۔۔۔ ورنہ دوڑ سے الگ ہوجائیں اور جاکر تماشائیوں میں بیٹھ جائیں اور یاد رکھیں، تماشائیوں کی بھیڑ میں آپ کو فوراً جگہ مل جائے گی۔۔۔ دوڑ میں آپ اگر صرف انجوائے منٹ کے لیے آئی ہیں تو آخری نمبروں میں آنے سے بہتر ہے کہ آپ دوڑ سے نکل کر کسی اور کو آگے آنے دیں۔۔۔ میرا یقین کریں 'دنیا میں جوہریوں کی کمی تو یقیناً' ہوگی لیکن ہیروں کی کسی صورت نہیں ہے۔"

اس بار وہ رکا اور کافی دیر تک رکا ہی رہا۔

"یونیورسٹی میں ویلکم ویک چل رہا ہے۔۔۔ پھر اس کی کلاسز شروع ہوجائیں گی۔۔۔ اس ایک ہفتے کے درمیان آپ گول گول گھومیں یا زمین کھودیں آپ کی رہائش کا بندوبست ہوجانا چاہیے۔۔۔ آپ کی جاب کا۔۔۔ آپ کے فوڈ کا۔۔۔ اگر آپ بھوکی نہیں رہ سکتیں تو۔۔۔ یہ سب آپ کے مسئلے ہیں اور یہ سب آپ حل بھی کرسکتی ہیں۔۔۔ کیا نہیں کرسکتیں؟"

اس کی گردن فوراً "نفی میں" پھریاں میں ہلی۔

"آپ سب سمجھ گئیں نا؟"

"جی۔" اس نے اوپر سے سر ہلایا۔۔۔ اندر آنسوؤں کا ریلا دبایا۔

"گڈ۔۔۔ اب آپ جائیں اور زمین کھودیں۔۔۔ وہ

میرا مطلب جاب ڈھونڈیں — اپنی ڈگری کے دوران آپ کو ہر صورت تھرٹی پرسنٹ واپس کرنا ہو گا — اپنے اخراجات کو آپ کو ایسے سنبھالنا ہو گا کہ آپ یہ تھرٹی پرسنٹ جلد سے جلد واپس کر سکیں — سمجھ گئیں آپ۔"

"جی۔" اس نے سرہلا کر بمشکل کہا۔

"نوال اور بریرہ اردو سمجھ لیتی ہیں تھوڑی بہت لیکن بول نہیں سکتیں — آپ کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھ میں آجائے اس لیے میں نے آپ سے خطاب کیا — آپ کو برا نہیں لگنا چاہیے۔"

"مجھے برا نہیں لگا۔"

"ویل — آپ کی شکل تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔"

"میری شکل ایسی ہی ہے۔"

"ایسی کیسی —؟"

"جھوٹ بولنے والی۔"

"اچھا — اب آپ کیا کریں گی۔"

"مجھے جاب ڈھونڈنی ہے — جلد سے جلد۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"بالکل ٹھیک کہا — ویسے آپ کی شکل بہت تیزی سے اور بہت سخت قسم کا جھوٹ بول رہی ہے — مس امرحہ — اگر آپ کو رونا آرہا ہے تو کسی ایسی جگہ چلی جائیے جہاں آپ کو کوئی دیکھے نہ — ٹھیک ہے۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

"پہلے جا کر اپنا اسٹوڈنٹ کارڈ بنوائیں — اپنی کلاسز کا معلوم کر لیں۔" وہ سہم سی گئی کہ ابھی یہ سب بھی کرنا ہے۔

"کارڈ — یہ کہاں سے بنے گا۔"

"آپ یونیورسٹی میں کھڑی ہیں اور سب اسی یونیورسٹی میں ہوتا ہے — یہ جو آپ اتنے سارے اسٹوڈنٹس دیکھ رہی ہیں — یہ سب بے چارے اپنے سب ہی کام کر رہے ہیں — آپ بھی یونیورسٹی میں گھومیں پھریں کہ آپ کے کام کیسے ہو سکتے ہیں — یا آپ کو کیسے کرنے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلیز دل ہی دل میں مجھے برا بھلا مت کہیے۔" امرحہ کا رنگ فق ہو گیا وہ یہی کر رہی تھی۔

"اور پلیز جب آپ کی جاب کا انتظام ہو جائے تو ہانا کے نوٹز واپس کر دیجیے گا۔"

"کر دوں گی۔"

"اور — ایک اور بات — دوبارہ کبھی اپنی ڈگری سے چھیڑ چھاڑ مت کیجیے گا — خاص کر پلیس کو ایڈ کرنے کی غلطی۔"

یہ آخری لیکن سب سے خطرناک دم تھا جو کیتھرین کے شور و غل میں بہت اہتمام سے پھنسا — وہ ان کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے ابھی ابھی افریقہ کے کسی قدیم قبیلے سے اسے کسی نے اٹھا کر لائے ہیں اور اسے بتا رہے ہیں کہ دیکھو ڈرو نہیں۔ وہ کوئی جنگلی درندہ نہیں پہیوں سے چلنے والی بڑی سی بس ہے جس پر سفر کیا جاتا ہے۔ اسے ایک ڈرائیور چلاتا ہے — وہ خطرناک نوکیلے بڑا درندہ نہیں۔

ان تینوں کی شکلیں — جیسے قہقہوں کے دھماکوں کو وہ اندر ہی اندر دبا رہے ہوں — وہ اس آخری بات پر ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے اور وہ دھاڑیں مار کر نہ رونے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہوتی جا رہی تھی — اس کی شکل سب بتا رہی تھی — اسے خیال سا آیا کہ اس کی نحوست کو لے کر اس پر جو حملے کیے جاتے رہے تھے۔ وہ کتنے معمولی سے تھے ان حملوں کے مقابلے میں جو مانچسٹر میں مانچسٹر والوں نے اس پر کیے۔

وہ تو ننھی سی چھوٹی سی بچی تھی۔ اسے خوش بھی نہ ہونے دیا گیا اور رلا دیا — رلا دیا۔

آنسوؤں کا سمندر اس کی آنکھوں میں تیرتا نظر آنے لگا۔ ان تینوں نے اس کی شکل کی طرف دیکھا اور بالکل خاموش ہو گئے پھر ایک کھ کرا اٹھ گئے — اگر وہ اس کے اولین استاد تھے تو کمال کے استاد تھے۔ انہوں نے اسے سمندر میں دھکا دے دیا تھا ڈوب کر مر جاؤ یا تیر کر ابھر تو — مانچسٹر میں ملنے والا پہلا سبق — مانچسٹر

میں سنا جانے والا پہلا لیکچر اور مانچسٹر میں گرائے جانے والے اولین آنسو۔۔۔

"ویلکم ٹو مانچسٹر۔" (مانچسٹر میں خوش آمدید)

☼ ☼ ☼

وہ کینٹین سے نکلی اور ایک ایسا گوشہ ڈھونڈنے لگی جہاں کوئی نہ ہو لیکن ویلکم ویک تھا۔ یونیورسٹی میں ایسا رش تھا جیسے چودہ اگست کو مال پر ہوتا ہے۔۔۔ خاص کر چمن اور رینگل چوک کے پاس۔۔۔ خیر وہ سبزے پر بیٹھ گئی۔۔۔ اور منہ نیچے کرکے رونے لگی۔۔۔

آج اس کا پہلا دن تھا تو وہ بہت اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔۔۔ اس نے مسکارا بھی لگایا تھا اور آئی لائنر بھی۔۔۔ میک اپ کے نام پر وہ یہ دو چیزیں زیادہ استعمال کرتی تھی۔۔۔ کافی دیر تک وہ سوں سوں کرتی رہی۔۔۔ اس کا مسکارا پھیل گیا اور آنکھیں رگڑنے سے آنکھوں کے آس پاس اوپر نیچے سیاہی پھیل گئی۔۔۔ اس کے پاس ٹشو نہیں تھا۔ اپنے سفید دوپٹے سے وہ صاف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ انگلیوں سے جتنی آنکھیں صاف کر سکتی تھی اس نے کر لیں۔ پھر بھی چہرے پر کافی سیاہی پھیل چکی تھی اور وہ عجیب مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی پر اب اسے پتا ابھی نہیں تھی کہ وہ اچھی لگ بھی رہی ہے یا نہیں۔۔۔ سسکی بھر کر رونے کے بعد وہ اٹھی۔ ایک اسٹوڈنٹ ہیلپر اس کے پاس سے گزرا۔

"مجھے جاب چاہیے۔" آنکھوں کو رگڑتے اس نے کہا۔

"جاب۔۔۔ ہمیرے پاس جاب نہیں ہے۔"

"پاگل! مجھے جاب چاہیے۔ کیسے ملے گی۔۔۔؟"

اس نے اپنا غصہ اس پر اتارنا چاہا۔۔۔

"اوہ۔۔۔ مجھے تو ابھی خود ڈھونڈنی ہے۔" وہ کہہ کر چلا گیا۔

تین چار اور ایسے ہی نمونوں سے ملتی وہ ایک جگہ جا کر کھڑی ہو گئی اور آس پاس موجود دوسرے اسٹوڈنٹس کو دیکھنے لگی۔۔۔ وہ بہت تیزی سے آ رہے تھے جا رہے تھے۔۔۔ ہنس رہے تھے' باتیں کر رہے تھے قہقہے لگا رہے تھے۔۔۔ وہ سب بہت خوش اور پُرجوش تھے۔۔۔ ان سب کے چہرے دمک رہے تھے۔ وہ چالیس ہزار اسٹوڈنٹس میں بلکہ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی لڑکی ہو گی جو ایسے ایک طرف کھڑی مزید رونے کی تیاری کر رہی تھی۔۔۔ وہ اپنے سنہری وقت کو برباد کر رہی تھی۔۔۔ وہ چپ کھڑی سب کو دیکھتی رہی۔۔۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے بھی چلنا پھرنا چاہیے۔۔۔ اور ایک دم اسے یاد آیا کہ اسے اپنا اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ کارڈ صرف آج کے دن ہی بنے اور آج ہی نہ بنوانے پر اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔

وہ پُرجوش اسٹوڈنٹس کے ریلے میں شامل ہو گئی اور اوگلہ بگولہ بطخوں کی طرح منہ اٹھا کر چلتی رہی۔۔۔ گھومتی رہی۔۔۔ ایک سے دوسرے کیمپس جیسے وہ کسی تاریخی ڈاکومنٹ کا جائزہ لینے آئی ہو' پڑھنے نہیں۔۔۔

"آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں یقیناً" - عمرے جامنی یونیورسٹی کلر کی شرٹ پہنے اور Ask me (مجھ سے پوچھیں) کا بورڈ ہاتھ میں لیے وہ خود ہی اس کے قریب آیا تھا۔۔۔ وہ دو تین بار اس کے پاس سے گزری تھی بلکہ وہ کئی بار Ask me کے پاس سے گزری تھی۔

"مجھ سے پوچھیے میں آپ کی مدد کروں گا۔"

اوہ اچھا۔۔۔ Ask me کا بورڈ وہ اس لیے لیے گھوم رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ویب سائٹ کی پروموشن کر رہا ہے۔

"مجھے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔۔۔" یہ کہتے وہ اس کی بے جا لمبی ناک کو دیکھنے لگی۔

"ویل یہ تو بہت ہی آسان ہے۔۔۔ یہاں چلی جائیں۔" اس نے اس کے ہاتھ ایک نقشہ دیا۔ اس پر ایک جگہ سرخ دائرہ لگایا۔

"آپ کا دن اچھا رہے۔۔۔" وہ مسکرانے لگا۔۔۔ اس کی لمبی ناک پھیل سی گئی۔۔۔ وہ پھر سے اس کی ناک کو دیکھنے لگی۔

"کچھ اور پوچھنا ہے۔" وہ زچ ہوا۔ یقیناً" وہ جان گیا تھا کہ وہ مضحکہ خیز انداز سے اس کی ناک کو گھور رہی ہے۔

اب وہ ہاتھ میں پکڑے نقشے کو دیکھنے لگی اسکول کے کورس کی کتاب کے نقشے کے علاوہ یہ اس کے ہاتھ میں آنے والا پہلا نقشہ تھا جو کسی عمارت کا تھا۔۔۔ اور وہ عوے سے کہہ سکتی تھی۔ وہ اس نقشے کو استعمال کر کے بھٹک تو کئی بار سکتی تھی لیکن اصل مقام پر پچاسویں کوشش پر بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔۔۔ مزید کسی سے کوئی لیکچر نہ سننا پڑے۔ وہ آرام سے نقشہ لے کر بھٹکتی رہی۔۔۔ بھٹکتی رہی۔۔۔ اسے ایک ڈر اور بھی تھا کہ کہیں دائم 'نوال وغیرہ اس کے پیچھے نہ ہوں کہ دیکھیں ہیرا اپنے کام کر بھی پاتی ہے کہ نہیں۔۔۔

ادھر ادھر گھومتے تین چار بار آسک می نے اسے نوٹ کیا۔

"آپ جا کیوں نہیں رہیں۔۔۔؟" نقشہ دینے والا اس کے پاس آیا۔

"مجھے راستہ ہی نہیں مل رہا۔"

"میں نے نشان لگایا تو ہے۔۔۔ بورڈز پڑھتی جائیں اور چلتی جائیں۔"

"آپ مجھے چھوڑ آئیں۔"

"ہائیں۔۔۔" اس کی دونوں آنکھیں مکمل طور پر پھیل گئیں۔ امرحہ کا انداز ہی ایسا تھا کہ بھائی ذرا مجھے میری دوست کے گھر تک تو چھوڑ آ۔

اس بار اس نے باقاعدہ ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے سمجھایا۔۔۔ یہاں سے آئیں پھر سیدھا۔۔۔ پھر تھوڑا سا بائیں طرف۔۔۔

"میری نہیں سمجھ میں آ رہا۔۔۔ آپ مجھے چھوڑ آئیں۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر۔۔۔!" اس بار وہ بے چارہ ایسے حیران ہوا جیسے اس کا کوئی مردہ رشتے دار اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔

"کیسا ڈر۔۔۔؟ آج ہالووین نہیں ہے۔"

"مجھے ان سب سے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے آس پاس چلتے پھرتے ہر قوم و نسل کے لڑکا لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

امرحہ کی طرف چند سیکنڈ دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ایک قہقہہ لگانا ضروری سمجھا پھر واکی ٹاکی نکال کر بولنے لگا۔

"جارج۔۔۔ سنو ایک ہندوستانی لڑکی۔"

"پاکستانی۔۔۔" اس کی بھنویں تن گئیں۔

"جارج ایک پاکستانی۔۔۔ بلیو اینڈ وائٹ۔"

"ڈارک بلیو شرٹ اور وائٹ دوپٹا۔۔۔"

"ڈارک بلیو شرٹ اینڈ وائٹ دوپٹا۔۔۔"

"دوپٹا۔۔۔"

"دوپاٹا۔۔۔ میں آئے گی اسے پلیز آگے سے آگے ریفر کرتے جانا اور اسے اسٹوڈنٹ کارڈ کاؤنٹر تک پہنچا دینا۔"

"ریفر کیوں کرنا ہے۔۔۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے۔" بات کی آواز اس نے بھی سنی۔

"اسے ڈر لگ رہا ہے۔" لمبی ناک والے نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ۔۔۔ کیا مذاق ہے یہ۔۔۔"

"وہ سنجیدہ ہے۔۔۔ مکمل سنجیدہ۔۔۔ یا یونیورسٹی میں اعلان کروا دو کہ سب تھوڑی دیر کے لیے یونیورسٹی کو خالی کر دیں تاکہ وہ اسٹوڈنٹ کارڈ بنوا سکے۔۔۔ تم سن رہے ہو جارج۔۔۔"

جارج یقیناً سن رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اس کا بلند بانگ قہقہہ امرحہ نے سنا تھا۔۔۔ حد ہے کوئی اسے سمجھ کیوں نہیں رہا آخر۔۔۔

"اس طرف چلتی جائیں۔۔۔ اگلے آسک می کو اپروچ کریں۔"

اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔۔۔ وہ دائیں طرف چلی گئی اور ایک آسک می کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا کہ جو پوچھنا ہے وہ پوچھے۔۔۔

"میں مزید آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ یعنی یہ وہ جارج نہیں تھا جسے اسے اپروچ کرنا تھا۔

"مجھے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ یہ لیں یہاں چلی جائیں۔" اس نے بھی نقشے پر سرخ دائرہ لگا کر اسے دیا۔

"مجھے میپ نہیں چاہیے۔"

"تو۔۔۔ انتظامیہ نے ابھی تک ایئربس کا انتظام نہیں کیا یہاں۔"

اف کتنی تیز زبانیں تھیں ان سب کی۔۔۔

"مجھے وہاں تک چھوڑ آئیں۔"

"میں کیوں۔۔۔؟ آپ کو آسانی سے راستہ مل جائے گا۔۔۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں۔ میں آسک می ہوں "ڈراپ یو" نہیں۔"

"نہیں مل رہا نا راستہ۔۔۔"

"سب اپنے اپنے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ کو بھی مل جائے گا۔"

"سب تیز ہیں۔۔۔ چالاک ہیں۔۔۔ مکار ہیں۔۔۔ میں نہیں ہوں۔۔۔ میں ڈرپوک ہوں۔" اس نے روانی سے اردو میں کہا اور خاموش ہو گئی اور صرف کندھے اچکائے کہ بس نہیں مل رہا۔

"سب ذہین ہیں۔۔۔ ذمہ دار ہیں۔۔۔ بڑھے آتے ہیں اور خاص طور پر اپنی مدد آپ کے قائل ہیں۔" جواب اردو میں آیا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس انگریز کو دیکھا جس کی گہری بھوری آنکھیں تھیں اور سفید سرخی مائل رنگت تھی۔۔۔ اور بڑے بڑے کان تھے۔۔۔ کچھ زیادہ ہی بڑے۔ رکن تھے۔

اس کالو اکی ٹاکی بولا۔

"بلو شرٹ وائٹ ڈوپٹا۔۔۔ پاکستانی۔۔۔ نظر آنے تو پلیز آگے ریفر کریں۔"

"میں تھک گئی ہوں چلتے چلتے۔۔۔ مجھے بھوک بھی لگی ہے۔۔۔ مجھے کتنا اور آگے ریفر کریں گے۔"

"یہ آپ کا پہلا دن ہے؟"

"جی۔۔۔"

"آپ پہلے ہی دن تھک چکی ہیں۔۔۔ آسک می کا بورڈ پکڑے یہاں کھڑے یہ میرا تیسرا دن ہے۔۔۔ میں ابھی تک نہیں تھکا۔"

"آپ لڑکے ہیں۔۔۔"

"آپ جیسی لڑکیاں بھی نہیں تھکیں۔" اس نے دور کھڑی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو بورڈ لیے کھڑی تھی اور تیزی سے اسٹوڈنٹس کی رہنمائی کر رہی تھی۔

"آپ ہم سے کچھ بھی پوچھ کر ہم پر احسان نہیں کر رہیں بلکہ ہم کر رہے ہیں۔ آپ نہیں ہم تھکے ہیں۔۔۔ ہمیں اس کام کے پیسے نہیں مل رہے۔ ہم یہ بورڈ لے کر رضاکارانہ خدمات پیش کر رہے ہیں۔۔۔ آپ ایک باس کی طرح ہم پر حکم نہیں چلا سکتیں۔۔۔ تھک گئی ہیں تو سینما جا کر بیٹھ کر ٹام اینڈ جیری دیکھیں۔ آپ کی تھکن اتر جائے گی۔"

"آپ کو بات کرنے کی تمیز سیکھنی چاہیے۔"

"آپ کو تھکن اتارنے کی مشق کرنی چاہیے۔"

"میں بہت بہادر ہوں۔" اس نے جتا کر کہا۔

"بیسٹ آف لک۔" اس نے کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا کہ اب جاؤ۔

وہ دوسری طرف جا کر ایک لڑکی سے پوچھنے لگی اور آخر کار پوچھتے پاچھتے اسٹوڈنٹ کاؤنٹر تک آ گئی۔۔۔ اور اپنے کاغذات دینے کے بعد تصویر کے لیے ڈیجیٹل کیمرے کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا کچھ گم ہو گیا ہے؟" کاؤنٹر سر نے کاؤنٹر سے اپنا آدھا گنجا سر آگے کر کے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔"

"تو مسکراؤ بھئی۔۔۔ تم مانچسٹر میں ہو۔"

"مانچسٹر میں مسکرانا پڑتا ہے۔۔۔؟"

"بالکل۔۔۔ کیونکہ مانچسٹر مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔۔۔ یہاں اداسی کا کیا کام۔۔۔ یہ تو دنیا بھر کے Swans (راج ہنس) کی جگہ ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"بلیک سوان۔" اسے بربڑاہٹ سنائی دی اور اس کی تصویر کھینچ دی گئی۔

"یہ نہیں۔۔۔ ایک اور پلیز۔" اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔"

اس بار وہ مسکرائی اور وائٹ سوان بن گئی۔۔۔ کیونکہ وہ دل سے مسکرائی وہ مسکراہٹ جو اس نے یہاں آ کر سیکھی تھی۔

کیونکہ اسے رونے کی عادت تھی۔۔۔ اسے یہی

عادت ڈالی گئی تھی۔ بات بات پر رونے کی۔۔۔ اسے بات بات پر رلانا سب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔۔۔ اور وہ دل چھوٹا کر بیٹھتی تھی کیونکہ اسے دل بڑا کرنا سکھلایا ہی نہیں گیا تھا یہی اس کا ماحول تھا جو اسے ملا تھا۔۔۔ اسی ماحول کی وہ عادی تھی اسے نہیں بتایا گیا تھا کہ جس زمین پر رینگا جاتا ہے اس پر شان سے چلا بھی جا سکتا ہے اور دوڑا بھی۔۔۔ وہ ایسی ہی رینگتی' روتی دھوتی زندگی گزارتی رہتی اگر وہ یہاں نہ آتی۔۔۔ کیونکہ اسے کبھی نہیں کہا گیا تھا "یو آر اے بیوٹی فل برڈ۔۔۔ فلائی جسٹ فلائی۔" (میری پیاری تم ایک پرندہ ہو۔۔۔ تو تم اڑو۔۔۔ بس اڑو)

اسے تو کہا گیا تھا کہ تو منحوس ہے۔۔۔ بدبخت ہے۔۔۔ کالی نظر اور کالی زبان والی ہے۔۔۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے پھاٹک سے اندر آتے ہی کچھ اور سکھایا جا رہا تھا۔

"مسکراؤ کہ رونے کے لیے زندگی میں کوئی دن نہیں ہوتا۔۔۔"

"اڑو کہ اڑنے کا حق صرف پر والوں کے پاس ہی نہیں۔"

"اور ایسے کھل کر مہکو تم سے بہتر گلستان میں کوئی کلی نہیں۔"

"تم سب کر سکتی ہو۔۔۔ تمہارے پاس سب ہے۔ تمہارے ہاتھ میں [illegible] سب۔۔۔ ناکامی اور مایوسی کی فضا میں ہمیشہ سانس بھرنا تم پر فرض نہیں۔"

کارڈ لے کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے کاؤنٹر سر کا شکریہ ادا کیا بس اتنی ہی سی تو بات تھی۔۔۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس درس گاہ کو دنیا کی بڑی درس گاہوں میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ اس درس گاہ نے اسے پہلے دن ہی رینگنے سے چلنا سکھا دیا تھا۔۔۔ ذمہ داری۔۔۔ خود اعتمادی۔۔۔ آگے بڑھ کر کر لینے کی صلاحیت عطا کر دی تھی۔

ہاتھ میں کارڈ لے کر وہ اپنی مسکارا پھیلی سیاہی سے لتھڑی آنکھوں کو دیکھنے لگی اور ہنس پڑی۔۔۔ وہ پرجوش تھی۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا اگر وہ بدصورت بھی لگ رہی تھی تو۔۔۔ یہاں دماغ والوں کو سلیوٹ کیا جاتا تھا۔ خوب صورت چہروں کو نہیں۔۔۔ اور دماغ کو کام پر لگانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔۔۔ سب آسان تھا۔۔۔ سب۔۔۔ کچھ بھی دور نہیں تھا۔ سب پاس تھا دونوں ہاتھوں کی دونوں مٹھیوں میں تھا۔۔۔ ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر وہ باہر آ گئی۔۔۔ دن روشن تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے بال نرمی سے لہرانے لگے۔ اس نے اپنے بیگ کا اسٹریپ لمبا کیا اور اسے دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح کراس کر کے پہن لیا (دائیں سے بائیں طرف) اور اعتماد کے ساتھ چلنے لگی۔

"امرحہ واجد" گولڈ میڈل لینے کے لیے دوڑ میں پوری طرح [illegible] شامل ہو چکی تھی۔۔۔ تنہائیوں کی خاطر [illegible] سسکیوں پر [illegible] کسی صورت نہیں بیٹھنا تھا۔۔۔ اس [illegible] اب وہاں بھی نہیں ہو گی۔

✿ ✿ ✿

آکسفورڈ روڈ پر وہ سیدھی چلتی جا رہی تھی۔ صبح اس نے وہ منا سا ناشتا کیا تھا اور اب اسے بھوک لگی تھی لیکن وہ کھانا کھانے نہیں جا رہی تھی نوکری کی تلاش کے لیے جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے اندر کی طرح باہر بھی اسٹوڈنٹس کی بہت رونق لگی تھی۔ کچھ دور ذرا آگے سڑک کے اس پار اسے چرچ نظر آیا۔ اس کا دل چاہا کہ اندر جا کر دیکھے چرچ کو پھر وہ اپنی ہی سائیڈ پر چلتی رہی اب دو سال یہیں رہنا تھا تو وہ سب دیکھ لے گی۔۔۔ اگر نوکری کا انتظام نہ ہوا تو ایک ماہ بعد ہی واپس جانا پڑے گا۔۔۔ سڑک ختم ہو گئی لیکن اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں وہ نوکری کی بات کر سکتی۔۔۔ سڑک کے سامنے دوسری طرف اسے عبدالہادی حلال فوڈ کی دکان نظر آئی۔۔۔ سڑک پار کر کے وہ اس دکان میں آئی۔ بلاشبہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بھلے سے کانپتی رہتیں اس نے اندر جا کر کاؤنٹر بوائے سے بات کی۔ اس نے سلیقے سے اسے بتایا کہ فی الحال وہاں اسے نوکری نہیں دی جا سکتی۔

"کیا کچھ دن بعد دی جا سکتی ہے۔۔۔ دو ہفتوں بعد۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ شاید ایک سال بعد جب میں یہاں سے چھوڑوں گا۔"

وہ اگلے اسٹور "بیک اینڈ کلک" میں گئی۔ وہ کمپیوٹر اسٹور تھا اور وہ کمپیوٹر ہینڈلنگ کے بارے میں یقیناً نہیں جانتی تھی اور ظاہر ہے اسے نوکری نہیں دی گئی' جبکہ اسی اسٹور پر دوسری لڑکیاں کمپیوٹر ریپرنگ کا کام کر رہی تھیں۔

ان ہی اسٹورز اور دکانوں کے عین سامنے سڑک پار کرکے مشہور برگر اور۔۔۔ بڑے چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ کھلے تھے وہ وہاں بھی گئی اور زیادہ خود اعتمادی سے گئی۔۔۔ اب اس کے صرف دل کی دھڑکن تیز تھی۔۔۔ لیکن شام تک نہ اس کے دل کی دھڑکن تیز رہی نا ٹانگوں میں کپکپاہٹ' صرف زبان میں تیزی رہی جو ہر ریسٹورنٹ' دکان' اسٹور میں جاتے ہی تیزی سے چلنے لگتی۔۔۔ وہ تھک گئی تھی لیکن رکی نہیں۔۔۔ اسے بھوک لگی تھی لیکن پیسے بچانے کے لیے اس نے پیزا ہر سے کچھ بھی لے کر نہیں کھایا۔۔۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اس نے یہ کام کیا کہ اس نے سائیکل چلانے والی ایک لڑکی سے لفٹ مانگی اس نے کاغذ پر لکھے ہوئے پتے کو لڑکی کے آگے کیا۔

"میں تمہیں ٹینڈ ووڈ تک لے جاسکتی ہوں۔۔۔ آگے تمہیں پیدل ہی جانا ہے۔" اس نے کہا۔

اب سائیکل پر بیٹھنا اسے قطعاً" ہنسی نہیں آرہی تھی۔۔۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی وجہ سے بل پڑ رہے تھے لیکن اسے رونا نہیں آرہا تھا وہ اداس یا غم زدہ بھی نہیں تھی۔ وہ خود کو بے چاری بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔

صبح ان ہی کھلی روشن' قدیم عمارات سے گھری سڑکوں سے آتے ہوئے بھی وہ امرحہ واجد ہی تھی اور ان ہی سڑکوں سے پھر سے گزرتے ہوئے بھی وہ امرحہ واجد ہی رہی۔۔۔

تبدیلی ظاہر میں نہیں باطن میں آئی تھی۔۔۔ اور کلفی سے زیادہ آچکی تھی۔۔۔ کلفی سے زیادہ آنے والی تھی۔

گھر آئی تو اس کا لنچ کاؤنٹر پر رکھا تھا اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب اپنے اپنے کام پر جاچکی تھیں۔ اس نے لنچ کو رات کے کھانے کے طور پر کھالیا اور منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو کر سوگئی۔ دو گھنٹے بعد وہ اٹھی تو کتابیں پڑھنے لگی۔ رات کو وہ ایک ایک کرکے آتی گئیں اور سوتی گئیں لیکن وہ جاگ کر پڑھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح شرلی کے ساتھ اس نے جاب کی بات کی کہ اسے کہاں جانا چاہیے اور کہاں نہیں۔ شرلی نے اسے دو تین جگہوں کے نام بتائے اور پتے بھی سمجھادیے۔

پہلے وہ یونیورسٹی آئی تاکہ اپنی کلاسز کا معلوم کرسکے۔ اس کے لیے یونیورسٹی ایریا میں الگ سے بہت بڑا کیمپ لگایا گیا تھا جہاں ہر ڈیپارٹمنٹ کا کاؤنٹر لگا تھا اور ہیلپر اسٹوڈنٹس ان کاؤنٹرز پر اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر انجام دے رہے تھے سب کے سب پرپل یونیفارم میں ملبوس تھے تاکہ انہیں دور سے ہی پہچان لیا جائے۔۔۔ اس ایریا میں بھی ایسے ہی رش تھا جیسے وہاں ایک منڈے اتوار بازار سجا ہو۔۔۔ آہستگی سے لیکن جلدی جلدی بولنے کی آوازیں تھیں اور ایک ساتھ ایک جگہ جمع ہو کر شور بن گئی تھیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مطلوبہ کاؤنٹر تک آئی اور بنیادی معلومات لینے لگی۔ لیکن ایک مسئلہ تھا جو لڑکی اسے سب سمجھا رہی تھی وہ فرنچ تھی اور اس کی انگلش اچھی ہو کر بھی امرحہ کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔۔۔ اس نے لڑکی سے ایک دوبار کہا کہ۔

"برائے مہربانی پھر سے بتائیں اور آہستہ بتائیں۔ میں کچھ نہیں پارہی۔" اور لڑکی نے ایسا کیا بھی لیکن امرحہ پھر بھی کچھ خاص سمجھ نہ سکی۔

"ڈیرک! اسٹو تم ان کی مدد کرو۔" لڑکی نے خوش اخلاقی سے اپنے ساتھی سے کہا جو ان دونوں کی طرف سے رخ موڑے کسی دوسرے کا مسئلہ حل کررہا تھا۔

"جی۔۔۔" ڈیرک نے اس کی طرف دیکھا اور اس

کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

یہ وہی Ask me کا بورڈ پکڑے لمبی ناک والا تھا۔ اس سے پہلے کہ امرحہ کچھ بولتی۔ اس نے اپنی ناک کو ایک ہاتھ سے چھپا لیا۔۔۔

امرحہ کا دل چاہا واقعی اس کی ناک پر اپنے ہاتھ میں پکڑی موٹی فائل دے مارے۔۔۔ یہ انسان یقیناً" اس کا کوئی مشہور زمانہ مذاق بنا دے گا جو ساری یونیورسٹی میں مشہور ہو جائے گا۔

"فرمائیے۔ میں آپ کو کیسے ڈرا سکتا۔۔۔ آئی ایم سوری آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

ناک بدستور اس نے بائیں ہاتھ سے چھپا رکھی تھی۔ امرحہ نے کاغذ اس کی طرف بڑھایا جس پر اس کے مضمون لکھے تھے اور اس نے پڑھ کر دوسرے کاغذ پر کم سے کم پندرہ منٹ لگا کر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ سب کچھ لکھ دیا۔۔۔ کلاس کے اوقات کار۔ ٹیچرز کے نام۔۔۔ مزید مدد کے لیے اسی کی جماعت کے دو تین ہم جماعتوں کے نام۔۔۔ ان کی رہائش کے پتے۔ پھر اس نے نقشہ نکالا اور اس پر سرخ دائرہ لگایا۔ "یہ آپ کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔"

"اسے اس کا ڈیپارٹمنٹ دکھا آؤ۔" اس نے فرنچ لڑکی سے کہا۔

لڑکی نے اچنبھے سے اسے پھر ڈیرک کو دیکھا اور امرحہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"کیوں۔۔۔ یہ خود چلی جائے گی نا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ یہ خود نہیں جاتی۔۔۔ اسے ڈر لگتا ہے۔"

امرحہ نے ڈیرک کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ لیا۔۔۔ ڈیرک کے قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔۔۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ پہلے دن جو جو لوگ اسے ملے ہیں ان سے دوبارہ اس کی ملاقات نہ ہو۔۔۔ ایک لڑکی اس کے پاس سے گزری اور ایک دم سے رک گئی۔

"کوئی مدد چاہیے؟" ساتھ ہی اس نے امرحہ کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ لے لیا۔

"یہاں جانا ہے نا۔۔۔ میں ابھی یہیں سے آ رہی ہوں۔۔۔ بلکہ پھر سے وہیں جا رہی ہوں۔۔۔ آجاؤ میرے ساتھ۔" وہ خواری سے بچ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ اسے ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ گئی۔۔۔ اس نے اپنی کلاسز دیکھ لیں اور اوقات کار بھی۔۔۔ اپنی کلاسز دیکھ کر اسے خاصی خوشی ہوئی۔ سو وہ اس کی سوچ سے زیادہ خوب صورت تھیں۔

یونیورسٹی سے نکل کر وہ پیدل ہی پھر سے نوکری کی تلاش میں لگ گئی۔۔۔ لیکن یہ کام تو مشکل ہی بنتا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی سے بہت زیادہ دور وہ نوکری کر نہیں سکتی تھی۔ اس طرح اس کا بس کا کرایہ لگتا اور اس کی بچت مشکل سے ہی ہو پاتی۔

اس کی کلاسز شروع ہو گئیں۔۔۔ لیکن کام نہیں ملا۔ اسے پریشانی یہ تھی کہ اگر وہ کام نہ ڈھونڈ سکی تو پھر سے ولائم کو کچھ سننا پڑے گا کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا لیکن ایم بی اے کے علاوہ بھی نہیں تھی۔ سو وہ انتھک کوشش کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک دن یونیورسٹی سے پندرہ منٹ کی واک پر واقع کیفے کے سامنے سے اس کا گزر ہوا۔ وہ یہاں پہلے بھی آ چکی تھی لیکن اسے جواب دیا گیا تھا کہ انہیں ضرورت نہیں ہے۔ اب ضرورت ہے کا بورڈ کیفے کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے پہلے کیفے میں بیٹھ کر کافی پی پھر کاؤنٹر تک آئی۔۔۔ اسے یہاں کام تو فوراً" ہی مل سکتا تھا لیکن صرف ایک مسئلہ تھا اور کافی بڑا مسئلہ تھا جو ویٹریس اسے نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے گھٹنوں تک اسکرٹ پہن رکھا تھا جو ایک مشہور کافی کے لیبل جیسا تھا یعنی کمپنی کا چلتا پھرتا اشتہار تھیں۔۔۔ اسے اشتہار سے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ یہ اسکرٹ تو نہیں پہن سکتی تھی اور جو حالات جا رہے تھے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اس واحد نظر میں آنے والے "ضرورت ہے" کے موقعے کو۔ ہاتھ سے جانے بھی نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے دراز قد قریبی مائل گورے چٹے انگریز سے بات کی۔۔۔ اس نے امرحہ

سے چند سوالات پوچھے اور اسے ہاں کہہ دیا۔۔۔ وہ خوش ہونے کے بجائے اسے دکھ سے دیکھنے لگی یعنی نوکری ملی بھی تو کون سی۔ جس پر شاید ابھی انکار ہو جائے جب وہ اس کی اگلی بات سنے گا۔

"مجھے اس کام کی بہت شدید ضرورت ہے۔۔۔ اگر مجھے یہ نوکری نہ ملی تو میرا مستقبل بہت بری طرح سے تاریک ہو جائے گا۔" اس نے اپنی طرف انگریز کو جذباتی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے تمہیں کام پر رکھ لیا ہے۔"

"میں یہ ڈریس نہیں پہن سکتی۔۔۔ میں جینز پر یہ شرٹ پہن لوں گی بس۔" اس نے ویٹرلیس کی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں اتنا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ تم جاسکتی ہو۔"

"اس دنیا کے روشن مستقبل کے لیے کیا آپ صرف اس نامکمل ڈریس کو نظر انداز کرکے تعلیم حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتی اس لڑکی پر ایک احسان نہیں کرسکتے۔۔۔ دنیا کا ہر انسان علم حاصل کرنے والے کی عزت کرتا ہے۔"

"مجھے صرف اپنے روشن مستقبل کی فکر ہے۔"

"آپ کس مذہب کے ماننے والے ہیں؟"

اس نے اسے گھورا۔۔۔ یورپ میں کبھی بھی کسی سے بھی اتنی جلدی اس کے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے۔۔۔ وہ برا مان جاتے ہیں۔

"میں یہودی ہوں۔" امرحہ کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

"مجھے گھورنا بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔۔۔"

"دیکھیے جناب اگر آپ مجھے کام دیں گے تو سب آپ کی تعریف کریں گے ایک یہودی نے ایک مسلم کا احترام کیا۔۔۔ اس کی اخلاقیات کا خیال رکھا۔۔۔ یونو وغیرہ وغیرہ۔"

"یہ وغیرہ وغیرہ کیا ہے؟"

"مزید تعریف۔۔۔ اور تعریف۔۔۔ سب آپ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

"لیکن مجھے اپنی کرسی پر بیٹھنا ہی اچھا لگتا ہے۔"

"پھر بھی ذرا سوچیے۔۔۔ یہ یونیورسٹی ایریا ہے۔۔۔ اسٹوڈنٹس آپ کی کس قدر عزت کریں گے۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ سالانہ کانووکیشن ڈے پر آپ کو خاص طور سے مدعو کیا جائے گا اور آپ تقریر بھی کریں گے۔۔۔ ایسا دن آپ کی زندگی میں دوبارہ نہیں آسکتا۔"

"مجھے کانووکیشن میں جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"جب آپ جائیں گے تب آپ کو یہ بہت دلچسپ لگے گا۔"

وہ کاؤنٹر پر بائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں بجانے لگا اور اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔۔۔ اس کی نیلی آنکھیں مزید نیلی ہو گئیں۔

"میں نے سنا تھا انگریز بہت رحم دل ہوتے ہیں۔"

"میں پولش ہوں۔"

"مجھے اندازہ تھا لیکن پولش تو دنیا بھر میں انسان دوست مشہور ہیں۔ اخلاقیات کی پاس داری کرنے والے۔۔۔ انسانی خدمت میں سب سے پہلے آنے والے۔۔۔ اور مدد کے لیے کبھی نہ پیچھے ہٹنے والے۔۔۔"

"تمہاری زبان ہمیشہ ایسے ہی چلتی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن جو کلاس میں نے ابھی آپ کے یہاں سے لی ہے اس کے بعد سے کافی زیادہ۔۔۔ آپ مجھے ایک ہفتے کے ٹرائل پر رکھ سکتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"میں شرط لگا سکتی ہوں جب لوگ مجھے ایک مسلم لیڈی کو فل ڈریس میں دیکھیں گے تو وہ اس طرف کھنچے چلے آئیں گے کہ یہ ایک انسان دوست کا کیفے ہے۔۔۔ یہاں کے مالک نے انسانیت کے لیے نام نہاد اصول کو توڑ دیا۔"

"کیا واقعی۔۔۔؟" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کاؤنٹر بجانے لگا۔

"بالکل۔۔۔ آزما کر دیکھ لیں۔" یہ کہتے امرحہ کی نظر اتاری جانی چاہیے تھی۔

"ٹھیک ہے کل سے آجانا۔۔۔ تمہیں اصل کا لفظی پرسنٹ ملے گا۔"

"مجھے منظور ہے۔۔۔ ویسے آپ کو یہ اندازہ ہوگا ہی کہ روزانہ اس کیفے میں کتنے لوگ آتے ہیں۔۔۔" امرحہ کی ذہانت بڑھتی جارہی تھی۔

"میں دس سال سے یہ کیفے چلا رہا ہوں' سال میں صرف ایک بار آنے والوں کو بھی پہچان لیتا ہوں۔۔۔"

"میرا مطلب تھا کہ اگر کل زیادہ لوگ آئے تو۔۔۔"

"تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" وہ آنکھوں کو اندر کی طرف لے جاکر مسکرایا۔۔۔ اور یہ مسکراہٹ اس پر جم کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر گئی تو اس نے شرلی' عذرا وغیرہ سب سے کہہ دیا کہ کل ہر صورت وہ خود اور اپنے دوستوں کو لے کر اس کے کیفے آجائیں۔۔۔ ان چاروں نے آنے کا وعدہ کرلیا سوائے بتانے کے۔۔۔ اور انہوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ کوشش کرکے اپنے ایک یا دو دوستوں کو بھی ساتھ لے کر آئیں گی۔۔۔ صبح وہ دائم اور ویرا کے پاس بھی گئی۔۔۔ انہیں سب سچ سچ بتادیا۔۔۔ دائم کتنی ہی دیر بے یقینی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

"تم نے کس چالاکی سے یہ سب کیا ہے۔۔۔ ہے نا۔۔۔"

"کرنا پڑا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"میں اپنے ہم جماعتوں اور دوستوں کو بھی کہہ دیتا ہوں۔۔۔ کتنے دن کا ٹرائل ہے۔"

"ایک ہفتے کا۔۔۔ اگر روز آٹھ دس لوگ آئیں تو۔"

"آٹھ دس تو کم ہیں۔۔۔ آخری دن تک میں تمہیں چالیس کرواؤں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

اور پھر یوں پہلے دن دس۔۔۔ دوسرے دن پندرہ پھر اٹھارہ' بیس۔۔۔ چھبیس اور آخری دن پورے تین کم پچاس اسٹوڈنٹس وہاں کافی پینے گئے اور مزے کی بات یہ کہ انہوں نے اپنی پرفارمنس کی حد ہی کردی۔۔۔ وہ کافی پیتے جاتے' کاؤنٹر تک آتے جاتے۔

"کتنے نوبل انسان ہیں آپ۔" مسکرا کر کہا جاتا۔

"آپ نے ایک مسلم خاتون کو بغیر کسی امتیاز کے نوکری دی۔"

"آپ جیسے انسان دوست لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔"

"ہم سب ضرور اپنے پروفیسرز سے آپ کی تعریف کریں گے' آپ کو ہمارے کانووکیشن ڈے میں ضرور آنا چاہیے۔"

"بہت فرشتہ صفت ہیں آپ۔۔۔ ایسی صفات آج کل ناپید ہیں۔"

"اب ہم روزانہ صرف یہاں ہی آیا کریں گے کافی پینے۔"

پورا دن ہر پرفارمنس کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتا رہا' مسکراتا رہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ڈرامے دیکھے لیکن ان چھ دنوں میں جو یونیورسٹی والوں نے میرے کیفے میں ڈرامہ سیشن کیا' وہ سب سے شاندار رہا۔"

وہ ونگ کھڑی کاؤنٹر پر ہاتھ رکھے اسے ہنستے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کا تو خیال تھا اس کا پلان کامیاب رہا لیکن یہ کیا۔

"تم ایک کاروباری انسان کو الو نہیں بنا سکتیں۔۔۔ رائٹ۔"

"رائٹ۔" اس نے کمزور سا رائٹ کہا۔

"ہاں۔۔۔ تم ایک کاروباری انسان کو متاثر ضرور کر سکتی ہو۔۔۔ رائٹ۔۔۔"

"رائٹ۔" وہ مسکرانے لگی۔

"دیکھو مس اخروٹ۔۔۔ میں تمہیں یہاں ایسے نہیں رکھ سکتا۔"

وہ ایک دم سے سنجیدہ ہوگیا اور امرحہ بھی۔۔۔ اس کی خوشی اڑن چھو ہوگئی۔

"کافی کمپنی اس ڈریس کے لیے مجھے پے کرتی ہے۔۔۔ اور اس کیفے کے پچاس فیصد مالکانہ حقوق کمپنی کے

پاس ہی ہیں۔۔۔ لیکن کیونکہ میری دلچسپی بڑھ گئی ہے کہ میں یونیورسٹی کے کانووکیشن میں بلایا جاؤں تو میں تمہیں عارضی طور پر یہاں رکھ سکتا ہوں۔۔۔ جب تک تمہیں کہیں اور نوکری نہیں مل جاتی تم یہاں کام کر سکتی ہو لیکن اگر کمپنی نے اعتراض کیا تو مجھے تمہیں فوراً ”نکالنا ہوگا۔“

”کمپنی اعتراض نہیں کرے گی۔“ وہ خوشی سے نہال ہو کر بولی۔

”کیوں؟ تمہیں کیسے پتا۔۔۔؟“

”میں دعا کروں گی کہ کمپنی اعتراض نہ کرے۔“

”تم یہ دعا کیوں نہیں کرتیں کہ تمہیں کہیں اچھا سا کام مل جائے۔“

”وہ بھی کر رہی ہوں ساتھ ساتھ۔۔۔ لیکن فی الحال مجھ پر یہی دعا واجب ہے۔۔۔ کہ کمپنی اعتراض نہ کرے۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے مسکرا رہا تھا۔

”اور مجھے اخروٹ مت کہئے۔۔۔ آپ مجھے چلغوزہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ چلغوزے مجھے بہت پسند ہے۔“

وہ خوشی سے بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔۔۔ مسکرا رہی تھی۔ باہر مانچسٹر کی سڑکوں پر اترنے والی رات۔۔۔ اس رات بہت روشن تھی۔۔۔ جب سیاہی سفید ہو جائے۔۔۔ راتیں روشن ہو جائیں تو زندگی کی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ خوشبو رچتی ہے۔۔۔ پھولوں، پھلوں سے لدی ہوتی ۔

☼ ☼ ☼

وہ کام سے بھی لگ گئی اور کلاسز میں بھی مصروف ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے بھی نوڈلز کھانے شروع کر دیے۔ اپنی پہلی تنخواہ سے اس نے سب سے پہلے اپنا پسند کے نوڈلز کا بڑا پیکٹ لیا جو وہ ہفتے تک کھا سکتی تھی۔ ساتھ ہی انڈے، دودھ کے ڈبے، جام، ڈبل روٹی لے کر اس نے فریج کو بھرا تاکہ وہ سب بھی استعمال کریں۔۔۔ اب اسے رہائش کی تلاش تھی۔۔۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا رہائش کا مسئلہ بھی حل کر رہی تھی۔ گو شرلی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اتنی پریشان نہ ہو رہائش کے لیے لیکن وہ پریشان تھی اگر اسے انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ڈھیٹ بن کر مستقل ہی وہاں جم جاتی اور بہانے بناتی کہ اسے رہائش نہیں مل رہی۔

چونکہ اسے شروع سے ہی بہت زیادہ کھانے کی عادت تھی تو ابھی وہ مکمل طور پر اپنی بھوک پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ چنے منے سے ناشتے سے تو اس کا کچھ بنتا ہی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تو وہ شام کی چائے میں اڑا جایا کرتی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے وقت یونیورسٹی میں اسے کسی نہ کسی کی ٹوئیٹ مل جاتی۔ ٹوئیٹ۔۔۔؟! (Twit)

ٹوئیٹ کا قصہ کچھ یوں تھا کہ کسی بھی فرینڈ یا ہائے ہیلو فرینڈ یا کلاس فیلو کے پاس چلا جاتا اور اس سے کہا جاتا۔

”ٹوئیٹ می پلیز۔“ (مجھے ٹوئیٹ کرو) اگر وہ چاہتا یا افورڈ کر سکتا تو اسے ٹوئیٹ کر دیتا یعنی ایک کپ چائے، کافی یا کوئی بھی کولڈ ڈرنک پلا دی جاتی۔۔۔ وائم گروپ نے اسے اپنی ساری ٹوئیٹس دے دی تھیں۔۔۔ ٹوئیٹ مانگنے والے کو وہ ٹوئیٹ واپس بھی کرنا ہوتی تھیں۔

اب منظر کچھ یوں ہوتا کہ وائم یا نوال اس سے کہتے کہ جو سامنے حماد بیٹھا ہے۔ اس کے پاس میری چھ ٹوئیٹس ہیں۔ اس کے پاس جاؤ اور کہو۔

”ٹوئیٹ می بیک پلیز۔“

وہ جاتی اور کہہ دیتی۔۔۔ اسی طرح اسے شرلی، عذرا اور ایسے ہی دوسرے ہائے ہیلو دوست اپنی ٹوئیٹس دے دیتے۔۔۔ اکثر جن کی تین یا چار ٹوئیٹس اکٹھی ہو چکی ہوتیں ان کا وہ برگر کھا لیتی، چکن برگر، یا سینڈوچ یا پزا کھائے جانے پر ایک ایکسٹرا ٹوئیٹ منفی ہو جاتی۔ یعنی اگر چار ٹوئیٹس ہیں تو تین کا برگر اور ایک منفی۔ یعنی باقی زیرو۔۔۔ اور اگر تین ہی تھیں تو ایک جمع ہو جاتی۔ یعنی برگر کھانے والے کے کھاتے میں ایک ٹوئیٹ آ جاتی۔

پہلی بار تو امرحہ کو کافی سے زیادہ شرم تنگ آئی پھر اس نے محسوس کیا کہ امیر کبیر اسٹوڈنس بھی ایسا کر لیتے ہیں تو وہ بھی کرنے لگی۔ وہ وائم، نوال، شرلی کے پاس

جاتی "ریفری آنوئیٹ پلیز۔" کتنی وہ سوچتے۔ ادھر ادھر دیکھتے۔

"وہ سامنے... ہاں وہاں گراؤنڈ میں... وہ جس نے سفید شرٹ پہنی ہے۔ ہاں وہی اس کے پاس جاؤ۔"

کاغذ پر لکھ دیا جاتا "ٹوئیٹ ہر بیک" (اسے ٹوئیٹ واپس کردو) اسی کاغذ پر ٹوئیٹ دینے والا لکھ دیتا "بقایا وہ ویلی کی وہ بھی ہڑپ کر جاتی۔ اسے بڑا مزا آ رہا تھا۔ اسے ٹوئیٹ پر ٹوئیٹ مل رہی تھیں... اس نے اوا کو سب بتایا۔

"مانگنے کے نت نئے انداز۔" وہ ہنسنے لگے۔

"دینے کے نت نئے انداز دلوا۔"

"کیا کمال کا جواب دیا ہے تم نے۔" وہ بہت خوش ہوئے اس دن وہ دائم گروپ کی ایک لڑکی اقصیٰ کے پاس گئی اور ٹوئیٹ ریفر کرنے کے لیے کہا۔

"یہ تمہیں لائبریری میں ملے گا ورنہ کہیں نہیں ملے گا اس وقت... بڑے بڑے کان ہیں... لائبریری میں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ تمہیں اس کا پتا دے دیں گے... پوری بیس ٹوئیٹس ہیں میری اس کے پاس۔"

"نہیں..." امرحہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آرام سے چار پانچ برگر کھائے جا سکتے ہیں۔ ہفتہ بھی... دو ہفتے آرام سے نکل جائیں گے۔

یعنی اگلے دو ہفتوں کے لیے بالکل خوار نہیں ہونا پڑے گا... وہ لائبریری میں گئی اور سرگوشی کے انداز سے اس کا پوچھا۔

"میں سمجھ نہیں پائی... کون سی کتاب چاہیے۔"

"اف... کتاب نہیں چاہیے... عالیان کا پوچھ رہی ہوں۔ جس کے بڑے بڑے کان ہیں۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ لائبریرین کے چہرے پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی اور اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ وہ اس کے پاس گئی اور کاغذ جس پر اقصیٰ کی لکھائی میں ٹوئیٹ کا لکھا تھا اس کے آگے کیا۔

اس نے اپنی موٹی سی کتاب سے نظر اٹھا کر اس چٹ کو پڑھا پھر جس ہاتھ نے اس چٹ کو تھام رکھا تھا، اسے خفگی سے گھورا... اس کی پیشانی پر ایک پتلی سی لکیر بن کر غائب ہو گئی۔

"سوری اس وقت نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"پھر کس وقت؟"

"بس آج نہیں... ان فیکٹ اگلے ہفتے تک نہیں... برائے مہربانی اس سے پہلے مجھے تنگ نہ کیا جائے۔"

"پر مجھے تو ابھی اسی وقت بھوک لگی ہے۔" اس کی تیز آواز پر وہ بھوری آنکھوں والا حیران رہ گیا۔ پیشانی پر خفگی سے اس بار دو لکیریں بن کر ابھریں اور وہیں براجمان ہو گئیں۔

"ٹوئیٹ ہی بیک۔" امرحہ نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ... اور تیز آواز میں کہا۔ یہ وہی تھا جو اس دن ویلکم ہونے کے دوران اس پر چلا رہا تھا۔ اب وہ اس پر چلا سکتی تھی۔

"میں نہیں کر رہا۔" اس نے ذرا سختی سے کہا۔

"میں کیا کروں... مجھے تو بھوک لگی ہے۔" اس نے اس طرف آتے ہوئے ایک اور کام کیا تھا۔ اس نے کاغذ پر خود ہی سینڈوچ لکھ دیا تھا۔

اس کی تیز بھوری آنکھیں ایک لحظے کے لیے سیاہی مائل سی ہو گئیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا۔ 90ء کے ہیروز کی طرح اس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے گھورا اور پھر وہ ٹونٹی ز کے ہیرو کی طرح اسے مکمل نظرانداز کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا نا اگلے ہفتے سے پہلے میرے پاس نہ آنا۔" وہ لائبریری بلڈنگ سے باہر نکلا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بھی اس کے ساتھ نکلی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کھینچا اور تیزی سے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے لپکی کہ وہ کینٹین جا رہا ہے۔ لیکن... وہ تو... وہ تو...

"یہ کیا ہے اقصیٰ؟" اس نے دو انگلیوں میں اٹکایا کاغذ اقصیٰ کے آگے کیا۔ "کس بھوکی کو میرے پیچھے لگا

دیا ہے۔"

"یہ کیا۔؟" امرحہ نے اس امریکی نقوش کے حامل۔ فریج غصے کو بھسم کر دیکھا۔ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔ اتنے دھڑلے سے۔ امرحہ نے آس پاس دیکھا۔ اُف۔ یونیورسٹی کے سارے اسٹوڈنٹس انگوٹھے لہرا لہرا کر شرم کرو۔ شرم کرو۔ کہہ رہے تھے۔ پہلے تو امرحہ نے آنکھیں میچ لیں۔ پھر اس نے غصے سے بھڑک کر اسے دیکھا۔ اقصیٰ نے پڑھا کاغذ پر سینڈوچ لکھا تھا۔

"ٹوئیٹ می بیک پلیز۔" اقصیٰ نے اس کی عزت رکھ لی۔

"اگلے ہفتے۔" اس نے شان سے کندھے اُچکائے جیسے ایک بڑا نقصان کرنے کے بعد اطالوی اُچکاتے ہیں۔ بے نیازی سے بھی اور خونخواری سے بھی۔

"تم دونوں ہینڈل کرلو پلیز۔" اقصیٰ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک بھوکے اور دوسرے کنگلے کو کیسے ہینڈل کرے اور وہ کہہ کر گراؤنڈ سے اٹھ کر چلی گئی۔

"اگلے ہفتے سے ایک بھی دن پہلے میرے پاس نہ آنا۔" لمبے کانوں والے نے ناک چڑھا کر کہا اور پھر سے لائبریری کی طرف جانے لگا۔

"اگلے ہفتے تک میں مر جاؤں گی۔" وہ پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ایک میری ہی ٹوئیٹ پر زندہ ہو کیا؟" وہ پھر سے ایک فریج بن گیا' جو غصے کو دبانے کے لیے لفظ چباتے ہیں تو آنکھیں سرد مہری سے اندر کر لیتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ' لیکن وہ اس کے اس طرح قسم دے کر طنز جھاڑنے پر اسے دیکھتی رہ گئی۔ غصہ کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ کیسی بات تھی۔

"آج تو اسی ٹوئیٹ پر رہنا ہے۔ سارے پیسے ختم ہو گئے اور ٹوکنز بھی۔ صبح جلدی کی وجہ سے چائے بھی نہیں پی۔" اس بات پر وہ ذرا رکا۔ اپنے کراس بیگ کو اپنی گردن سے نکال کر اسے کھنگالنے لگا۔ تھوڑا وقت لگا۔ لیکن وہ مطلوبہ چیز نکال چکا تھا۔

اُف۔ اس نے ایک چاکلیٹ نکالی جو آدھی کھائی ہوئی تھی۔

"یہ لو۔" آدھی کھائی چاکلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"اس سے کیا ہوگا۔" چاکلیٹ دیکھ کر امرحہ کو خوشی تو ضرور ہوئی۔ لیکن فی الحال اسے سینڈوچ ہی کھانا تھا۔

"کافی کیلوریز ہیں اس میں۔" بھوری آنکھوں والے نے بیگ کو واپس گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ جینز کی جیب میں ڈالا اور ایسے کھڑا ہو گیا جیسے اس کا فوٹو سیشن ہو رہا ہو۔

"لارڈ میئر بھوک کے دنوں میں یونیورسٹی میں خیرات کرتے ہوئے۔" فوٹو کا کیپشن اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔

"مجھے کیلوریز نہیں چاہئیں۔ کھانا چاہیے۔"

"تو یہ کیا بھوسا ہے؟" لارڈ میئر نے بھنویں اچکائیں اور کچھ ایسے اچکائیں کہ وہ پیشانی پر گرے بھورے بالوں سے جا ملیں۔

"اور یہ جھوٹی۔ بھی ہے۔ جھوٹی اور آدھی کھائی ہوئی اور پھر میں کیوں کسی کی چیز کھاؤں۔" بھنویں۔ اس بار سوالیہ اچھلیں۔ یعنی اتنی ایگو ہے تم میں۔ اچھا۔ سچ میں۔؟

دوسری طرف سے کھالو۔ آخری کنارہ پھینک دینا۔"

وہ منہ بنائے کھڑی رہی۔ اس نے پھر سے بیگ کھنگالا اور ایک پیکٹ نکالا۔ جس کے ریپر کو ایک کاسن پن سے بند کیا گیا تھا۔ تاکہ اندر موجود میوہ جات بیگ میں بکھر نہ جائیں۔ پیکٹ بسکٹ کا لگتا تھا۔

"یہ لو اور یہ بھی لو۔" چاکلیٹ اور بسکٹ دونوں اس کے آگے کیے۔ اس نے دونوں پیکٹ پکڑ لیے۔ ایک میں موجود چاکلیٹ تو اس نے دیکھ لی تھی۔ دوسرے کی پن نکالی تو وہ بسکٹ کا چورا نکلا۔

"مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ خیرات کر رہے ہو۔" امرحہ بری طرح سے برا مان گئی۔ لیکن اس نے جیسے سنا نہیں اور وہ تیزی سے لائبریری کی طرف جانے لگا۔

جو دونوں پیکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ اسے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ لیکن جو جاچکا ہے کیا اسے جانتے ہیں؟

عالیان مارگریٹ۔ وہ اپنی ماں کے نام کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رہائش کا مسئلہ تھوڑا سنجیدہ ہوتا جارہا تھا۔ جو رہائش مل رہی تھی وہ مہنگی تھی، جو سستی تھیں یا وہ دور بہت تھیں یا وہ لڑکوں کے ساتھ تھیں۔ یعنی لڑکے لڑکیاں ایک ہی فلیٹ میں۔ سب اس کے لیے اپنی اپنی جگہ پر کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایک دو برطانوی پاکستانی، ہندوستانی گھرانوں میں بھی گئی، لیکن وہ رہائش بھی اس کی گنجائش سے زیادہ تھی۔ وہ بہت نارمل سی ایک رہائش افورڈ کر سکتی تھی۔ یعنی بے حد سستی کی۔ جتنی زیادہ سستی ممکن ہو سکے اتنی سستی اور یونیورسٹی کے پاس بھی۔

"ایک لینڈ لیڈی ہیں تو، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اودنیا کم ہی لوگ رہنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ انہیں تو سمجھنا بہت مشکل ہے وہاں جا کر دیکھ لو شاید تم ان کو سمجھ سکو۔"

"ٹھیک ہے وہاں بھی جا کر دیکھ لیتی ہوں۔" اس کا منہ لٹک گیا۔

"ہاں۔ ایسے ہی منہ لٹکا لینا۔ اور وہ اپنا مشہور زمانہ اور آزمودہ فقرہ ضرور کہنا۔ منحوس ماری۔ مجھے تو جل مرجانا چاہیے۔" اس بات پر وہ نوال سے زیادہ ہنسی۔

"ایک دو لڑکیاں ہیں جو وہاں گئی تھیں۔ ایک چند دن بعد ہی واپس آگئی اور ایک نے چند ہفتے بعد وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ اسے شٹل کاک کہہ رہی تھیں۔"

"نام اچھا ہے شٹل کاک۔"

"کہانی آتی ہے تمہیں؟"

"ہاں۔ ایک دو آتی ہیں۔"

"لندن سنا ہے وہ ہر رات کہانی ضرور سنتی ہیں۔"

"اچھا۔ صرف کہانی۔ مطلب کرایہ نہیں لیں گی؟"

"ہاہا۔ کرایہ تو ضرور لیں گی۔ ساتھ کہانی بھی۔"

"ٹھیک ہے، میں دو چار کہانیاں یاد کر کے جاتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

شٹل کاک کا پتا لے کر وہ چھٹی والے دن شام کو آگئی۔ یہ ایک، دو منزلہ برطانوی طرز تعمیر کا کافی بڑا گھر تھا۔ گھر کے آگے سبزے کا کافی بڑا قطعہ تھا۔ جس میں مختلف اقسام کے پودے اور پھول لگے تھے۔ ساری عمارت سفید رنگی ہوئی تھی اور وائٹ ہاؤس کا چھوٹا سا سامنا سا تھا۔ بند بھی تھی۔ امرحہ کو شٹل کاک کا بیرونی نظارہ بہت پسند آیا۔ بلکہ بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ اگر اسے یہاں رہنے کو مل جائے تو وہ کافی شان دار قسم کی رہائش گاہ ثابت ہونے والی تھی۔

بیل دی اور کافی دیر تک دیتی رہی۔ کھڑکیوں سے بھی جھانکتی رہی۔ دروازہ بھی بجایا۔ لیکن کوئی بات نہیں بنی۔ وہ دروازے کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گئی کہ شاید مالکن بازار تک گئی ہوں۔ کوئی بیس منٹ بعد جا کر دروازہ کھلا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔

"مجھے کہانی آتی ہے۔" بہت کہا۔

سامنے والی کی ہنسی کا فوارہ نکلا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ لمبی پتلی، سانولی سی۔ کالے سیاہ بالوں کی کس کر چوٹی بنائے ہوئے اور انہیں کندھے پر گرائے ہوئے۔

"مجھے کمرہ چاہیے۔"

"اندر آجاؤ۔" وہ ہنستی ہوئی اندر کی طرف بڑھی۔ امرحہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگی۔

بعد ازاں امرحہ کو معلوم ہوا کہ وہ لینڈ لیڈی کو شام کی چائے پلا رہی تھی۔ پھر ان کا منہ دھلایا، کپڑے تبدیل کروائے۔ بیل دینے والا، دروازہ پیٹنے والا جائے بھاڑ میں، ہم کیا کریں۔ لینڈ لیڈی نشست گاہ میں

منڈے آتش دان کے پاس بیٹھی بال جبریل کا انگلش ترجمہ پڑھ رہی تھیں۔ اس کی سانس اٹکنے لگی۔ یعنی شاعری بھی سنانی پڑے گی۔ وہ بھی ایسی اعلا پائے کی۔ یعنی یہاں بھی اس کا کام بننے والا نہیں تھا۔ بہت دیر اس کا انٹرویو ہوتا رہا۔ وہ بہت صبر سے اور اپنی طرف سے بہت چالاکی سے سارے سوالات کے جوابات دیتی رہی۔

"کھانا پکا لیتی ہو؟ کیا کیا پکا لیتی ہو؟"

"چاول۔ روٹی۔ اور تنور ہو تو نان بھی لگا لیتی ہوں۔" اس نے ایسی چیز کا نام لیا جو برطانیہ میں میسر ہو ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ "تنور۔"

"بیسن کی روٹی۔ آلو، گوبھی۔ قیمے کے پراٹھے۔ مولی کے بھی۔ نان پر بیسن لگا کر اسے تل لیتی ہوں۔ بہت مزے کا بنتا ہے۔ آلو کے پکوڑے۔ چکن پانگ، چکن کے، مچھلی کے بھی بنا لیتی ہوں۔"

لینڈ لیڈی اپنے بچوں کے سے چھوٹے چھوٹے ہاتھ تھوڑی تلے رکھے اسے دیکھتی رہیں۔

"ہو چکا تمہارا؟ اب بتاؤ کھانا پکا سکتی ہو؟"

اس کا منہ لٹک گیا۔ اس کی چالاکی کسی کام نہ آئی۔ دادی ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ انسان کو زندگی میں سب کام آنے چاہئیں۔ نہ معلوم زندگی کہاں لے جائے اور کون سا سیکھا کام کام آ جائے۔

"یہ گوشت کا سالن ہے۔ اور چاول ہیں۔ روٹی بھی۔"

"سادھنا! یہ پراٹھوں کی اتنی ورائٹی کام کی ہے؟"

"جی ہفتے میں دو بار یہ ہو جائے گا۔ باقی گوشت کا سالن اور چاول۔" میڈم سادھنا اسی کے ساتھ صوفے پر ذرا کنارے پر بیٹھی تھیں اور سویٹر بن رہی تھیں۔

"سودا سلف بھی لانا ہو گا۔"

"جی۔ میں لے آؤں گی سنڈے کے سنڈے۔"

"سنڈے ونڈے ہم نہیں جانتے۔ جب جب سادھنا کہے گی لانا ہو گا۔ تازہ سبزی آتی ہے روز۔ حلال گوشت آتا ہے۔ بولو ہاں یا نا؟"

"ہاں جی۔ ہاں۔"

"گڈ۔ اچھا اب بولو کہانی آتی ہے کوئی؟"

"جی آتی ہے۔"

"گڈ۔ کون کون سی؟ سناؤ ذرا۔"

"ایک کوا تھا بہت پیاسا تھا۔ ادھر اڑا۔ ادھر اڑا۔"

"دوسری۔؟"

"دوسری۔ خرگوش اور کچھوے والی۔" سادھنا تیزی سے سلائیاں چلانے لگی تاکہ اس کی ہنسی کم سے کم اس کے منہ سے نکلے۔ لینڈ لیڈی البتہ ہونٹ بھینچے بیٹھی رہیں۔

"بی بی! یہاں رہنا ہے یا نہیں؟"

"رہنا ہے۔"

"تو کیا ہو گئی ہو؟"

"میں اچھی اچھی کتابیں لے لوں گی۔ آپ کو پڑھ پڑھ کر سناؤں گی۔"

"ویری گڈ۔"

"کرایہ بتا دیں پلیز۔"

"پہلے شرائط سن لو۔ تم سے پہلے تین لڑکیاں ہو کر جا چکی ہیں۔ تم چوتھی آئی ہو۔ سادھنا یہاں دو سال سے رہ رہی ہے۔"

اس نے تبسم کر سادھنا تائی "مڑکی" کو دیکھا۔

"ہائے میری بھی اتنی عمر لگتی ہے کیا؟"

"سادھنا سے پہلے یہاں چھ لڑکے رہ کر گئے ہیں۔ اچھے لڑکے تھے سارا کام کر دیتے تھے۔ میں تو لڑکوں کے حق میں ہی تھی۔ پر اب سادھنا کی وجہ سے لڑکیاں ہی رکھتی ہوں۔ سارے گھر کی صفائی کرنی ہو گی اور صبح ہی کر کے جانی ہو گی۔ باقی کے کمرے بند ہیں۔ اور جتنا بھی گھر استعمال ہو رہا ہے۔ وہ تمہیں صاف کرنا ہو گا۔ کھانا بنانا ہو گا۔ ہفتے میں دو دن پودوں کی کانٹ چھانٹ۔ اور کھڑکیوں کی صفائی۔ ایک ہفتے تم میرے کپڑے لانڈری کرو گی اور استری بھی۔ ایک ہفتے سادھنا کرے گی۔ جتنی زیادہ لڑکیاں یہاں رہنے کے لیے آ جائیں گی۔ اتنا ہی کام کم ہو جائے گا۔ میرے کمرے کا جو سینٹرل کارپٹ ہے اسے دھوپ کے

دنوں میں تمہیں دھوپ لگوانی ہوگی۔ پاکستان میں اپنے گھر کا نمبر تمہیں مجھے دینا ہوگا۔ کیونکہ اگر میں نے تمہیں ٹریک سے اترتے ہوئے دیکھا۔ یعنی اگر تم میں کوئی غلط حرکت دیکھی تو فوراً" میں تمہارے گھر والوں کو بتاؤں گی' تم ایک مسلمان لڑکی ہو" اس لیے میں تمہارے پاس کوئی ایسی ویسی چیز نہ دیکھوں' ورنہ میں تمہیں فوراً" یہاں سے نکال دوں گی اسی وقت۔۔۔ چاہے باہر برف باری ہو رہی ہو اور تم نمونیے کا شکار ہو۔۔۔ تمہارے ہر طرح کے دوست یہاں آسکتے ہیں' لیکن اگر میں نے ان دوستوں میں خرابی دیکھی تو بھی تمہیں یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ بے شک تمہیں پورے انگلینڈ میں کہیں جگہ نہ ملے۔ اگر میں سوتی ہوں تو چٹکی کی آواز سے بھی اٹھ جاتی ہوں۔ اس لیے جب میں سوؤں تو تم ایسے ہو جانا جیسے گونگی ہو۔"

لینڈ لیڈی بولتی رہیں۔ بولتی رہیں۔ وہ جس صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی پر لوٹنے لگی۔ کوئی تین گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی صوفے پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کی نظر چھت پر لگے بڑے سے فانوس پر گئی جو روشن تھا۔ لیکن اس کی نیند سے بھری آنکھیں اس فانوس میں سے مختلف رنگ نکلتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ رنگ اڑ رہے تھے۔

"کیا مجھے کسی ڈائن نے اغوا کر لیا ہے۔" چھت اور قد آدم کھڑکی کے قد آدم پردوں کو گھورتے اس نے سوچا۔

"میں یہاں ہوں۔۔۔ کہاں ہوں۔۔۔ میں۔۔۔؟" وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھی سادھنا لینڈ لیڈی کی راکنگ چیئر کے پاس صوفے پر بیٹھی کہانی سنا رہی تھی۔ اسے لگا' وہ صرف پانچ منٹ ہی سوئی ہے۔

"اور کیا کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" وہ آنکھیں ملنے لگی۔

"تم ایسے ہی ہر جگہ لم لیٹ ہو جاتی ہو لڑکی؟" لینڈ لیڈی خفا ہو کر بولیں۔ امرحہ لفظ لم لیٹ پر حیران ہوئی۔ خالص دیسی لفظ تھا۔ یقیناً" کوئی پاکستانی سکھا کر گیا تھا انہیں۔

"جی۔۔۔ بس۔۔۔ آج تھکی ہوئی تھی تو۔۔۔"

"جاؤ کھانا کھاؤ۔۔۔ کچن میں رکھا ہے۔"

"کھانا؟" جیسے صدیوں بعد یہ لفظ سنا تھا۔ وہ جلدی سے کچن میں گئی اور سارے ویجی ٹیبل رائس اور چکن سوپ ہڑپ کر گئی۔ کافی بنائی اور مگ لے کر آ گئی۔ لینڈ لیڈی اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔

"کافی کس سے پوچھ کر بنائی تم نے؟"

"اوہ۔۔۔ پھر غلطی کر دی اس نے۔" وہ خاموش کھڑی دونوں خواتین کو دیکھتی رہی اور منہ لٹکا لیا۔۔۔ شکل پر بے چارگی لے آئی۔

"بیٹھ کر پی لو۔" لینڈ لیڈی کے اعصاب کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ وہ بیٹھ کر پینے لگی۔

"مراقبہ ایتنا" تم ایشیا والے بہت تنگ کرتے ہو۔ آیک سیور قت تو تمہیں بنیادی اخلاقیات سکھانے میں لگ جاتا ہے اور تم لوگ کھاتے بھی بہت ہو۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں' پر تھوڑا اپنی عادات پر قابو پاؤ' انہیں درست کرو۔" امرحہ خاموشی سے کافی پیتی رہی۔

"تم جا کر سو جاؤ سادھنا۔۔۔ اور تم امرحہ! مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔" وہ انہیں کمرے تک لے گئی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھیں۔ دائیں ٹانگ فالج زدہ تھی۔ دایاں ہاتھ بھی بہت مشکل سے حرکت کرتا تھا۔ لیکن ٹانگ کی طرح مفلوج نہیں تھا۔ انہیں ان کے بیڈ پر لٹایا۔ "میرے بال بھی اتارو۔۔۔"

"بال۔۔۔؟" امرحہ کو لگا' ان کے دماغ کے ساتھ بھی کچھ مسئلہ ہے۔

"ہاں بھئی' تو تم۔۔۔؟"

وہ قریب ہوئی اور بالوں پر ہاتھ رکھ کر کھینچا اور وگ اس کے ہاتھ میں آ گئی اور اندر سے بمشکل آدھ انچ لمبے بال نکلے۔

پھر وہ سوئچ بورڈ کی طرف آئی۔ اگر اس نے ٹھیک سے گنے تھے تو وہاں کم سے کم پچیس سے زیادہ بٹن تھے۔ نائٹ بلب کا شیڈ پسند کرنے میں انہوں نے کافی وقت لیا۔ پھر ہلکے سرمئی کو انہوں نے اتوار کی رات

کے لیے پسند کیا اور اسے جانے کے لیے کہا۔

"تم ساتھ والے کمرے میں سوجاؤ، صبح اپنا سامان لے آنا۔" خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ تین وقت کے کھانے کے ساتھ یہ جگہ اسے بہت ہی سستی پڑ رہی تھی۔

"اور ہاں۔۔۔ دوبارہ کچن میں نہ جانا۔" لیکن وہ پہلے کچن میں گئی۔ ایک کپ اور کافی بنائی اور ایک کپ کافی کی قیمت کچن کاؤنٹر پر رکھ دی اور کمرے میں آکر سو گئی۔ درمیان میں اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے فوراً "شری" کو فون کیا۔

"میں پولیس کو کال کرنے ہی جا رہی تھی، تم نے ہمیں پریشان کر دیا۔" وہ ابھی اتنی ذمہ دار نہیں ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن سامان لا کر اسے کمرے میں سیٹ کیا۔ پھر اس دن "سنی ڈے تھا" تو کارپٹ کو اٹھا کر دھوپ میں ڈالا۔ کپڑے دھوئے، استری کیے، پھر انہیں لیڈی مہر کی وارڈروب میں لٹکایا۔ سادھنا کے ساتھ مل کر کھانا بنایا اور پھر کیفے آگئی۔ واپسی پر بک اسٹور ہو لی گئی۔ لیکن وہاں اردو کی کتابیں بہت کم تھیں جو تھیں وہ بہت ادبی تھیں۔ زیادہ تر شاعری کی۔۔۔ "بدن" کا دیو" "خدا کی بستی" "اداس نسلیں" "جب تک چلے گا" "سو" وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو وہ فی الحال اس طرح کی مہنگی کتابیں خرید نہیں سکتی تھی۔ دوسرے اس عمر میں اپنے سر کے بال بکھروانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب کتابیں پڑھ چکی تھی۔ لیکن پڑھ کر سنا نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک صبر آزما کام تھا اور اتنا زیادہ صبر وہ اتنی سی عمر میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک سادہ کی۔۔۔ سستی سی کتاب چاہیے تھی۔ اس نے اپنی پاکستانی ہم جماعت سے بات کی تو اس نے اسے اپنی خالہ کی ایک کتاب لادی۔۔۔ کھیل تماشا۔۔۔ اشفاق احمد کی۔۔۔ خیر ایک تو مفت میں کتاب مل گئی تھی۔ دوسرا زیادہ مہنگی نہیں تھی۔

اپنی باری پر اس نے لیڈی مہر کو کھیل تماشا سنانا شروع کی وہ تو مزے سے سنتی رہیں۔ لیکن امرحہ کے دماغ کے نہیں اوپر سے الفاظ گزر گزر کر جاتے رہے۔ وہ بلاشبہ اپنی طرز کی شاہکار کتاب تھی۔ لیکن امرحہ جیسے کند ذہن اسے بے کار بنا رہے تھے۔ لیڈی مہر اسے بار بار پیچھے لے جاتیں۔ کئی کئی سطروں کو بار بار پڑھواتیں۔۔۔ اتفاق سے اس نے ایک بڑا معرکہ سر کرلیا تھا۔ "کھیل تماشا" نے سننے والے اور سنانے والے دونوں کا دل موہ لیا تھا۔ تخت پور کے ماسٹر بلی اور ان پر مرمٹنے والی رجنی نے نشست گاہ میں جادو سا جگا دیا ہوتا جیسے۔۔۔ ایسے لگنے لگتا جیسے ماسٹر بلی اپنی کلارنٹ پر آ سا گئی ہو اور ان کے سامنے بیٹھے ہی بجا رہے ہوں۔۔۔ اور رجنی ان کے سامنے داسی بنی بیٹھی ہو۔

لیڈی مہر بہت خوش ہو گئیں۔ "بہت کمال کی۔۔۔ شاندار۔۔۔"

سادھنا رات میں بنگالی اور بھوجپوری لوک کہانیاں سناتی تھی جو اس نے اپنے بنگالی باپ اور بھوجپوری ماں سے سنی تھیں اور حیرت انگیز طور پر وہ کہانیاں اتنی تھیں کہ امرحہ کو لگتا، سادھنا نے اپنی زندگی کے اتنے سال صرف کہانی سنتے ہی گزارے ہیں۔۔۔ جب وہ رات کو کہانی شروع کرتی تو اس کی آواز میں سارے بنگال کا سحر سمٹ آتا۔۔۔ وہ گنگا جمنا کی طرح رواں دواں ہو جاتی۔۔۔ ہلکورے کھاتی۔۔۔ شفاف ہو ہو جاتی۔۔۔ اکثر اس کی کہانیاں پرسوز ہوتیں۔۔۔ لیکن وہ انہیں اتنی نرمی اور چاہت سے سناتی کہ لگتا ہی نا کہ ان کہانیوں میں سوز ہے۔

سادھنا بمشکل بتیس سال کی۔۔۔ تھی اور اس کے آٹھ سالہ بیٹے کو ہڈیوں کا کینسر تھا۔ سادھنا کی کہانی محبت سے شروع ہو کر امر حیت پر ختم ہوتی۔۔۔ وہ پرسوز کہانی سناتے ہوئے بالکل آبدیدہ نہ ہوتی بلکہ ایسے لگتا کہ اس کا آٹھ سالہ بیٹا اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔

"جو دکھ پر روتا ہے۔۔۔ وہ تو پھر کوئی انسان ہوا، لیکن جو کم ہمتی پر روتا ہے۔۔۔ وہ بھی کوئی انسان ہوا۔۔۔؟ وہ بھی

کوئی انسان بھلا۔"

تو سادھنا کیونکر روتی' جب اس کا بیٹا ہی جواں حوصلہ ہے۔ ساری تکلیف سہ کر بھی اسے فون کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"میں جب تک زندہ رہوں گا۔ کبھی رو کر نہیں سوؤں گا۔ کبھی رو کر آنکھ نہیں کھولوں گا۔ ڈاکٹروں کے سارے اوزار اور ان کی دوائیں۔ اور میرے جسم کی ساری تکلیف بھی مل کر مجھے ہرا نہیں سکے گی۔ میں نہیں رووں گا ماں۔ کبھی نہیں۔"

تو ایسے بچے کی ماں کیسے روتی۔ وہ بات بات پہ مسکراتی۔ ہنستی۔ اس کی کہانیاں کیوں نہ "امر جیت" ہوتیں۔ اس کی آواز میں ایسا سحر کیوں نہ آتا جو تھپک تھپک کر سلا دیتا ہے۔ دل پہ کیسا ہی بوجھ کیوں نہ ہو۔ اس کی کہانی پرستان لے ہی جاتی ہے۔ سادھنا کی کہانی سنتے وہ نشست گاہ میں ہی سو جاتی جیسے کوئی وہ لوری سنا تا ہو جو جنگ سے لوٹ آنے والا اپنے بچوں کو اور جنگ جیت جانے والا اپنے کنبے کو سناتا ہے۔ وہی جوان مردی کے قصے اور شہیدوں کے لہو رنگ فسانے۔

☼ ☼ ☼

اس دوران ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جو کافی بڑی صورت اختیار کر گیا۔ لیسا اور اس کے چند کلاس فیلوز کو یونیورسٹی کے ایک دوسرے گروپ نے اپروچ کیا۔ وہ ماسٹرز میں اپنی نئی کلاسز کے شروع ہونے کے سلسلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کر رہے تھے۔ اور پارٹی کے انتظامات کے لیے انہوں نے یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو ہی موقع دیا تھا۔ تاکہ وہ چند گھنٹوں میں کچھ زیادہ پونڈز کما سکیں۔ اس کے کلاس فیلوز نے ہاں کہا تھا۔ اس نے بھی ہاں کہہ دیا۔ انہیں پارٹی کے سارے انتظامات دیکھنے تھے۔ ڈیکوریشن سے لے کر سرونگ تک۔ پارٹی ان میں سے کسی ایک اسٹوڈنٹ کے گھر کے لان میں تھی اور جہاں یہ گھر تھا۔ وہاں باقی گھر کافی دور دور تھے۔ جن کے آگے سڑکیں کھلی اور کشادہ تھیں۔

سر شام ہی ان سب نے پارٹی کے لیے ابتدائی سیٹنگ مکمل کر لی۔ باقی ان کا کام میزوں پر کھانے کی اشیا رکھنا تھا جو ذرا دیر بعد کراؤنگ سے لگی تھیں۔ انہیں ہر فرد کو الگ الگ نہیں پیش کرنا تھا۔

"تم شکل سے بہت زیادہ پاکستانی لگتی ہو۔" ایرک اور اس کے دوسرے دوست اسے تشویش سے ایسے دیکھنے لگے کہ اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ سب پارٹی کے انتظامات دیکھنے آئے تھے۔

"میں ہوں بھی پاکستانی۔" وہ برا مان گئی۔

"نہیں۔ ہمارا مطلب۔ وہ سب ذرا ڈرتے ہیں۔ ذرا سے کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہیں۔"

"ڈرتے ہیں۔ کون۔؟"

"آج کی پارٹی میں آنے والے زیادہ تر اسٹوڈنٹس۔" وہ کافی زیادہ گول مول سی باتیں کر رہا تھا۔

"انہیں پاکستان فوبیا ہے کیا؟"

"نہیں۔ شاید ہاں۔ یہ اخبارات۔ ٹی وی۔ میڈیا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ برا نہ ماننا پلیز۔ وہ کمزور عقیدے کے لوگ ہیں۔ جو کچھ اخبارات میں کہا جاتا ہے۔ اس پر یقین کر لیتے ہیں اور تم ہو بھی مسلم۔ پلیز ایسے برا نہ ماننا۔ دھماکوں سے بہت ڈر لگتا ہے انہیں۔"

"دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں مسلم ہوں۔ آخر کیا مطلب ہے ان سب باتوں کا۔ مجھے بھی دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن میں تو تمہیں نہیں بتا رہی۔" وہ ایک دم سمجھ گئی۔

"دیکھا تم برا مان گئیں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ یہاں کون سا دھماکا ہونے جا رہا ہے۔ مطلب کچھ ہو گا ہی نہیں تو ڈرنا کیسا۔؟"

"کچھ ہونے کا خطرہ ہے یہاں۔ کوئی بلاسٹ؟ تم مجھے ڈرا رہے ہو؟"

"میں تمہیں صرف بتا رہا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر کے انکل اور فادرز پولیس میں ہیں۔ بس ایسے ہی بتا

رہا ہوں۔ ایسے پریشان نہ ہو۔"

امرحہ کا سر چکرانے لگا۔ "کیا کہہ رہے ہو۔ کیا سمجھانا چاہ رہے ہو مجھے؟"

"ایسے ہی تم سے باتیں شیئر کر رہے ہیں۔"

"ایسے باتیں شیئر کرتے ہیں۔ تم سب مجھے شک سے گھور رہے ہو۔ تمہیں لگتا ہے میں یہاں دھماکا کروں گی۔ میں۔ کیا مذاق ہے یہ؟"

"ایسی تو کوئی بات ہم نے نہیں کی۔ تم کیا سے کیا سوچ رہی ہو؟"

"ہاں' سیدھے سیدھے یہ بات نہیں کی' پر جو کی' ہیں ان کا مطلب خوف ناک ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تمہارا تو ابھی سے رنگ اڑ گیا ہے۔"

"ابھی سے مطلب۔" اس کا رنگ واقعی میں اڑ' اڑ گیا۔

وہ گڑبڑا گئے۔ "مطلب ہم تو صرف باتیں کر رہے ہیں۔"

"ایسی خطرناک باتیں ہی کرتے ہو تم سب؟ مجھے تمہاری باتیں پسند نہیں آئیں۔"

وہ اپنے کام میں لگ گئی اور اندر ہی اندر سہم بھی گئی۔ یعنی اگر ذرا سی بھی کوئی گڑبڑ ہو گئی تو یہ لوگ اس پر صاف صاف الزام لگا دیں گے۔ پولیس اور یہ سب۔

لان میں ایک طرف آرکیسٹرا اور ڈی۔ جے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جیسے کلب میں ہوتا ہے۔ اندھیرا گہرا ہوا تو ٹوئسٹ لائٹس نے اور Twist بڑھا دیا۔ انہوں نے ڈی جے ساؤنڈ چیک کیا جو خطرناک حد تک تیز تھا۔ نیلی پیلی' ہری لال ٹوئسٹ لائٹس حرکت کرنے لگیں۔ سب آنے لگے۔ انہوں نے میزوں پر پہلے سے ہی سوفٹ ڈرنکس رکھ دی تھیں۔ وہ گھنٹے بعد انہیں کھانے کی چیزیں رکھنی تھیں۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر گیا۔ ان سب نے مل کر میزوں پر کھانے کی اشیا رکھ دیں۔ ڈی جے نسبتاً ہلکی آواز میں میوزک کے ساتھ تجربات کرتا رہا۔ جو امرحہ کو کافی پسند آئے۔ وہ گلاسوں کی

ٹرے رکھنے جا رہی تھی کہ ایرک نے اسے آواز دی۔ وہ اس کے قریب جا رہی تھی کہ ایک زوردار دہشت ناک دھماکا ہوا۔ اتنا زوردار کہ کانوں کے پردے پھٹنے کے قریب ہو گئے۔ امرحہ بری طرح سے لڑھک کر گری۔ اسی دھماکے کے ساتھ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں اور چند انسانی چیخوں کی آوازیں بھی آئیں۔ پورے ایک منٹ تک سناٹا رہا۔ امرحہ زندگی میں کبھی اتنی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اس دھماکے سے ہو گئی تھی۔ وہ بمشکل اٹھی اور آس پاس نظر دوڑانے کی کوشش۔ دوسرے لوگ بھی کچھ اٹھ چکے تھے۔ کچھ اٹھ رہے تھے۔ یہ ایک خوف ناک منظر تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں دھماکا ہوا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ سب اسے گھور رہے تھے۔ اس نے جینز پر لمبی قمیص پہن رکھی تھی اور ایرک نے ہی کہا تھا کہ سر ڈھانپ کر کام کرنا ہے تو اس نے اسکارف کو سر پر اچھی طرح سے اوڑھ لیا تھا۔

امرحہ کو پہلے یہ صرف اپنا وہم لگا کہ وہ سب ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے ہیں۔ پھر اس نے ذرا گردن گھمائی تو ـــــ وہم لگنے والا خیال سو فیصدی خوف میں بدل گیا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر جمے اسے دیکھ رہے تھے۔ گھور رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ "یو۔ یو ڈڈ اٹ (تم نے کیا ہے یہ)"

اس اتنی سی بات سے جیسے کسی نے اس کے سر پر دوسرا دھماکا کیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے ذہن میں نائن الیون' لندن ٹرین دھماکے' اخبارات' ٹی وی چینلز کی سب ہی خبریں۔ ڈاکومنٹریز۔ گڈمڈ ہو کر چکرانے لگیں۔ دہشت گرد۔ یو ڈڈ اٹ۔ دہشت گرد۔ یو۔ یو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ دہشت اس کے چہرے پر نظر آنے لگی۔

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔" وہ اٹک اٹک کر ہونٹ ہلانے لگی۔ آواز اس کے ہونٹوں سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری زندگی

بول ہی نہیں سکے گی اور ٹھیک اسی دوران ایک اور دھماکا ہوا۔ ویسا ہی زوردار۔ ان سب نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ وہاں موجود بہت ساری چیزیں گریں۔ شیشے کے چھوٹے ٹکڑوں کی ایک بوچھاڑ آندھی کی طرح آئی۔ پیچھے کھڑے بہت سے لڑکے لڑکیاں گر گئے اور کراہنے لگے۔ اس طرف کافی اندھیرا تھا۔ لیکن ان کی چیخیں اور کراہیں سنی جاسکتی تھیں۔ اس بار امرحہ گری نہیں کھڑی ہی رہی اور کافی وحشت ناک انداز لیے کھڑی رہی۔ ایک دم سے فضا میں پولیس سائرن اور فائر بریگیڈ سائرن کی آوازیں گونجیں۔ پیچھے کہیں سے زوردار آگ کے بھڑک اٹھنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

"اس نے ایک بم اپنے ساتھ بھی باندھ رکھا ہے۔" کسی ایک نے چلا کر اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ سب سہم کر دور دور ہونے لگے۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب۔ یہ سب ایسے ہی ہو رہا ہے جیسے اسے نظر آرہا ہے۔ پولیس سائرن کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ اس کی خبر بنے گی کہ مانچسٹر میں ایک اسٹوڈنٹ پارٹی میں دھماکے ہوگئے۔ اور اس جگہ امرحہ موجود تھی۔ کھڑے کھڑے اس نے کل کے اخبارات میں اپنی تصویر دیکھ لی۔ ٹی وی کی رپورٹنگ ڈسپلے کرلیا۔ عدالت میں خود پر کیس چلتے دیکھ لیا۔ اس کے حق میں چند ہزار مسلم ریلی نکال رہے ہیں اور عدالت اپنا فیصلہ سنا رہی ہے۔ اس کے گھر والے اسے لعنت ملامت کر رہے ہیں۔ اور معصوم ہوتے ہوئے بھی اسے یورپین میڈیا دہشت گرد ثابت کررہا ہے۔ اس کی پڑھائی کا کیا ہوگا۔ اس کا کیا ہوگا۔ وہ تو مرجائے گی اور ٹھیک اسی دوران ایک اور دھماکا ہوا اور وہ حلق کے بل چلانے لگی۔ پاگلوں کی طرح۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔" ایک سیکنڈ میں وہ یہ بات بیس بار کہہ گئی، ساتھ چلاتی رہی۔ چار پانچ سو اسٹوڈنٹس کا گروپ ادھر ادھر پھیلا اسے دیکھتا رہا۔

"سن رہے ہو تم۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ پوری قوت سے چلائی۔ اپنی ساری ہمت جمع کر کے۔ پورا زور لگا کر۔ وہ سب ویسے ہی کھڑے رہے۔ جیسے کوئی اسٹیج شو کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں۔

"تم۔ تمہارا میڈیا۔ تمہارے ٹی وی چینلز۔ اخبارات۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ پاگل ہو تم سب۔ پاگل بناتے ہو۔ دنیا کو۔ ہم دہشت گرد ہیں یا تم۔ ہم نہیں تم ہو۔ تم نے دنیا میں فرسٹریشن کو بڑھایا ہے۔ تم ہو خرابی کی جڑ۔ اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں کہ تم مجھ پر الزام لگا کر مجھے اندر کروا دو۔ میں تم سب کو مار ڈالوں گی۔ دہشت گرد نہیں ہوں میں۔ نہیں ہوں۔"

پھر ایک دم وہ نیچے پر بیٹھ کر رونے لگی اونچی اونچی آواز سے رونے لگی۔ اور اونچی۔ اور اونچی۔ پولیس اور فائر بریگیڈ سائرن بند ہو گئے۔ پارٹی میں اب صرف اس کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سب جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ اب وہ ایسے کھڑے تھے جیسے ہارر موی دیکھ رہے تھے۔

"یہ سب تمہارے ساتھ پریکٹیکل جوک (عملی مذاق) کر رہے تھے۔"

آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ اس نے جھٹکے سے گردن اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس سے ذرا سا دور اندھیرے میں ایک کرسی پر عالیان بیٹھا کاک ٹیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے یہ بات اتنے سکون سے کی جیسے وہ خاموشی سے بیٹھا اور پھر اکتا رہا ہو۔

"پریکٹیکل جوک۔" وہ کئی لطیفے سنانے۔ میں ہی رہی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس حد تک کوئی عملی مذاق بھی کیا جاسکتا ہے۔

"تیسرے دھماکے کے بعد انہوں نے تمہیں خود ہی بتا دینا تھا۔ یہ سب سینئرز ہیں اور جونیئرز کے۔"

"شٹ اپ۔" اس نے دھاڑ کر انگلی اٹھا کر عالیان سے کہا۔ پھر وہی انگلی لہرا کر اس نے وہی شٹ اپ پوری قوت سے چلا کر ان سب سے کہا۔

"تم لوگ۔ انگریز۔ گورے۔ دنیا پر حکمرانی

کرنے والے۔ جو جی میں آئے کرنے والے۔ ہمیں غلام سمجھ رکھا ہے۔ جب جی میں آیا مذاق بنا لیا ہمارا۔ جب جی میں آیا غلام بنا لیا۔ کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں۔ پہلے ہمارے ملک میں آئے۔ ہم پر راج کیا۔ ہماری تذلیل کرتے رہے اور اب ہمیں دہشت گرد بنا رہے ہو۔ ہم سے حسد کرتے ہو کہ ہم زندگی میں آگے نہ نکل جائیں۔ تم سب سے آگے نہ نکل جائیں۔"

گالی اور گفتی کے لیے ہر انسان اپنی مادری زبان استعمال کرتا ہے کہ مصداق وہ دونوں سے چیخ چلا کر اردو میں ان پر برس رہی تھی۔ عالیان ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔

"ہم انگریز۔ گورے۔ ہمارے ملک میں آئے۔ ہم نے تمہاری میزبانی کی۔ تمہیں بادشاہ بنایا۔ جاتے ہوئے تمہیں کوہ نور تحفے میں دیا۔" عالیان اپنی مرضی کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اسے اور بھڑکا رہا تھا۔ امرحہ کے پاس عالیان سے نمٹنے کا وقت نہیں تھا۔

"تم لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا سمجھتے ہو تم خود کو ہاں؟ بہت بڑی توپ قوم ہو تم؟ تم نیک۔ شریف۔ پڑھے لکھے۔ اور ہم جاہل۔ گنوار۔ دہشت گرد۔ مسلمان دہشت گرد نہیں ہے۔ تم اور تمہاری گندی سیاست نے مل کر اسے دہشت گرد بنا دیا ہے۔ ایک نومولود بچہ بھی دہشت گرد ہے۔ اگر وہ مسلمان ہے تو۔"

امرحہ کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کے اس جلال کے عالم میں کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ بول سکے۔ یا اس کے قریب آسکے۔ عالیان خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی ترجمہ نہ کیا۔

"ٹرانسلیشن پلیز۔" کسی کونے سے آواز آئی۔

"جوک کرنے کے لیے تمہیں یہی جوک ملا تھا؟ خود تم نے کوانتا سوبے میں کیا کیا؟"

"وہ امریکی تھے۔" عالیان بولا۔

"وہ ظالم تھے۔ اور ظالم کسی قوم سے نہیں ہوتا اور یہ سب بھی ظالم ہیں۔" اس نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔

"ٹرانسلیشن پلیز۔" آواز پھر آئی۔ امرحہ نے ایک قہر آلود نظر سب پر ڈالی اور اس بار انگلش میں بولی۔

"اس مذاق سے اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ اگر میں مر جاتی۔ اتنا گھٹیا مذاق۔ تم لوگ اتنے ظالم ہو کہ مذاق بھی ایسا ظالمانہ سوچا۔ تف ہے تم پر۔ کتنے چھوٹے ہو تم سب۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتے اور یہ سب سیکھتے ہو۔ گندے ہو تم۔ جاہل۔ تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ مر جاؤ سب کے سب تم۔ اتنے پونڈز تم نے دھماکوں پر لگا دیے اگر وہی پونڈز تم۔"

"کوئی پونڈ نہیں لگا۔ وہ تو ایسے ہوئے ہیں۔" ڈی جے نے ایک بٹن دبایا اور ایک اور دھماکا ہوا یعنی وہ مرا ہوا تو نہیں ہو رہا تھا۔ اللہ انہیں نظر بد سے بچائے کس قدر ذہین لوگ ہیں۔

"وہ سب۔ جو شیشے کی کرچیاں اڑ کر آئی تھیں۔ وہ ہارڈ کرسٹل شیٹ کی تھیں۔" امرحہ نے شدید غصے میں اپنے قریب ہی گرا ہوا ایک گلاس اٹھا کر اور پر ڈی جے کی طرف اچھالا۔

"انگلیاں ٹوٹ جائیں تمہاری بہرے ہو جاؤ تم۔"

"ریلیکس۔ کافی ہو گیا۔ چلو اب بس کرو۔" عالیان نے نرمی سے کہا۔ اسے اور غصہ آیا۔

"بکواس بند رکھو اپنی۔" اس کی آواز ڈی جے کے دھماکے سے زیادہ دھماکا انگیز تھی اس بار۔ اس نے ایک نظر پھر سب پر ڈالی بے عزتی کے احساس سے اس کا سارا وجود جھلسنے لگا اور جیسا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ دھاڑیں مار مار کر روتی ہی رہی تھی۔ تو وہ سب ہی دھاڑیں اس کے اندر پھر سے جاگ اٹھیں۔ وہ گھاس پر بیٹھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر ان سب دھاڑوں کو آواز میں ملا کر رونے لگی۔ سب نے دور سے ہی اس کے گرد گھیرا سا بنا لیا۔ کسی میں اب اتنی جرات نہیں تھی کہ شیرنی بنی امرحہ کے پاس آئے اور اسے چپ ہی کروائے۔ عملی مذاق تھا اور کچھ زیادہ ہی

عملی ہو گیا تھا۔ اب وہ رو رہی تھی اور وہ سب شرمندہ شرمندہ اسے سن رہے تھے۔ عالیان اٹھا اور چل کر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"مذاق کچھ زیادہ ہی ہو گیا نا۔ ان کی غلطی ہے۔ انہیں معاف کر دو۔" وہ بدستور ہچکیاں لیتی رہی۔

"پلیز۔ انہیں معاف کر دو۔ پلیز۔"

اس نے ساون تڑپ تڑپ کر چھپ چھپ کر روتی رہی۔ آنکھوں کو اٹھا کر عالیان کو دیکھا۔ عالیان وہیں کلو ہیں رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں دو آنکھوں میں "اتنی تڑپ" تکلیف دکھ اور غصہ سمٹا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سیاہ مشرقی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان مشرقی آنکھوں میں طیش و شکوے کے ایسے بادل نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسے شکایت سے دیکھ رہی تھی کہ اردو بولنے والا تم سے مسلمان لگنے والا وہ بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔

عالیان چپ کا چپ ہی رہ گیا۔ اس کی بھوری آنکھوں نے اس سے بھرپور شکایت کی۔ اسے انہیں ان دو سیاہ آنکھوں کے اتنے قریب نہیں ہے۔ ہونا چاہیے تھا۔ اب اگر وہ ایسا کر چکا تھا تو اس کا انجام اسے ہی بھگتنا تھا۔ اکیلے۔

عشق مجازی کا اگر کوئی لارڈ کا نام ہوتا تو محبوب کی آنکھ کا طیش ہوتا اور اگر سوتی ہوئی اندھیری آنکھوں کا کوئی لارڈ کا نام ہوتا تو وہ امرحہ ہوتی۔

عالیان کو یہ یاد کرنے میں دقت ہوئی کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دشواری اسے اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کے پانیوں میں غرق ان آنکھوں سے ہٹانے میں ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دو قدم پیچھے کو چلا اور پھر سے بھاگ پڑنے جیسے انداز سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ماسٹر یلی کلارنٹ پر بسنت بہار بجا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ سب باری باری گھر آتے رہے اور دروازے کے پاس ہی پھول رکھتے گئے۔ رات اس نے ان کا سوری قبول نہیں کیا تھا۔ ڈر کے مارے وہ اندر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی سب کا تماشا دیکھتی رہی۔ سب سے بڑا گلدستہ ڈیرک کی طرف سے تھا، یہ وہی تھا۔ جس نے امرحہ کا انتخاب کیا تھا اس ڈرامے کے لیے۔ پھر اسے ایک لمبا چارٹ ملا جس پر ان سب کے دستخط تھے اور چارٹ پر ایک روتا ہوا موٹے موٹے آنسو والا سوری لکھا تھا۔ چارٹ کے ساتھ ہی وہ ویڈیو بھی بھیجی گئی تھی جو کل رات بنائی گئی تھی۔ اس نے وہ ویڈیو دیکھی اور اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ واقعی۔ وہ ایک مکمل مزاحیہ ڈرامہ تھا۔ ان سب کے تاثرات کمال تھے۔ اس نے وہ ویڈیو لیڈی مہر اور سادھنا کو بھی دکھائی۔ وہ لوٹ پوٹ ہو گئیں بار بار ویڈیو کو چلا کر دیکھتی رہیں۔

بعد میں اسے معلوم ہوا کہ کام کرنے کے لیے جتنے بھی لوگوں کا گروپ وہاں موجود تھا۔ ان سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ کیا جاتا تھا۔ وہاں موجود سب ہی اسٹوڈنٹس مانچسٹر یونیورسٹی میں پچھلے چار سال سے پڑھ رہے تھے اور یہ ایک روایت ہی تھی کہ وہ ہر سال کچھ نہ کچھ کرتے تھے لیکن امرحہ کے ساتھ مذاق کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا۔

اس واقعے سے اتنا ہوا کہ وہ یونیورسٹی میں کافی مقبول ہو گئی۔ اس کے کلاس سے زیادہ دوست بن گئے جو اسے دیکھ لیتا رک کر اس کا حال احوال ضرور پوچھتا۔ اسے کلاس لنچ کے لیے بلاتے۔ کوئی نہ کوئی اس کی مدد کے لیے تیار رہتا۔ جو اسٹوڈنٹس مانچسٹر کے ہی رہنے والے تھے۔ وہ اسے اپنے گھر شام کی چائے یا ویک اینڈ ڈنر پر مدعو کرتے۔ اس کے رونے دھونے کا ان سب فنکاروں پر ایسا اثر ہوا کہ اسے ننھی منی بچی کی طرح ٹریٹ کرتے کہ بے بی چاکلیٹ کھالو۔ آئس کریم کھالو۔ اچھا یہ لو بار بی۔ چلو رو لو۔ بس رونا نہیں۔

ایک وسیع حلقہ اسے جاننے لگا۔ جس سے چاہتی پڑھنے میں مدد لے لیتی۔ اسی دوران شٹل کاک میں ایک روسی ویرا اور ایک جاپانی این اون (Fam

(En) آئی۔ جاپانی تو بہت خاموش طبع تھی۔ سال میں ایک بار بولنے والوں جیسی تھی۔ اس نے لیڈی مہر کو کسانی سٹائل پر لیڈی مہر نے اسے خود ہی روک دیا کہ وہ بس چپ چاپ گھر میں رہتی رہے۔ البتہ ویرا نے اپنے شہر سوچی میں ہونے والی بائیسویں سرمائی اولمپکس کی وہ وہ کہانیاں سنائیں کہ خود امرحہ کا جی چاہا کہ کاش وہ کوئی ایتھلیٹ ہوتی۔ کاش فارغ اوقات میں ویرا مانچسٹر کی سڑکوں پر دکھائی دیتی۔ اس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ بال کمر سے بہت نیچے تک لمبے تھے یا سکائی کلنگ کرتی یا اسکیٹنگ۔ جب وہ یہ دونوں کام کرتی تو لگتا کہ کوئی پری پہاڑوں کے سڑکوں پر نیچی پرواز پر اڑ رہی ہے۔ اس کے بال جو اونچی پونی کی صورت میں بندھے ہوتے لہراتے اڑتے۔ ایک بار ویرا نے اسے اسکیٹنگ شوز پہنا دیے اور امرحہ منہ کے بل سڑک پر گری۔ ناک کی ہڈی اتنی بچ گئی کہ بس سرجری کی ضرورت نہ رہی۔ باقی ساری کسر پوری ہو گئی۔ امرحہ کا بس کا کرایہ بھی بچا۔ وہ ویرا کے ساتھ ہی اس کی سائیکل پر بیٹھ کر یونیورسٹی چلی جاتی۔ لیکن ویرا کے ساتھ سائیکل پر بیٹھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا رولر کوسٹر پر بیٹھنا۔ دل گردے کا کام تھا۔ کرایہ بچانے کے لیے وہ اپنے دل گردے روز مضبوط کر لیتی۔ وہ سائیکل پر ہزار ہزار کرتب دکھاتی۔ دل ہلا جاتی۔ ویرا کچھ اخبارات کے لیے کالم لکھتی تھی۔ اس لیے اسے نوکری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے شٹل کاک ہاؤس میں چھوٹے موٹے مرمت کے کام آسانی سے کر دیے تھے۔ جس کی اسے لیڈی مہر نے اجرت بھی دی۔ اس کا مرمت میں ہاتھ بٹاتے امرحہ نے کم ہی دیکھا تھا۔ اسے جیسے سب ہی کام کرنے آتے تھے۔

ڈیرک کی مدد سے اسے جوتوں کے ایک اسٹور میں کام مل گیا۔ اس کا کام بلیں بنانا تھا بس۔ کافی آرام دہ کام تھا اور اس کی ہفتہ وار تنخواہ بھی اچھی تھی۔ ہفتے میں ایک بار وہ کینے ضرور جاتی اور اپنے سابقہ باس سے کافی کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی بات چیت کر کے آتی۔

اب تو دادی اور اماں بھی اس سے بات کرتے آب دیدہ ہو جاتی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی۔ اس نے پہلی بار دادی کو اپنے لیے آنسو صاف کرتے دیکھا۔ حماد اور علی اسے کافی تمیز سے مخاطب کرتے۔ دانیہ اسے خاندان میں ہونے والی تقریبات کی ویڈیوز بھیجتی رہتی جس میں اسے تو دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ سادھنا لیڈی مہر اور ویرا کافی شوق سے ان ویڈیوز کو دیکھتیں۔

☼ ☼ ☼

ویسے تو موسم ابر آلود رہتا ہی تھا اور ہلکی پھلکی بارش بھی ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن اس دن ہلکی لیکن مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ویرا کو کسی اخبار کے دفتر جانا تھا۔ اس لیے وہ اکیلی ہی آکسفورڈ روڈ پر واک کرتی سست روی سے چلتی رہی۔ اسے کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ گیلی گیلی عمارتیں۔ نم نم درخت۔ اچھا لگ رہا تھا اور بھلے سے وہاں کے مقامی اس موسم سے عاجز آ چکے ہوں پر غیر ملکی خاص کر گرم ملکوں کے باشندوں کی جان تھی اس موسم میں۔ اس نے گہرے گلابی رنگ کے ویرا کے اسٹول کو گردن میں دو بل دے رکھے تھے۔ انہیں کھول کر اس نے سر پر اوڑھ لیا۔ پھر اس نے واپس گردن میں بل ہی دے دیے۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار سر پر پڑتی اچھی لگ رہی تھی۔ ایک دم سے پیچھے سے ایک نیلی چھتری جس پر گل لالہ کے پھول بکھرے تھے۔ اس کے سر کے اوپر تن گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر چھتری پکڑنے والے ہاتھ کو۔ وہاں عالیان کھڑا تھا۔

"تمہیں اپنی ٹریٹ واپس نہیں چاہیے۔ آج میں تمہیں برگر بھی کھلا سکتا ہوں اور کافی بھی۔"

"اتنی پرانی بات۔ نہیں اب نہیں چاہیے۔"

"کیوں۔ اب کیوں نہیں چاہیے؟" چھتری بدستور وہ اس کے اوپر رکھے ہوا تھا۔ خود وہ بھیگ رہا تھا۔

"تم سے نہیں چاہیے۔ تم بہت بدتمیز ہو۔"

"میں نے تم سے کب بدتمیزی کی؟"

"کب نہیں کی۔۔۔ ویسے تم مجھ سے اتنی نرمی سے کیوں بات کررہے ہو؟"

"مجھے خود نہیں پتا چل رہا۔۔۔ میرا دماغ کھسکتا ہی جارہا ہے۔"

"علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ ایسا کرو علاج کی بھی ٹریٹ لے لو۔"

"علاج تو میں کروالوں۔۔۔ لیکن اس بیماری کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔"

"ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ کے ساتھ تم ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کیسے کرسکتے ہو؟"

"اور یہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ بھی تو سب اوٹ پٹانگ کرتی ہے۔"

"سب کیا۔۔۔؟"

"سب مطلب سب۔۔۔" وہ ہلکے سے مسکرایا اور یہ کرتے وہ ایسا لگا کہ امرحہ نے سوچا۔

"کیا اس نے خدا سے الگ سے اپائنٹمنٹ لی تھی۔"

امرحہ نے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے دی۔ "یہ کھاؤ تمہاری کیلوریز تیزی سے کم ہورہی ہیں۔"

"تمہیں ڈراپ کردوں۔" وہ چاکلیٹ لے کر کھانے لگا۔

"تمہارے پاس گاڑی ہے۔"

"نہ۔۔۔ سائیکل۔۔۔"

"میں ویرا کے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں بیٹھتی۔"

"میں گراؤں گا نہیں۔"

"پر میں تمہیں ضرور گرادوں گی۔۔۔ بھاگ جاؤ' میرا سر نہ کھاؤ۔"

"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔"

"خاص تمہارے لیے۔"

"میرے لیے کچھ خاص۔۔۔ واؤ۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ تم نے سینما دیکھے ہیں یہاں کے؟" اس کے بھورے سر پر بارش کے قطرے کسن بیٹی کھیل رہے تھے۔

"ہاں' ویرا کے ساتھ گئی تھی۔"

"اس نے یقیناً تمہیں ہنگر گیمز دکھائی ہوگی۔

اس کا کہنا ہے کہ وہ جینیفر سے مشابہ ہے۔"

"لیکن وہ جینیفر سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

"میں تمہاری کلاس فیلو جینیفر کی بات نہیں کررہا۔ ویسے میں تمہیں ایک اچھی انڈین مووی دکھا سکتا ہوں۔"

"میں انڈین موویز نہیں دیکھتی۔"

"پاکستانی۔۔۔؟"

"وہ تمہیں نہ جارہی ہیں۔۔۔ میں پاکستان سے دیکھ کر آئی ہوں۔"

"بنگالی۔۔۔؟"

"مجھے بنگالی نہیں آتی۔"

"ایرانی۔۔۔ افغانی' تاجکستانی' ترکمانی' عراقی' مصری اور ہاں اٹلی میڈیٹ۔۔۔ کیا تم نے کبھی سینما میں Animated فلم دیکھی ہے؟"

"موقع نہیں ملا۔"

"کیا تم نے Ratatouille 2 دیکھی ہے؟ دیکھو اگر تم نے اتنی عظیم فلم نہیں دیکھی تو میں تمہیں پہلے اس کی کہانی سنا سکتا ہوں۔ دیکھنا خود تمہارا دل چاہے گا کہ تم فلم دیکھو۔۔۔ یہ ایک قابل ذکر چوہے اور اس کے محسن کی کہانی ہے۔ چوہا جس کے ہاتھ میں کمال کا ذائقہ ہوتا ہے اور وہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شیف سے زیادہ اچھا اور لذیذ کھانا بنا سکتا ہے۔ ایسا کھانا جس کی کھانے والے کو نظیر نہیں ملتی اور ایسی ترکیب اور سلیقے سے۔"

"چوہا شیف ہوتا ہے؟ مطلب جو کھانا بناتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔۔۔ وہ کھانا بنانے سے پہلے ہاتھ دھوتا ہے۔۔۔ اس کے ہاتھ صاف ہوتے ہیں۔۔۔ بالکل تمہاری طرح۔۔۔"

"چوہا اور کھانا۔۔۔ آخ خ۔۔۔ خ۔۔۔" امرحہ نے سر کو زور' زور سے جھٹکا۔ "آخ خ۔۔۔ چوہا۔۔۔ اور میرے ہاتھوں جیسے صاف ہاتھ۔۔۔" عالیان نے چھاتے کو بند کیا۔ اس کا ہاتھ تھک چکا تھا اور چلتے چلتے وہ رک گیا اور اسے بھی روک لیا۔ اب بارش کے قطرے دونوں کے بالوں میں لک چھپ جارہے تھے۔

"پھر کرنا۔"

"کیا۔؟"

"یہ جو ابھی کیا تھا۔"

"کیا کیا تھا؟"

"وہی جو چوہے کے نام پر کیا تھا۔"

"آخ۔ خ۔" امرحہ کو پھر سے چوہے کا خیال آگیا۔

"ایک بار پھر کرنا۔ پی۔ پی۔ پلیز۔"

"تم پاگل ہو گیا کہہ رہے ہو۔"

"جب تم یہ آخ کرتی ہو تو تمہاری بھنویں اور آنکھیں بچگانہ سا رقص کرتی ہیں۔ اور تمہاری ناک۔ یہ دائیں بائیں لہرا کر اکساتی ہے کہ اسے پکڑ کر اس پر چٹکی بھری جائے۔"

"تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔" امرحہ کو لگا وہ اس کی ناک کی چٹکی بھرنے لگا۔

"اچھا تمہارا وقت بھی اب قیمتی ہو گیا ہے؟ اچھا چلو پھر فلم کے لیے چلا؟"

"اگر ویرا جانے کے لیے تیار ہو گئی۔"

"ویرا؟"

"ہاں۔ دادا نے کہا ہے، چونکہ امرحہ میں تمہیں لے کر جاؤں۔"

"دادا جی کو یہاں ساتھ لے آتیں وہ پھر بھی اچھا تھا۔"

"تم میرے دادا کا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"چلو ویرا کو بھی لے آتا۔"

☼ ☼ ☼

اور وہ ویرا کو بھی لے گئی۔ ویرا تو جاتے ہی سو گئی۔ کیونکہ اسے خالص ایکشن فلمیں پسند تھیں جن میں ہر دو منٹ بعد ایک بم بلاسٹ ہو اور کم سے کم دو آدمی مر جائیں۔ اور ہیرو بس بڑی بڑی عمارتیں پھلانگتا رہے۔ اور کسی زمین پر کھڑا ہو ہی جائے تو چار اطراف فائر کھول دے۔

جب چوہے نے پہلی بار کھانا پکانا شروع کیا تو اس نے منہ ہی منہ میں گنتی ہی بار۔ آخ۔ آخ۔ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دلچسپی سے فلم دیکھنے لگی۔ اور اختتام پر اس نے تالیاں بجائیں۔ اس نے اس قسم کی فلم پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہیرو ہیروئن کے بے جھمیلوں سے ہٹ کر ایسی شاندار فلم۔ کمال ہو گیا۔

جب وہ ویرا کی سائیکل پر بیٹھ رہی تھی گھر جانے کے لیے تو عالیان نے بہت آہستگی سے اس سے فرمائش کی۔

"ایک بار کہہ دو۔ آخ۔ خ۔" اور وہ قہقہہ لگا کر ویرا کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ لوگوں کا آنا بہت خوشی دیتا ہے۔ ان لوگوں کا جانا اتنی ہی تکلیف دیتا ہے۔ وہ اس وقت بھی ملی جلی سی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

وہ عالیان مارگریٹ جو جب سیٹی بجاتا۔ دونوں ٹانگوں کو ہوا میں اچھال کر ان کی تالی بجاتا جاتا ہے تو کم سے کم پچاس لوگ اسے مڑ کر دیکھنا ضرور پسند کرتے ہیں۔ اگر وہ غصے سے بھی کسی کو دیکھتا ہے تو بھی اس پر پیار ہی آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

لیڈی مہر شادی کے دس سال تک بے اولاد رہیں۔ پھر جب دونوں نے بچہ گود لینے کا سوچا تو ان کے شوہر احمد حسین کا کار کے حادثے میں انتقال ہو گیا۔ احمد حسین دل کے سرجن ڈاکٹر تھے۔ وہ ایک کامیاب انسان تھے اور ایسے کامیاب نرم خو انسان کے چلے جانے کے بعد ان کی بیوی اتنی کامیابی سے زندگی نہ گزار سکیں۔ پہلے فالج سے ان کا آدھا حصہ مفلوج ہوا۔ وہ دو سال پرائیویٹ ہسپتال میں رہیں۔ میکے کے نام پر ان کے خاندان میں صرف ایک باپ تھے جو ان کی دو سالہ بیماری کے دوران چل بسے۔ احمد حسین کے تین بھائی تھے۔ لیکن وہ اس صورت مہر سے ملنا چاہتے تھے۔ اگر وہ احمد حسین کی جائیداد ان کے نام

کروا دیتیں۔ ایک گھر اور میڈیسن کمپنی کے شیئرز۔ مہر بچہ گود لینا چاہتی تھیں۔ اب وہ بچہ نہیں لے سکتی تھیں۔ ان کی حالت ہی ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ بچے کو کیسے... اور اس حالت میں انہیں کوئی بھی لاوارث بچہ نہ دیتا۔ تو انہوں نے بچوں کو ان اداروں میں رکھ کر ہی پالنا شروع کر دیا۔ ایک ادارہ تھا "اور کڈز" (ہمارے بچے) جو بچہ پالنے کے خواہش مند افراد کو ایک بچے سے ملوا دیتے اور پھر اس کے اخراجات کے پیسے لیتے رہتے اور اسے اپنے پاس رکھ کر ہی اس کی تعلیم و تربیت کرتے۔

مہر نے یہاں ایک نہیں پورے دس بچوں کو لے کر پالا۔ وہ کمپنی سے ملنے والے منافع میں سے اپنے اخراجات کے لیے رقم نکال کر باقی سب اس ادارے کو دے دیتیں۔ بچے مہینے میں ایک بار ان سے آکر مل جاتے۔ ایک پورا دن ان کے پاس گزار کر جاتے۔ مہر کو ماما کہتے۔

یہ مختلف قوم و نسل سے تعلق رکھنے والے بچے تھے اور سب مہر کو بہت پیارے تھے۔ کرسمس... سال وہ مہر کے ساتھ گزارتے۔ ان میں سے ایک مسلمان تھا۔ وہ اپنی عید مہر کے گھر... کرتا۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے وہ مہر کے پاس رات... رکنے لگے۔ وہ سب نہ صرف اپنے کام خود کرتے تھے بلکہ مہر کے بھی کئی کام کر دیتے۔ مہر بچوں کے اس ایک دن اور رات کا انتظار کرتیں جب وہ سب ان کے پاس ہوتے۔

یہی بچے بالغ ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے مختلف شہروں، ملکوں اور یونیورسٹیوں کی طرف بڑھتے گئے۔ کچھ شادی کر چکے تھے۔ کچھ نوکری کرتے تھے۔ کچھ ابھی بھی پڑھ رہے تھے۔ یہ سب دنیا کے کسی بھی کونے میں، کسی بھی حالت میں ہوتے مہر کو فون کرنا نہیں بھولتے تھے۔ لیڈی مہر ہمہ وقت ان کے فون سنتیں یا انہیں سالگرہ کے تحائف بھیج رہی ہوتیں۔ ان کی طرف سے بھیجے جانے والے فون میسجز یا کارڈز پڑھتی رہتیں۔ مہینے دو مہینے میں کوئی نہ کوئی ان سے ملنے آیا بھی ہوتا۔ جس کی آمد پر وہ ایسے خوش ہوتیں جیسے پاکستان میں مائیں اپنے بیٹوں کو سہرا باندھے دیکھ کر ہوتی ہیں۔

گاہے بگاہے یہ سپیشل کال آتے رہتے تھے۔ اسی لیے یہاں چار، پانچ سے زیادہ لوگوں کو پے انگ گیسٹ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ایک، دو دن وہ گروہ چلے جاتے۔ کوئی ڈاکٹر تھا، کوئی انجینئر، کوئی اپنا بزنس کر رہا تھا۔ کوئی نرس تھی، کوئی اسٹوڈنٹ، لیکن یہاں آتے ہی وہ سب لیڈی مہر کے بچے بن جاتے۔ ان کے سارے کام خود کرنا پسند کرتے۔ انہیں کھانا کھلاتے، منہ دھلواتے، ہفتہ وار میڈیکل چیک اپ کے لیے لے کر جاتے، انہیں مختلف جگہوں میں لیے گھومتے رہتے اور رات کو انہیں کہانیاں سناتے "لیڈی مہران کے لیے مقدس... تی بھی سی تھیں۔

انہی میں سے ایک مور گن کیمبرج سے ایم فل کر رہی... وہ اپنے فرینڈ جوش کو بہرو کھونے کے لیے... کال لائی کہ اگر ماما ہاں کہتی ہیں تو وہ بھی جوش کو ہاں کہہ دے۔

"یہ گنجا کبوتر تمہیں واقعی... پسند ہے مور گن؟"

"اچھا انسان ہے ماما" مور گن مسکرائی۔

"کیا ساؤتھ یونین کے برفیلے پہاڑوں میں کام کرتا رہا ہے۔ بہت ہی برفیلا سا ہے۔"

"اگلے سال جوش کی پی ایچ ڈی مکمل ہو جائے گی۔"

"مور گن! آپ ہیرو شیرو کو پسند کرتیں نا ماما ہے کیمبرج میں بہت سے فلم اسٹارز پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ میرا تو خواب ہی رہا کہ میرے کسی بچے کی کسی فلم اسٹار سے شادی ہو۔"

"تو میں جوش کو انکار کر دوں ماما...؟"

"تمہارے انکار سے تو یہ مر مرا جائے گا۔" انہوں نے بے چارے سے نظر آتے جوش کو دیکھا۔ جو ٹی وی پر ایک ڈاکومنٹری دیکھ رہا تھا، سادہ سا اور امرد۔ اسے ایسے دیکھ رہی تھیں کہ وہ بے چارہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ دراصل وہ دونوں جان بوجھ کر اسے حواس باختہ

کر رہی تھیں۔

بس ایویں ہی۔ خوامخواہ کا مشقتی شغل۔

"ہاں تھوڑا ڈر تو ہے۔" مور گن نے ماما کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے ہاں کہہ دو پھر اسے۔ کب کرو گی شادی۔؟ میں جانتی ہوں تم بہار کی دلہن بنو۔ لیکن کرسمس کی چھٹیوں کے علاوہ تم کہاں فارغ ہو گی شادی کے لیے۔"

"نہیں۔ آپ کہہ رہی ہیں تو میں بہار ہی میں کروں گی۔"

"نہیں۔ کرسمس ٹھیک ہے۔ ہم کرسمس کو بہار کی دلہن بنا دیں گے۔ آج کل میں بس وہ بھی آنے ہی والی ہے ایسے ہی کسی نمونے کو لے کر۔"

امرحہ اور سادھنا نے بلند بانگ قہقہے چھوڑے نمونے کے نام پر۔ لیڈی مہر نے جوش کو رسٹ واچ دی تو بے چارہ نم سا ہو گیا۔ لیڈی مہر نے مور گن پر ایک خائف سی نظر ڈالی۔

"پھر سوچ لو مور گن۔ مجھے تو لگتا ہے یہ ایک دو بار رونے سے ہی یہ پگھل کر ختم ہو جائے گا۔"

اس بار دونوں اتنا ہنسیں کہ انہیں نشست گاہ سے باہر جانا پڑا۔

جس دن سادھنا کو معلوم ہوا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کو ایسی خطرناک بیماری ہو گئی ہے تو دونوں میاں بیوی کئی دن اور راتوں تک روتے رہے۔ اس کا شوہر ایک کمپنی میں چند ہزار پر ملازم تھا۔ وہ اتنی بڑی بیماری کا علاج کیسے کروا سکتے تھے۔ حیدر آباد میں ایک چھوٹا سا گھر ان کا اپنا تھا۔ لیکن اسے بیچ کر بھی ان کے بیٹے کا علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ گھر کو بیچ کر سادھنا کا شوہر یورپ کی طرف نکل جائے اور وہاں کام کرے۔ انہوں نے گھر بیچ دیا لیکن اس کے شوہر کو ویزا نہ ملا۔ ویزا ایجنٹ نے ہی بتایا کہ آدمی کی نسبت عورت کو ویزا ملنے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں تو سادھنا نے ویزے کے لیے اپلائی کیا اور اسے ویزا مل گیا۔ وہ یہاں ایشیائی گھرانوں میں کام کرتی تھی۔

پاکستانی، ہندوستانی، سعودی گھرانوں میں جا کر وہ گھریلو کام کرتی۔ گھریلو کام کے لیے ہر گھر بیٹھنے میں وہ دن اسے بلا نا لو ہی گھنٹے کے حساب سے پیسے ملتے۔ لیڈی مہر کے گھر وہ پہلے کرائے دار تھی۔ پھر لیڈی مہر نے اس کے حوالے سارا گھر کر دیا۔ وہ لیڈی مہر کو بھی دیکھتی اور گھر کو بھی۔ دو سالوں میں اس نے کافی کمایا تھا۔ سنگاپور کے ہسپتال میں آریان کے دو آپریشن ہو چکے تھے۔ ایک آخری آپریشن ہونا تھا۔ پھر تین، تین ماہ کے میڈیکل چیک اپ۔ ڈاکٹرز بہت پرامید تھے۔ آریان کی صحت یابی کے لیے اور ڈاکٹرز سے زیادہ سادھنا خود تھی۔

جن گھروں میں وہ جاتی تھی وہ سب آریان کے لیے الگ سے پیسے دیتے تھے۔ لیڈی مہر بھی ہر آپریشن کے لیے ایک بڑی رقم دیتی تھیں۔

"آپ بہت بہادر ہیں۔" امرحہ کو جس دن ساری کہانی معلوم ہوئی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ہاں۔ میں بہادر ہوں" اسی لیے اللہ نے میرا انتخاب کیا کہ میں اس مشکل کو آسان کروں۔ مجھے اپنے منتخب کیے جانے پر خوشی ہے۔"

"آپ کا بیٹا بہت بڑا انسان بنے گا۔"

"میں اسے بڑا ڈاکٹر بناؤں گی اور اچھا ہی ہوا کہ وہ اس تکلیف سے گزر رہا ہے۔ اس طرح اسے یاد رہے گا کہ تکلیف سے گزرنے والوں کی اس نے کیسے مدد کرنی ہے اور ان سے غفلت نہیں برتنی۔ قدرت کے ہر اقدام میں ایک گہرا راز ہوتا ہے۔ میں کچھ کچھ سمجھ رہی ہوں اس راز کو۔ کچھ سمجھ جاؤں گی۔"

"اگلا آپریشن کب ہے آریان کا؟"

"کچھ ماہ بعد۔ اس سے زیادہ وقت میں بھی ہو سکتا ہے۔" سادھنا نے اطمینان سے کہا۔

امرحہ بہت متاثر تھی سادھنا سے۔ جب وہ پاکستان میں تھی تو خود کو دنیا کی دکھی اور مظلوم ترین لڑکی سمجھتی تھی۔ وہ رات کو پائن ایپل کی پلیٹ بھر کر کھاتی جاتی اور روتی جاتی۔ اسے لگتا دنیا میں اس سے زیادہ مشکل اور مصیبت میں کوئی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تھکن میں

کوئی نہیں رو رہا۔ سب سے زیادہ تکلیفیں اسے ہی مل رہی ہیں۔ اگر انسان دنیا میں چل پھر کر دیکھے تو اسے خبر ہو کہ جس دکھ پر وہ ایسے واویلا مچاتا ہے' دہائی دیتا ہے' وہ تو کوئی دکھ ہے ہی نہیں۔ لوگ تو کیڑے پڑے زخموں کے ساتھ بھی گنگناتے ہیں۔ مسکراتے ہیں اور اصل میں وہی انسان بھی ہیں۔ جو سر کو آسمان کی طرف شکوے کے لیے نہیں شکر کے لیے اٹھاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک گاہک شو اسٹور میں پچھلے ایک گھنٹے سے گھوم پھر رہا تھا۔ لیکن کوئی جوتا اسے پسند نہیں آرہا تھا۔ ہر بار وہ کاؤنٹر کا چکر لگا کر ذرا آگے نکل جاتا اور پھر سے گھوم کر کاؤنٹر کے پاس آجاتا۔ امرحہ گو بہت مصروف تھی۔ لیکن اسے دیکھ بھی رہی تھی۔

"میں تمہیں یہ بتاؤں کہ یہاں اس اسٹور میں جوتوں کی ٹوئیٹ نہیں ملتی۔" امرحہ اس کے پاس آئی۔

"اچھا۔ تم نے انہیں سکھایا نہیں ٹوئیٹ دینا۔"

"تمہیں کیا چاہیے۔ تمہیں کوئی جوتا پسند نہیں آرہا؟"

"جو اچھا ہے وہ مہنگا ہے' جو سستا نہیں۔ وہ اچھا نہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ تم یہاں کسی خریداری کے موڈ میں آئے ہو۔"

"ہاں۔ کچھ کچھ ایسا ہی ہے۔"

"اچھا دیکھو ہمارے اسٹور روم میں کچھ نقص والے جوتے رکھے ہیں۔ ہم ورکرز چاہیں تو انہیں لے سکتے ہیں۔ میں ان سے بات کر لیتی ہوں' تم میرے ساتھ آکر اچھے والے لیکن سستے والے جوتے لے سکتے ہو۔"

"کتنی اچھی ہو تم۔ لیکن آج نہیں۔ شاید کل۔"

"پھر تم آج کیا کرنے آئے تھے یہاں۔"

"آج۔ پتا نہیں۔ میں پتا کر کے کل بتاؤں گا۔" گھڑی کو دیکھتا وہ چلا گیا۔ جیسے مقصد پورا ہو گیا۔

شیشے کے پار سے امرحہ نے اسے جاتے دیکھا۔ وہ "ہاؤ ڈیپ از یور لو" کی دھن سیٹی پر بجا رہا تھا اور ایسے چل رہا تھا جیسے راک اسٹار اپنا کامیاب شو کر کے گھر لوٹ رہا ہو۔

کل وہ پھر آگیا۔ لیکن جوتے لے کر پھر بھی نہیں گیا۔ جب وہ اسے اسٹور روم میں لے گئی اور اس نے اس کا وہاں کافی وقت لے لیا تو عین وقت پر اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو کافی اچھی حالت میں دو' تین اچھے جوڑے بہ جوتوں کے ہیں' پھر وہ نئے کیوں لے۔

"پھر تم یہاں آئے کیوں؟" وہ زچ ہو گئی۔

"پتا نہیں۔ بس کبھی کبھی میری یادداشت ایسے ہی چلی جاتی ہے۔ جب یادداشت گئی تو میں آگیا۔ اب واپس آگئی ہے تو مجھے جانا ہو گا۔"

"پاکستان میں ہم تم جیسے لوگوں کو باؤلا کہتے ہیں۔"

"باؤلا۔ آ۔؟"

"ہاں باؤلا۔ آ۔ چلو جاؤ اب۔ کتنا وقت ضائع کیا میرا۔"

جاتے جاتے وہ پھر رک سا گیا۔ "میرا خیال ہے اگر میں ایک جوڑا جوتا لے ہی لوں گا تو قومی اسمبلی میں اسے یقینا" زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔" وہ پھر سے جوتے پہن پہن کر دیکھتا رہا۔

"ویسے مجھے یہ خیال بھی آرہا ہے کہ ایک اسٹوڈنٹ کو اتنا شاہ خرچ نہیں ہونا چاہیے۔ اوہاں یاد آیا۔ میں نے سنا ہے کہ ایشیا میں لوگوں کے پاس اتنے کپڑے اور جوتے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کپڑے' جوتے دنیا بھر کے انسانوں میں تقسیم کرنے لگیں تو ہر ایک کو دو' دو جوتے اور کپڑے مل جائیں۔ کیا تمہارے پاس بھی اتنے ہی ہیں؟"

وہ گڑبڑا گئی۔ "پتا نہیں۔"

"یعنی اتنے ہی ہیں۔ ہر وقت تم لوگ کپڑوں اور ایسی چیزوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہو اور پھر اصل باتوں پر سوچنے کے لیے دماغ میں اور جگہ ہی

نہیں رہتی۔"

"میرے دماغ میں بھی اور جگہ نہیں رہی' تمہاری اوٹ پٹانگ سی باتیں سن سن کر۔"

کندھے اچکا کر وہ چلا گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور سڑک کو پار کرتے فٹ پاتھ پر چلتے اس نے کم سے کم پانچ بار مڑ کر شیشے کے اس پار کاؤنٹر پر سر جھکائے کمپیوٹر میں بلز کی انٹری کرتے امرحہ کو دیکھا۔

اس بار اس نے سیٹی کی دھن بدل ڈالی۔ وہ ایک مشرقی دھن بجا رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

ویرک آرٹ کا اسٹوڈنٹ تھا اور اس نے ایک مقامی چینل کے لیے دو منٹ کی ڈاکومنٹری بنائی اور ڈبنگ کے لیے امرحہ کو بلایا۔ امرحہ جانتی تھی' وہ اب تک شرمندہ ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ اس کی مدد کرتا ہے۔ دو منٹ کی ڈبنگ کے اسے اچھے خاصے پیسے مل گئے تھے اور کلاس سے زیادہ معلومات بھی۔ صرف ایک کیمرے کے ساتھ ویرک نے ڈاکومنٹری بنائی تھی اور اچھے خاصے پیسے بنا لیے تھے۔ ویرک نے اسے اپنی پہلے سے بنائی گئی دوسری ڈاکومنٹریز بھی دکھائیں۔ اسے وہ سب اچھی لگیں۔ خاص کر ویرک کی کوشش اچھی لگی۔

چند دن سوچنے کے بعد اس نے ویرک سے مشورہ کیا۔ وہ مانچسٹر یونیورسٹی میں ایڈمیشن سے متعلق ایک تفصیلی ڈاکومنٹری بنوانا چاہتی تھی۔ تاکہ پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اچھی طرح سے اپ ڈیٹ رکھا جائے۔ ویرک نے اسے بتایا کہ ڈاکومنٹری کے لیے بھی اسکرپٹ لکھا جاتا ہے۔ پہلے وہ اسکرپٹ لکھے۔ اس نے اپنے لکھے اسکرپٹ اسے دے دیے۔ تاکہ وہ ان سے سیکھ لے۔ انہیں کئی دن پڑھنے کے بعد اس نے پانچ منٹ کا اسکرپٹ لکھ لیا۔ ویرک نے کچھ بنیادی تبدیلیاں کیں اور انہوں نے ایڈمیشن سے متعلق ایک جامع ویڈیو بنالی۔ ویرک نے اس کی انگلش میں ڈبنگ کی اور امرحہ نے اردو میں۔ ویڈیو اس نے پاکستان کے چند ٹی وی چینلز کو بھیج دی اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑا وقت لگا اور جواب آگیا۔ وہ ویڈیو خریدنے کے لیے تیار تھے۔ پر وہ بہت ہی کم پیسے دے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اسے کم پیسوں پر ہی دے دینی چاہیے لیکن ویرک نے روک دیا۔

"کبھی فیصلوں میں اتنی جلدی نہیں کرتے۔ جلد بازی ایک بڑے نقصان کا باعث بے شک نہ بنے لیکن بڑے فائدے سے ضرور محروم کر دیتی ہے۔ میری پہلی ڈاکومنٹری ایک سال میرے پاس پڑی رہی تھی۔ کوئی اسے خریدنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ ٹرائل کے لیے میں نے پھر اسے ایک جرنلسٹ کو دے دیا۔ اس نے اسے اپنی بلاگ پر پوسٹ کر دی۔ بس پھر مت پوچھو۔ جن چینلز نے انکار کیا تھا۔ وہ اس کے رائٹس لینے کے لیے تڑپنے لگے' یہاں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک جنہیں اچھی چیز چاہیے۔ دوسرے جنہیں اچھی بکنے والی چیز چاہیے' جو انہیں فائدہ دے۔ تمہیں ایک سے انکار ہوا ہے۔ تم دوسرے کے پاس جاؤ۔"

ویرک نے ہی اس کے ساتھ مل کر تھوڑی بہت ریسرچ کی اور اس بار انہوں نے ان پاکستانی کمپنیز کو ویڈیو بھیجی جو اسٹوڈنٹ ویزا کا کام کرتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے درجے کی ویزا کمپنی نے ہاں کہہ دی اور نسبتاً "اچھی رقم آفر کی۔ امرحہ نے ہاں کہہ دی۔ یہ ہاں اچھی رہی۔ کیونکہ اسی کمپنی نے چند اور ایک ایک دو منٹ کی ویڈیوز کے لیے امرحہ سے بات کی۔ انہیں مانچسٹر یونیورسٹی کے چند دوسرے ڈیپارٹمنٹس کی تفصیلات چاہیے تھیں۔ جو وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو دکھا سکتے۔ امرحہ اور ویرک نے وہ بھی بنا کر بھیج دیں۔ امرحہ کو اچھا خاصا فائدہ ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو وہ بہت جلد اپنا تھرٹی پرسنٹ کا قرض دائم کے ہاتھ میں تھما دے گی۔

✡ ✡ ✡

اس کی کفایت کا گراف اونچا ہوتا جا رہا تھا اور فضول

خرچی کا نہ ہونے کے برابر۔ سردیاں آچکی تھیں تو اس نے اپنے لیے صرف گرم کوٹ لیے تھے۔ جو وہ پاکستان سے لائی تھی۔ وہ یہاں بے کار تھے۔ یہاں کی سردی اس کی سوچ سے بڑھ کر تھی۔

رات گئے ایک دن دادا کا فون آیا۔ اسے وہ کافی پریشان لگے۔

"پریشان نہ ہونا امرحہ۔ دھیان سے سنو تمہارے بابا اسپتال میں ہیں۔ پوری اعظم مارکیٹ میں آگ لگی تھی۔ بس واجد خود کو سنبھال نہ سکا۔"

"کیا ہوا دادا؟" وہ چلا اٹھی۔

"وہ ٹھیک ہے۔ سینے میں درد ہوا تھا اس کے۔"

"میری بات کروائیں۔"

"ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے۔ تم دعا کرو۔"

وہ کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ کھول کر آسمان تلے آگئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایسے جیسے دنیا کی ہر چیز اسے دباؤ سے مار ڈالے گی۔ سادھنا اس کے پیچھے آئی۔

"پاکستان میں سب ٹھیک ہے امرحہ؟"

"میرے بابا اسپتال میں ہیں۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ "وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

وہ منہ اٹھا کر سادھنا کو دیکھنے لگی۔

"تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ دو دن پہلے تم مجھے کہہ رہی تھیں۔ تم شیر جوان ہو۔"

"میرے اندر گھبراہٹ بڑھ رہی ہے۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔"

"یہ گھبراہٹ نہیں مایوسی ہے۔ جب انسان مایوس ہوتا ہے اس کے اندر ایسے ہی ابال اٹھتے ہیں۔ اسے بے چین کر دیتے ہیں۔ یہ مایوسی ہی ہے۔ ورنہ تم ایسے نکل کر باہر کو نہ بھاگتیں۔ اپنی عبادت کرتیں۔ پہلا کام رونے کا نہ کرتیں دعا کا کرتیں۔ خود کو سنبھالو۔ اپنے گھر والوں کا حال احوال لو۔"

وہ سادھنا کی طرف دنگ سی دیکھتی رہ گئی اور اندر کی طرف لپکی۔ فون کیا اور دادی' اماں سب کو ہی جان لگا کر تسلی دی۔

"گھبرائیں نہیں' وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس کا انداز مضبوط تھا۔

"اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔" اماں رو تی جاتی تھیں۔

"میرے پاس آپ کی مایوسیوں کے جوابات نہیں ہیں۔" دادا اس کی مختلف ڈاکٹرز سے بات کرواتے رہے۔ ٹھیک تین گھنٹے بعد انہیں ہوش آگیا اور دو دن بعد وہ گھر چلے گئے۔

دکانیں جل گئیں۔ جو دو میں پچیس لاکھ کے قالین جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ بابا کے سینے میں تکلیف کیوں نہ اٹھتی۔ کاروبار کے نام پر وہ کنگال ہو چکے تھے۔

پاکستان میں سب بے حد پریشان تھے کہ اب کیا ہو گا اور یہاں مانچسٹر میں وہ تن دہی سے ان معاملات کا حل نکالنے میں مصروف تھی۔ وہ فکر مند ضرور تھی۔ لیکن بوکھلائی یا پریشان نہیں۔

"واجد سود پر قرض لے رہا ہے۔" دادا نے فون پر بتایا۔

"سود پر؟" سے دھچکا لگا۔

"ہاں۔ میری کوئی بات نہیں سن رہا۔ بنا سود کے قرض کہیں سے نہیں مل رہا۔"

"سود حرام ہے دادا۔" اسے دکھ ہوا جان کر۔

"یاد ہے مجھے اور واجد کو بھی یاد دلایا ہے۔ کہتا ہے سود نہیں ہے۔ بس وہ قرض پر منافع لیں گے۔" دادا آبدیدہ ہو گئے۔ "یا وہ گھر بیچے گا یا قرض لے گا۔ ورنہ دکان کیسے چلائے گا۔"

"بابا سے کہیے گا قرض نہ لیں' میں کچھ کرتی ہوں۔"

"تم کیا کرو گی؟" دادا حیران ہوئے۔

"کیوں۔ بہت کچھ کر سکتی ہوں میں۔ جہاں ایک مشکل آتی ہے وہاں دائیں بائیں سو حل آتے ہیں۔ میں دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھتی ہوں حل ضرور کہیں آس پاس ہی ہے۔"

اس نے اب تک کی اپنی جمع کی گئی۔ تنخواہ اور واکو منیز سے ملنے والے پیسے بابا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیے۔ وہ پاکستانی چند لاکھ تھے۔ فی الحال اتنے بھی کافی تھے۔ پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے لیڈی مہر کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

انہوں نے خاموشی سے ایک چیک کاٹ دیا۔ وہ حیران چیک دیکھتی رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ لیڈی مہر اسے مشورہ دیں گی کہ ایسے کرلو یا ویسے کرلو۔ لیکن انہوں نے مناسب رقم کا ایک چیک اسے لکھ دیا۔

"یہ قرض ہے۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

"جی بالکل۔" اس نے سر ہلایا۔

"تمہیں معلوم ہے امرحہ! کہ میں تمہیں اور تم جیسی کئی لڑکیوں کو یہاں مفت بھی رکھ سکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ اگر ایسا کیا میں نے تو تمہیں بے کار اور ناکارہ بنادوں گی۔ میرا ایک بیٹا اسی شہر میں رہتا ہے اور وہ میرے ساتھ نہیں رہتا۔ میں نے اسے کوشش اور مسلسل کوشش کرتے رہنا سکھایا ہے۔ میرے اس آرام دہ گھر کے شاہانہ بستروں پر لیٹے نیند نہیں آتی۔ میں اپنے بچوں کو اس دنیا کے کامیاب ترین انسان بنے دیکھنا چاہتی ہوں اور ایسا انسان بننے کے لیے انہیں ایک شاہانہ نہیں محنت کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ انہیں زیرو ہونا پڑے گا تاکہ وہ زیرو کے آگے اعداد لکھ کر اپنے نمبر بڑھا سکیں۔ میرے بابا ایک کسان تھے۔ اسکاٹ لینڈ میں ان کا اپنا فارم ہاؤس تھا۔ وہ کہا کرتے تھے "محلوں میں زندگی گزارنے والے بدقسمت ترین لوگ ہیں کیونکہ وہ ناکارہ ہیں۔" وہ اپنے مٹی سے اٹے ہاتھ اٹھا کر اعلان کرتے۔ "خوش قسمت تو ہم ہیں۔ کیونکہ ہم کارآمد ہیں۔ زندگی ہم میں سانس لیتی ہے۔ زندگی ہم میں دھڑکتی ہے۔" میں یہ رقم تمہیں ویسے بھی دے سکتی ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت دیا ہے۔ لیکن یہ قرض اس لیے ہے۔ تاکہ اسے واپس کرنے کے لیے تم خود کو کارآمد بناؤ۔ ٹھیک ہے؟"

"جی۔ ٹھیک ہے۔"

اس نے چیک بھی بابا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیا۔ بابا کا فوراً "فون آیا۔

"امرحہ۔ اتنے پیسے۔ کہاں سے آئے اتنے پیسے؟"

"میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے پانچ سو کے ادھار لیے ہیں۔ اور کچھ میرے اپنے جمع کیے گئے ہیں۔"

"تم نے کیسے جمع کیے؟" دادا کے سوا کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں جاب کرتی ہے۔ ایک ' دو بار دادا نے بابا سے کہا کہ امرحہ کو پیسے بھیجنے چاہئیں " تاکہ وہ اپنی چھوٹی بڑی ضروریات پوری کر سکے تو بابا نے چند ہزار پاکستانی دادا کے حوالے کیے کہ اس سے اس کے تین ' چار ماہ آرام سے گزر جائیں گے۔ امرحہ نے وہ پیسے دادا کے پاس ہی رہنے دیے۔

"میں جاب کرتی ہوں بابا۔"

"جاب۔ تم کام کرتی ہو وہاں۔ تم نے تو کبھی پاکستان میں چھوٹی سی بھی جاب نہیں کی۔"

"نہیں کی۔ غلطی کی۔ اب کر رہی ہوں اور بہت خوش ہوں۔ بابا یہاں سب کرتے ہیں۔"

بابا آب دیدہ ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار اس کے لیے "امرحہ! تم اب اتنی سمجھ دار ہو گئیں۔ علی اور حماد کو کھیلنے کودنے سے فرصت نہیں ہے۔ اور تم نے مجھے وہاں سے لاکھوں بھیج دیے۔ میں نے تو تمہیں وہاں جانے کے لیے ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔"

"علی اور حماد کو کھیلنے کودنے سے اس لیے فرصت نہیں ہے بابا کیونکہ آپ نے انہیں کھیل کود میں مصروف رکھا ہے۔ ان پر سختی کریں۔ اگر وہ پڑھنا نہیں چاہتے تو انہیں کوئی ہنر سکھائیں۔ ہم خود ہی تو اپنے بچوں کو ایسی آرام و آسائش کی زندگی دیتے ہیں۔ ہم خود ہی تو انہیں ناکارہ بنا دیتے ہیں۔"

بابا خاموشی سے سنتے رہے۔ "تمہارے دادا نے کہا۔ تم وہاں بڑی کلاس میں پڑھ رہی ہو۔ مجھے یقین آ رہا ہے کہ واقعی تم بڑی کلاس میں پڑھ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں اور کیا کیا کروں؟"

بابا کی یہ بات "مجھے بتاؤ" میں اور کیا کیا کروں" نے اس کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ خوشی سے اس کا برا حال ہو گیا۔

"بابا! پہلے تو سب کو کفایت کی عادت ڈالیں۔ فضول خرچی ترک کر دیں۔ علی اور حماد سے کہا کریں صبح جلدی اٹھا کریں۔ دانیہ سے کہیں کہ وہ ساتھ ساتھ کوئی جاب کرے۔ بابا اپنے ذہن پر کوئی دباؤ نہ رکھیں۔ جو نقصان ہو گیا ہمارا اسی میں فائدہ ہو گا۔ ایک چھوٹا نقصان ہمیں بڑے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ بس یہی کافی ہے۔ آپ بس محنت سے نئے سرے سے اپنا کام کریں اور میری خواہش یہ ہے کہ آپ یتیم خانے کے بچوں کو بلوا کر انہیں دکان میں بٹھا کر کھانا کھلائیں۔"

"میں ضرور جا کر انہیں لاؤں گا اور کھانا کھلاؤں گا۔ ضرور امرحہ۔"

وہ آب دیدہ سی ہو گئی اور بابا سے کہہ نہ سکی کہ یہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ جو اپنی اولاد کو وہ کل پرزے بناتے ہیں جو زندگی کی گاڑی میں شان سے فٹ ہو جاتے ہیں اور گاڑی چھکا چھک دوڑتی چلی جاتی ہے اور اگر والدین ان ہی پرزوں کو کند کر دیں تو زندگی کی گاڑی جام ہو کر بند ہو جاتی ہے اور بہرحال اس کا ذمہ پہلے سربراہ پر آتا ہے' کیونکہ نومولود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

"بس بابا! اپنا خیال رکھیں اور کبھی دل چھوٹا مت کیجئے گا۔"

"میری دکان پھر سے چل نکلی تو میں تمہیں پیسے بھیجا کروں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے بابا۔! میرے پاس میری ضرورت کے لیے کافی پیسے ہوتے ہیں۔"

"تم تھک جاتی ہو گی؟"

"بالکل نہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے سب کرنا۔"

☼ ☼ ☼

کرسمس آنے میں ابھی وقت تھا۔ موسم اس کی سوچ سے زیادہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں وہ ہر

وقت مونگ پھلی کھاتی ہوئی پائی جاتی اور جس تعداد میں اس کی بائے ہیلو ہیلو ہو چکی تھی یونیورسٹی میں اسی حساب سے جتنی مونگ پھلی منہ میں جاتی تھی کیا اس سے کہیں زیادہ دوسروں کے ہاتھوں میں جاتی تھی۔ اب روز کی کلو دو کلو مونگ پھلی تو وہ نہیں لے سکتی تھی نا۔ اس لیے جہاں ذرا سا سناٹا سا دیکھتی منہ میں ڈال لیتی۔ ایک دن ایسا کرتے اسے اپنے پیچھے عالیان کا قہقہہ سنائی دیا۔

"کتنی چالاک ہو تم! کیسے چھپ چھپ کر کھا رہی ہو۔"

"نہیں تو۔" وہ صاف مکر گئی۔

امرحہ انگلش لٹریچر کی اسٹوڈنٹ تھی اور عالیان بزنس کا۔ اور امرحہ تو پھر اپنی عادت کے مطابق پوری یونیورسٹی کا ہفتے میں ایک چکر ضرور لگا لیتی۔ ورنہ حصوں میں تو ضرور ہی چکر کو مکمل کر لیتی۔ لیکن عالیان کم ہی کہیں چلتا پھرتا کھڑا شلتا نظر آتا۔ ہاں، کبھی کبھی وہ ایسے ہو جاتا کہ ہر وقت ہر ایک کو نظر آتا اور کبھی ایسے کہ ہر کوئی اس کا پوچھ رہا ہوتا کہ وہ کہاں ہے۔

اب وہ پھر ایسے اچانک سے نمودار ہوا تو امرحہ تو اچھل گئی۔ اس نے جیب سے مونگ پھلی نکال کر اسے دی اور ساتھ ساتھ وہ اسے بتاتی رہی کہ لاہور میں مونگ پھلی کیسے بکتی ہے۔ کیسے اسے گرم کیا جاتا ہے۔ کیسے ہیٹر کے پاس بیٹھ کر اسے کھایا جاتا ہے۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ بچپن میں وہ مونگ پھلی کے چھلکوں کے ڈھیر کو چیکے چیکے کھنگالا کرتی تھی کہ اس میں سے اسے کوئی مونگ پھلی مل ہی جائے۔ عالیان دیر تک ہنستا رہا۔

"میں یقین کرتا ہوں۔۔۔ مجھے یقین ہے تم نے یہی کیا ہوگا۔"

وہ ہنستا رہا۔ پھر اپنی انگلی کی پور سے اپنی آنکھ کی نمی صاف کی اور اپنے کراس بیگ میں اس سے مونگ پھلی بھروا کر اپنی کلاس لینے چلا گیا اور پھر وہ اسے ایک ایسے وقت نظر آیا کہ اس نے حیرت سے کتاب بند کر دی۔ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے ذرا دور گھر کے دوسرے کنارے کی طرف اسے وہ نظر آیا۔ پہلے اس نے سر کو اٹھا کر جیسے سارے گھر کا بھرپور جائزہ لیا۔ پھر وہ ایک کھڑکی کی طرف بڑھا۔ امرحہ نے جھٹ اپنے کمرے کی بتی بجھا دی اور کھڑکی سے سر نکال کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کھڑکی سے اچھل اچھل کر اندر جھانک رہا تھا۔ پھر اس نے یہی کام دوسری کھڑکیوں کے ساتھ کیا۔ پھر وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑا ہو کر پائپ کا سہارا لے کر اوپر کی منزل کے ایک بیڈ روم کی کھڑکی میں جھانکنے لگا۔ امرحہ کا حیرت سے برا حال تھا۔ وہ اتنی مشاقی سے یہ سب کر رہا تھا جیسے اسپائیڈر مین ہو اور ایک عرصے سے ایسے کرتب کرتا رہا ہو۔ پھر وہ اس کھڑکی سے زمین پہ کود آیا اور ٹہلنے سا لگا۔ امرحہ نے سر کو ذرا پیچھے کر لیا۔ اب وہ اسی کھڑکی کے پاس آ رہا تھا۔ امرحہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ اسی کی کھڑکی کے نیچے کھڑا تھا۔ اب وہ کھڑکی بھی بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے چند منٹ انتظار کیا اور کھڑکی سے نیچے جھانکنے کے لیے آگے ہوئی اور اس کی چیخ نکل گئی۔ عالیان ایک دم سے اس کے سامنے آیا۔۔۔ وہ کھڑکی پر چڑھ چکا تھا۔

"امرحہ۔!" عالیان نے سرگوشی سی کی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



ناولٹ

"کتنی عجیب بات ہے۔" اس کی پوری بات تفصیل سے سننے کے بعد ناسف سے سرہلاتے ہوئے میں محض اتنا ہی کہہ سکا۔ اگرچہ کہنے کو دل میں بہت کچھ ابل رہا تھا۔

"اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب میں نے اپنا پرس کھولا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں میری لپ اسٹک' فیس پاؤڈر' ہیئر اور سیل فون کے علاوہ ایک سکہ تک نہیں۔ کریڈٹ کارڈ تک میں لے جانا بھول گئی تھی۔ اف! فاخر۔ میرے تو بالو شرمندگی سے پسینے چھوٹ گئے۔" اس وقت کے

کوشش کی اور پھر جیسے اچھل پڑی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ کیا تم نے اس کی جیبیں ٹٹول کر دیکھی تھیں۔ نہیں نا۔ اس نے بھی یہی سوچا ہوگا۔ اس لیے جو جی میں آیا بول دیا۔ کیونکہ اسے پتا ہے تم آنکھیں بند کرکے یقین کرلوگی۔"

"اگر وہ اتنا ہی گھٹیا ہوتا تو کبھی اپنی مہنگی رسٹ واچ اتار کر نہ دیتا۔" وہ تنک کر بول اٹھی۔

"تو اس کے پاس اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔

عائشہ نصیر احمد



شرمندگی کے اثرات میں ابھی بھی اس کے چہرے پر دیکھ سکتا تھا۔

"تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو۔ شرمندہ تو اسے ہونا چاہیے تھا۔ لڑکی کو لنچ پر لے جارہا ہے اور جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ یعنی کہ حد ہے کنگلے پن کی۔" ایک ضبط مسلسل سے بیٹھ کر اس کی کہانی سنتے سنتے مجھے اس کی آخری بات پر غصہ ہونا ہی پڑا۔ وہ ٹھٹک کر میری صورت دیکھنے لگی۔

"اس کا کیا قصور فاخر۔ اس کی تو جیب کٹ گئی تھی۔" اس نے پھر سے مجھے یاد دلایا۔

"مجھے تو اس بات میں بھی شک ہے۔" میں نے یقین سے کہا۔ اس نے چند لمحے میری بات سمجھنے کی

اینڈ لیٹ می ریمائنڈ یو کہ یہ واچ بھی اسے تم ہی نے گفٹ کی تھی۔" میں بڑی کوشش کر رہا تھا۔ اس خبیث انسان کے لیے ہالہ کے سامنے میرے منہ سے کوئی گالی نہ نکلے۔ مگر اس کے باوجود میں اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں رکھ پایا اور وہ بگڑتے تیوروں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"فاخر۔ بس بھی کرو۔ تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم کیا بول رہے ہو۔ یقیناً" تم میرے پیٹھ پیچھے میرے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہو گے۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں نا کہ ہر بار اپنی اتنی پرسنل باتیں تم سے شیئر کرنے لگ جاتی ہوں۔" اس نے انتہائی غصے سے کرسی سے لٹکا اپنا پرس کھینچا۔

"اور اس سے بڑا پاگل میں ہوں جو بیٹھ کر تمہاری باتیں سنتا ہوں۔" میں نے بھی کوئی لحاظ نہ رکھا۔

"تو مت سنو نا۔ کس نے کہا ہے سننے کے لیے اور اب تو میں تم سے یہ باتیں کروں گی ہی نہیں۔ بلکہ میں تم سے بالکل ہی کوئی بات نہیں کروں گی۔" ٹیبل پر رکھا سیل فون اٹھاتے ہوئے اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور اپنی اونچی ہیل کی سینڈل سے کھٹ کھٹ کرتی میری نظروں سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر بالوں میں ہاتھ پھنسائے۔

مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ ناراض ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کی ناراضی مجھ سے زیادہ دیر نہیں چلتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس مسٹر فراڈیے کے ساتھ واقعی سیریس ہو رہی تھی۔ یہ بھی اپنے طرز کی ایک انوکھی اور عجیب غریب ہی کہانی تھی۔ میں کسی اور سے سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ مگر فی الحال یہ میری اپنی ہی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کردار بننے پر مجبور تھا۔

اور اس وقت جب میں ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آیا تو میرے سیل نے مجھے کسی کال کی اطلاع دی۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کی ناراضی پانچ منٹ بھی نہیں چلی تھی۔

"کہاں ہو تم؟" اس کی پریشان سی آواز ابھری۔

"جہاں تم چھوڑ کر گئی تھیں۔" جواب دیتے ہوئے مجھے تھوڑی حیرت بھی ہوئی اور آس پاس بھی نظر دوڑائی۔

"اوکے۔ آکر مجھے پک کرلو۔ میں یہیں ہوں مطلب۔ اس سڑک پر سیدھے۔ ذرا آگے آؤ گے تو۔ میں رکشے میں بیٹھ گئی تھی۔ مگر بیٹھنے کے بعد اسے پیسوں کا معاملہ طے کرنے کا خیال آیا۔ اس پر ہمارا جھگڑا ہوا اور وہ مجھے بیچ سڑک پر اتار کر چلا گیا۔" اس کا شرمندہ سا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

"تو تم سے کس نے کہا تھا اتنی ضد دکھانے کو۔"

میں نے بروقت خود کو یہ کہنے سے روکا۔ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ ریسٹورنٹ میں بھی وہ میرے ساتھ آئی تھی۔ پھر یوں ناراض ہو کر بنا سوچے سمجھے جانے کا تو یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

"اچھا۔ میں آرہا ہوں۔" اسے تسلی دے کر میں فون بند کر کے گاڑی میں آبیٹھا۔ میرے بغیر اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا اور شادی وہ اس فراڈیے سے کرنا چاہتی تھی۔ خیر میں نے بھی سوچ لیا تھا۔ جب تک اس نوٹلی باز کا پورا بائیو ڈیٹا معلوم نہ کرلوں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میری اچھی بھلی زندگی میں کسی تھرڈ کلاس ڈرامے کے بدترین ٹوئسٹ کی طرح آنے والے اس رقیب کا خاتمہ اب میرے ہی ہاتھوں ہونا تھا، یہ طے ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ میرے آفس میں کام کرتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ میں اس کے آفس میں کام کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کمپنی کے مالک کی بھتیجی تھی۔ شوقیہ جاب کرتی تھی۔ جیسے اس جیسے نوے فیصد اپر کلاس لڑکے لڑکیاں کیا کرتے تھے۔ تایا اس کے لیے اور اس کے لیے ان کے باپ، تایا، چچا اور ماموں کے آفسز کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

اگرچہ وہ میری اسسٹنٹ تھی۔ مگر ہمارے درمیان رعب و تکلف والا کوئی رشتہ نہ تھا اور وجہ صاف ظاہر ہے۔ پھر وہ خود بھی بہت دوستانہ مزاج کی تھی اور بہت جلد گھل مل جانے والوں میں سے تھی اور۔ میں تو ویسے بھی دن کا آدھا حصہ اسی کے ساتھ گزرتا تھا۔ یوں مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کب اس کا دوست کم پکی سہیلی بن گیا اور وہ مجھ سے ہر وہ بات کرنے لگی جو وہ اپنی کسی بھی لڑکی دوست سے کر سکتی تھی۔ غیبتیں، چغلیاں ادھر ادھر کی ڈھیر ساری گوسپ۔ پریشانی مجھے تب ہوئی جب اس کی گفتگو میں کسی برائن کا تذکرہ تواتر سے ہونے لگا۔ برائن نے یہ کیا، برائن نے وہ کیا۔

برائن ایسا ہے' برائن ویسا ہے' ایک بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اسے اپنے لیے کیسا لڑکا چاہیے؟

"تال۔ ڈارک اینڈ ہینڈسم۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور میں اندر سے بجھ سا گیا۔ یعنی وہ میرے منہ پر مجھے ریجیکٹ کررہی تھی۔ کیونکہ نہ تو میں اتنا تال تھا اور نہ اتنا ڈارک "تھا" خالی ہینڈسم سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ڈھیٹ بن کے دوبارہ پوچھا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا۔ تال اور ڈارک سے کم پر معاملہ طے نہیں ہوسکتا۔" میرا انداز اس سیلز مین جیسا تھا جو کسی گاہک کو اس کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی کی چیز خریدنے پر مجبور کررہا ہو۔

"بالکل نہیں۔ اگر مجھے برائن لارا نہیں مل سکتا تو کم از کم برائن لارا جیسا تو کوئی ہو۔" اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ ہالہ بھی ان پاگل اور سرپھری لڑکیوں میں سے ایک ہے جو کسی بھی انٹرنیشنل اسٹار کو اپنا آئیڈیل بنا سکتی ہیں اور پھر اسی طرح کی بے وقوفیاں کرتی پھرتی ہیں۔ ہالہ کررہی تھی۔ وہ برائن جو کوئی بھی تھا اسے فیس بک پر اسی نام سے ملا تھا اور ہالہ صرف اس کے نام پر ہی ریجھ گئی اور میں جو اس کی محبت میں کریں کرکٹر بھی بننے کو تیار تھا۔ صرف دیکھتا رہ گیا۔

ان کا یہ تعلق بہت تیزی سے آگے بڑھا تھا اور یہ دونوں فیس بک کے علاوہ فیس ٹو فیس بھی ملنے لگے تھے اور ہر ملاقات کا احوال اپنی جزئیات سمیت میرے علم میں بھی بنا کسی تعطل کے آتا رہا۔ اس کے بیان کردہ

اس براہن کی باتوں اور حرکتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ فلرٹ اور فراڈ شخص ہے۔ مگر ہالہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ میرے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ہالہ اتنی بونگی اور بے وقوف لڑکی تھی کہ اسے کوئی بھی آسانی سے دھوکا دے سکتا تھا۔ یہ میری ہی قسمت تھی کہ جذبے کھرے اور نیت صاف رکھنے کے باوجود میں اسے اپنے سچے پیار کی قدر

بلکہ خبر بھی نہیں کروا پایا تھا اور اب تو بات ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔

مجھے جلد ہی کچھ کرنا تھا' مگر کیسے؟ پہلے میں اس سوال کا جواب ڈھونڈ لیتا۔ بہرحال وہ مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ یہ خالصتاً" فلمی ولنوں والی بڑھک تھی' مگر میرے ارادوں کی مضبوطی ظاہر کرنے کے لیے بہترین تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! یہ کیا ہے؟" اسے دیکھ کر اگر میں اچھل نہیں پڑا تو یہ میرے ضبط کی اعلا ترین مثال تھی۔

"بجلی کا بل ہے۔" انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دے کر ٹیبل سے چائے کے برتن سمیٹنے شروع کر دیے۔

"یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔ مگر اتنا زیادہ۔" اسے دیکھ دیکھ کر میرا فشار خون بلند ہونے لگا۔

"ہاں۔ اس میں پچھلے ماہ کا بل بھی شامل ہے۔" بنا پلٹے ہی جواب دے کر وہ کچن کی سمت بڑھ گئیں۔

"مگر کیوں۔ پچھلے ماہ تو بل جمع کروایا تھا نا؟" میں بھی انہیں کراس کے پیچھے چلا آیا۔

"اف فاخر۔ کتنی جلدی باتیں بھول جاتے ہو تم۔ پچھلے ماہ کی بات ہے۔ پچھلے سال کی تو نہیں' جب ولید بل کے پیسوں کے ساتھ ساتھ اپنا موبائل بھی لٹا کر گھر آگیا تھا۔"

انہوں نے میری یادداشت پر ماتم کرتے ہوئے مجھے یاد دلایا۔ میں ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ واقعی میں کیسے بھول گیا۔ جب پیسوں اور موبائل پر لعنت بھیجتے ہوئے ہم نے ولید کے صحیح سلامت آنے پر شکر ادا کیا تھا۔ جبکہ ولید کئی دن اداس رہا تھا۔ اپنے مہنگے موبائل فون کے لیے جو اس کی تیسویں سالگرہ پر میں نے اسے گفٹ کیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ صبح آفس جاتے ہوئے جمع کروا دوں گا۔" میں

نے ڈوبتے دل سے ایک نگاہ اس رقم پر ڈالی۔ ہالے کی برتھ ڈے آنے والی تھی اور میں اسے کوئی اچھا اور قیمتی گفٹ دینے کا سوچ رہا تھا۔ مگر اب لگ رہا تھا کسی سستے گفٹ پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ پتا نہیں وہ بیوٹی پارلر کا بچا اسے کیا دے گا اور کچھ دے گا بھی کہ نہیں۔

"فاخر!" امی کی آواز نے مجھے چونکایا۔ "آج کل ولید کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں۔ کیا ہوا اسے؟" میں حیران ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگا۔

"اسے کیا ہونا ہے۔ اسے تو بلکہ اور بھی ڈھیل مل گئی ہے۔ جب سے اس کا موبائل چھنا ہے۔ میں تو عاجز آ گئی ہوں۔ یوں لگ رہا ہے۔ جیسے اسے اسی موقع کی تلاش تھی۔ سارا سارا دن آوارہ گردیاں کرتا پھرتا ہے۔ صبح کا گیا رات کو شکل دکھاتا ہے۔ موبائل ہے نہیں' تاکہ کوئی خیر خبر ہی رکھ سکوں۔ کتنی بار کہا تم سے۔ اسے کوئی سستا سا فون دلا دو مگر نہیں۔" وہ برہم سا لہجہ لیے بولتی چلی گئیں۔

"امی! آپ بھول رہی ہیں۔ میں کئی بار اس سے کہہ چکا ہوں۔ مگر اسے اسمارٹ فون چاہیے سستا والا نہیں۔ دوستوں میں بیٹھ کر شو آف کرنے کے لیے وہ میری جیب کا کباڑا کر دیتا ہے۔ مگر ان دنوں میں ایسا خرچا برداشت کرنے کا ابھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے چاہیے تو میرا فون لے لے۔ تین' چار ماہ بعد میں اس کی پسند کا سیل فون لے دوں گا۔"

مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی غصہ آ گیا۔ اگرچہ میں جانتا تھا وہ ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ کچھ دن پہلے ہی اس نے کہا تھا۔ گھر والوں کی چیک پل کی روک ٹوک سے دور رہنا ہے تو موبائل فون سے دور رہو۔

"خیر۔ آج اسے آنے دیں۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔" انہیں تسلی دے کر میں لاؤنج میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ولید کی آمد ہوئی۔

"ہائے برو۔ آج تو بڑی جلدی گھر آ گئے۔" دروازے اور صوفے کا درمیانی فاصلہ ایک جست میں پھلانگ کر وہ میرے قریب آ بیٹھا۔ جو بیس کا ہونے والا تھا۔ مگر حرکتیں سولہ' سترہ سال کے کسی ٹین ایجر سے کم نہیں تھیں۔ اس کے پاس سے اٹھتی دل فریب سی مہک نے میرے اندر تک ناگواری کی لہر دوڑا دی۔

"یہ بات تو مجھے تم سے پوچھنی چاہیے۔ کہاں ہوتے ہو سارا سارا دن۔ فون بھی نہیں رکھتے اور یہ پرفیوم۔ کیا پوری بوتل انڈیل کر آئے ہو خود پر۔" "یہ خوشبو مجھے حقیقتاً" اچھی لگی تھی۔ اسی لیے ایک گہری سانس لے کر دوبارہ سانسوں میں اتاری۔

"ہاں۔ واقعی۔ پوری نہیں تو آدھی تو ضرور ہی انڈیلی تھی۔ دوست کی تھی نا۔ اپنی ہوتی تو صرف چھینٹیں مار کر کام چلاتا۔ آپ کو اچھی لگی کیا۔"

"کیوں؟" اس نے جس سادگی سے پوچھا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"تم اتنے قابل ہوتے تو میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوتا۔" اس بھونڈے مذاق پر میرا جی چاہا میں اسے ناک آؤٹ کر دوں۔ اس کا بے اختیار سا قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاں۔ تیرے بیٹے کو نوکری مل گئی ہے۔ اب تجھے کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کے چٹپٹے ڈائیلاگ سے وہ میرا جی مزید جلا گیا۔

"بھائی! میں نے کب کہا کہ میں کسی شاپ سے لا کر دے رہا ہوں۔ میں نے تو عدیل سے لانے کی بات کی تھی۔" وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"ایک نمبر کا کمینہ اور ڈھیٹ انسان ہے تو۔ کیسے دوست ہیں تیرے جو تجھے اتنی بے دردی سے اپنی چیزیں برباد کرنے دیتے ہیں۔" میں اسے گھور رہا تھا۔

"آپ ہوں گے اپنی چیزوں کے معاملے میں کنجوس۔ ہم دوستوں میں کوئی تیرا' میرا نہیں ہے۔

سنا نہیں آپ نے۔ پکی یاری سب پہ بھاری محبتوں میں حساب کیسا۔" شرارت سے مسکراتے ہوئے اس نے دونوں بازو پھیلا کر انگڑائی لی۔

"تو ایسا کرو۔ اپنے ان ہی دوستوں میں سے کسی کے

موبائل پر امی کو اپنے آنے جانے کی اطلاع بھی دے دیا کرو۔ وہ پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ تمہیں کوئی شرم ہے یا نہیں۔" ذمہ داری تو بڑی بات تھی۔ وہ تو بھی سنجیدگی کو بھی پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔

"آپ نے کبھی غور کیا ہے بھائی۔ پرانے زمانے کے لوگ اتنے بڑے بڑے کام کیسے کر گئے؟" اس نے جس انداز میں پوچھا تھا میں حیران ہو گیا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"کیونکہ اس زمانے میں موبائل نہیں تھا۔ آج کل کے نوجوانوں کو تو موبائل سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں وہ کیا خاک اپنا حصہ ڈالیں گے۔"

"کیا بات ہے۔ پچھلے ایک مہینے سے تو تو بھی اپنے موبائل سے فارغ ہی ہے نا۔ کون سا کشمیر آزاد کرا لیا تو نے۔" میں سلگ اٹھا اس کی بے تکی بات پر۔ "دیکھ ولید۔ بہت ہو گئی تیری مسخری۔ میرا موبائل اٹھا اور اسے اپنے پاس رکھ۔"

"واہ بھائی ہو تو ایسا۔ مگر ایک مسئلہ ہے بھائی۔ اس پر آپ کے فرینڈز اور خاص الخاص فرینڈز کے فون بھی آئیں گے تو میں ان کا کیا کروں گا۔" وہ بھولپن سے پوچھنے لگا۔

"گدھے۔ اس میں اپنی سم رکھ۔" میں نے دانت پیسے۔

"مگر میری سم تو موبائل کے ساتھ ہی گئی۔ خیر آپ وہ سب چھوڑیں۔ مجھے چار ہزار دیں۔ میں خود ہی اپنے لیے کوئی سستا سا سیٹ خرید لیتا ہوں۔" کیا شان بے نیازی تھی۔ میں نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔

"چار ہزار اور سستا۔ آج کل چار ہزار میں اچھا خاصا فون آجاتا ہے۔"

"مگر مجھے چائنا مال نہیں چاہیے۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

"کیوں۔ چائنا تو ہمارا بہترین دوست ہے اور تھوڑی دیر پہلے تو خود ہی تو کہہ رہا تھا۔ پکی یاری میں حساب کیسا۔ اگر عدیل اپنی الیکٹرونکس کی دکان چھوڑ کر مٹھائیوں کی دکان کھول لے تو کیا تو رس گلوں کے لیے تب بھی رمضان حلوائی کے پاس ہی جایا کرے گا۔" میں نے اس کی بات اسے لوٹائی تھی۔ اس کا منہ بن گیا۔

"بھائی! آپ کہاں کی بات کہاں لے کے جا رہے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ چار نہ سہی تین ہزار ہی دے دیجئے۔ میں اسی سے کام چلا لوں گا۔" میں بغور اسے دیکھنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا اسے واقعی پیسوں کی ضرورت تھی۔ جو وہ اس بہانے مجھ سے نکلوانا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر اگلے چھ ماہ تک۔ تم دوبارہ مجھ سے موبائل کے لیے یا کسی رقم کی کوئی ڈیمانڈ نہیں کرو گے۔"

اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو الجھن ابھری پھر بے تابی سے بولا۔ "اور چھ ماہ بعد؟"

"تمہاری نوکری لگ چکی ہو گی۔ پھر تم اپنی کمائی سے اپنے لیے جیسے چاہو فونز خریدو۔"

"تو یوں کہیے نا۔ مجھے اپنی ساری زندگی اسی موبائل کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔" بے دلی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تجھ جیسا ڈھیٹ انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" والٹ نکالتے ہوئے میں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"کیا خیال ہے۔ گنیز بک میں نام آسکتا ہے۔" جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے وہ ذرا آگے کو جھکا۔

"تیرا نہیں میرا آنا چاہیے جو تجھے برداشت کرتا ہوں۔" تپ کر کہتے ہوئے میں نے ہزار ہزار کے چار نوٹ اس کی طرف پھینکے۔ وہ حیران ہوا۔

"رکھ لے۔ کیا یاد کرے گا تو بھی۔" میرے یہ کہتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"واہ بھائی میرے۔ جگ جگ جیو۔" نوٹوں کو جیب میں ٹھونستے ہوئے اس نے پرجوش ہو کر نعرہ

لگایا۔

"شام تک تیرے پاس موبائل آجانا چاہیے۔" میں نے اسے جاتے دیکھ کر ہانک لگائی۔

"بے فکر رہیں' ایسا ہی ہو گا۔" وہ بڑی جلدی میں نکلا تھا۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔

وہ حد سے زیادہ کھلنڈرا تھا۔ کچھ اس نے طبیعت ایسی پائی تھی۔ کچھ میری بے جا ڈھیل نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ پھر اس کی یہ عمر فکریں اور ذمہ داریاں اٹھانے والی تھی بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عمر میں جو کچھ میں نے سہا تھا وہی سب ولید بھی برداشت کرے۔ بابا کی وفات کے بعد بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میں نے وقت سے پہلے ہی بہت سی ذمہ داریاں اور پریشانیاں اپنے کاندھوں پر لے لی تھیں۔ میری تو مجبوری تھی مگر ولید کا تو بڑا بھائی موجود تھا اور ویسے بھی یہ کچھ ہی عرصے کی بات تھی۔ اس کا ماسٹرز کمپلیٹ ہو جاتا تو میں اپنے ہی آفس میں اس کی جاب کا بندوبست کرنے والا تھا اور یہ میں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جو پوسٹ میرے پاس تھی' آفس میں اپنے بھائی کو نہ پہنچاتا تو اور کسے پہنچاتا۔

☼ ☼ ☼

"میں اندر آجاؤں؟" "تشریف" اندر گھس کر اجازت مانگ رہی تھی۔ میں نے فائل بند کر کے اس کی سمت دیکھا۔

"تم اندر آچکی ہو۔"

"ہاں۔ تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اجازت مانگ کر آیا جائے یا آکر اجازت مانگی جائے۔" چکنے فرش پر اس کی ہیل کی ٹک ٹک نے میرے دماغ پر ہتھوڑے برسائے۔ ایک یہ ہی چیز تھی اس کی جس سے میں بے زاری کی حد تک چڑتا تھا۔ اچھی خاصی قد و قامت رکھنے کے باوجود اسے نجانے ہیل والی سینڈل پہننے کا کیا خبط تھا۔

"تمہارے چاچو کا آفس نہ ہو تو تمہیں پتا چل جاتا کہ اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے اور تم سے کتنی بار کہا ہے یہ ہیل والے جوتے پہن کر آفس مت آیا کرو۔" میں کبھی کبھی اسے یہ جتانے پر مجبور ہو ہی جاتا تھا کہ میں اس کا باس ہوں۔ یہ الگ بات کہ وہ میری یہ بات ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کی طرح اڑا دیتی تھی۔

"چھوڑو بھی۔ زیادہ بے تکلف مت بنو۔ اب کیا تم آفس میں بھی مجھ سے اسکول والے رولز فالو کرواؤ گے۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے وہ میرے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے۔ آج ڈیٹ کیا ہے۔" سبز رنگ کے سوٹ میں کھلی کھلی رنگت لیے وہ میز پر ذرا جھک کر چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی میں الجھ گیا۔

"کوئی خاص تاریخ ہے؟" ایک نگاہ کیلنڈر پر ڈالتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری سالگرہ تو نہیں ہے۔" اس کی ڈیٹ تک یہ تو مجھے پتا تھی۔ اس کے باوجود میں نے بونق بن کر یہ پوچھ لیا۔

"نہیں بھئی۔ آج چودہ فروری ہے۔" اس کا بے تاب سا لہجہ چھلکا تھا۔

"تو۔ کیا ہوتا ہے چودہ فروری کو؟ کہیں اس بوائن کی برتھ ڈے تو نہیں؟" مجھے یکا یک ہی خیال آیا تو میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"اف فاخر! کتنے فضول ہو تم۔" وہ جھنجلا گئی۔ "چودہ فروری مطلب ویلن ٹائن ڈے۔"

"اچھا۔ تو وہ ویلن ٹائن ڈے چودہ فروری کو ہوتا ہے۔" میں نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

"تم مذاق کر رہے ہو نا؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"دراصل میں نے منائی نہیں کبھی۔" میں نے بے زاری سے کندھے اچکائے۔

"تمہاری کوئی ویلن ٹائن ہو گی تو تم یہ دن مناؤ گے نا۔" طنز سے کہتے ہوئے اس نے ابرو چڑھائے۔

"تم کس بات کرنے کے لیے آئی تھیں؟"

"نہیں۔۔۔ بتانے تو کچھ اور آئی تھی۔ مگر کیا فائدہ۔۔۔ جب تمہیں اس بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے تو۔۔۔" جھلاہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی ٹیبل پر جاؤ اور مجھے بھی میرا کام کرنے دو۔ میں فارغ نہیں ہوں۔" دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے رکھائی سے کہا تو اس کے چہرے پر خفت چھا گئی۔

"تم۔۔۔ تم انتہائی سڑیل مزاج آدمی ہو۔ تم دیکھنا۔۔۔ تمہیں کبھی کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔" غصے سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تب ہی میری نظر اس گلاب پر پڑی۔

"کیا تم یہ پھول میرے لائی تھیں؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے جلدی سے وہ پھول اٹھالیا۔ گویا میں اسے جھپٹ ہی لیتا۔

"یہ مجھے برائن نے دیا۔۔۔ یو نو واٹ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے ویلنٹائن ڈے وش کیا۔" اس کا جوش دیدنی تھا۔

"تو صرف یہ ایک پھول۔۔۔" میں اپنے لہجے کا استہزا چھپا نہیں پایا۔

"ہاں تو۔۔۔ کیا پوری نرسری میرے نام کر دیتا۔ میرے لیے یہ ایک پھول ہی کافی ہے۔ جو وہ اپنے گھر کے باغیچے سے صرف اور صرف میرے لیے توڑ کر لایا۔" اترا کر کہتے ہوئے وہ اس پیارے سے گلاب کو پوروں سے سہلانے لگی۔

"ہمارا آفس اس کے راستے میں پڑتا ہے۔ صبح ہی صبح میرے آنے سے بھی پہلے وہ یہ پھول لے کر آفس کے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو حیران ہو گئی۔ اس نے پہلے سے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں۔ ایک تو جب سے اس کا موبائل چھنا ہے، یہ بڑی مصیبت ہو گئی ہے۔"

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا؟" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔۔۔ "اس کا موبائل چھن گیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اسی وجہ سے تو ہم آج کل آن لائن چیٹ کرتے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ اس کا برتھ ڈے تو ابھی بہت دور ہے۔ کیوں نہ آج کے دن کے بہانے میں اسے ایک اچھا موبائل گفٹ کر دوں۔" پرسوچ لہجے میں کہتے ہوئے وہ تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی اور میں سناٹے میں آگیا۔

"ہالہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔" شرٹس، پرفیوم، گھڑی سے بات اب موبائل تک آگئی تھی۔ میں بے یقینی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔ کیا ہم اپنے فرینڈز کو گفٹس نہیں دیتے۔ میں بھی ایز آ فرینڈ اسے یہ گفٹ دوں گی او کے۔" دبے لہجے میں ایک کمزور سی دلیل دے۔۔۔ کر وہ مزید رکے بغیر باہر گئی۔ مبادا میں کچھ اور نہ کہہ دوں۔ میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ یہ بات اب حد سے بڑھ رہی تھی۔ مگر میں کیا کرتا۔ کیا صدیقی صاحب سے بات کرتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ تو نری حماقت ہوتی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیسے بچاؤں اس کمینے کا جو نہایت دھڑلے سے ایک لڑکی سے مال سمیٹ رہا تھا۔

ایسے لڑکے تو بہت دیکھے تھے جو خوشی خوشی اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں لٹتے تھے۔ مگر یہ۔۔۔ اس نے بے غیرتی کی انتہا کر دی تھی اور میری بے بسی کی انتہا تھی کہ میں اس کے لیے نت نئی گالیاں ایجاد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تو آخر۔۔۔ تم نے کیا سوچا؟"

شام کی چائے امی کو لان میں لانے کا کہہ کر میں خود بھی باہر چلا آیا تھا اور اس وقت جب میں گلاب کے پودے کے پاس الجھا ہوا کھڑا تھا۔ امی نے آکر جس طرح بات شروع کی۔۔۔ مجھے چونکنا ہی تھا۔

"صبح جب میں جا رہا تھا تو اس میں لاتعداد منہ بند کلیاں تھیں۔ اب ایک بھی نہیں۔" میں ان کے سوال کا مقصد تو نہیں سمجھا مگر اپنی سوچ ضرور بتادی۔ ان کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھری۔

"مجھے کیا پتا۔۔۔ کہاں گئیں کلیاں۔۔۔ میں کیا سارا

دن چوکیداری کرتی رہتی ہوں۔ تم مجھے میرے سوال کا جواب دو۔"

"کون سا سوال۔۔؟" مجھے ان کی برہمی پر حیرانی ہوئی۔

"سبرین کے دو' تین اچھے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ سعید بھائی تو ایک کے بارے میں سنجیدہ بھی ہوگئے ہیں۔ آپا کو جلد از جلد جواب چاہیے۔ پہلے ہی تمہاری اس ٹال مٹول نے انہیں خاصا برگشتہ کردیا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ سبرین کی بات کہیں پکی کردیں۔" ان کے لہجے میں اندیشے آسمائے۔ میں نے ایک نظر ان کے متفکر چہرے پر ڈالی۔

"تو کردیں۔۔ آپ کیوں پریشان ہورہی ہیں۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک ڈال جھکائی۔ وہ بھی خالی۔ اف۔۔ کہاں گئیں وہ ساری کلیاں۔۔ میرا پارہ پھر سے چڑھنے لگا۔

"تو آخر۔۔ تمہیں شادی کرنی ہے یا نہیں۔" "نہیں" یقیناً" میری بے نیازی پر غصہ آگیا تھا۔ "تیس سال کے ہوگئے ہو۔ کب تک کنوارے بیٹھو گے۔ اپنا نہیں تو میرا ہی کچھ خیال کرلو۔"

"کیا ہوگیا ہے امی۔۔ کرلوں گا شادی بھی۔۔ مگر ابھی نہیں۔ آمنہ خالہ کو جلدی ہے تو وہ جہاں چاہیں سبرین کا رشتہ طے کرسکتی ہیں۔۔ انہیں مزید انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے آج بات صاف کرنے کا فیصلہ کرہی لیا۔ ان کی آنکھوں میں تاسف و بے یقینی منجمد ہوگئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ پہلے دن سے میں آپ سے کہہ رہا ہوں' مجھے سبرین میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ مگر آپ مان ہی نہیں رہیں۔ الٹا خالہ کو بھی فضول میں آپ نے اتنا عرصہ امید دلائے رکھی۔ اب ان تک میرا انکار پہنچائیں گی تو انہیں کتنا برا لگے گا۔ یہ سب صرف آپ کی غلطی ہے۔" جھنجلا کر کہتے ہوئے میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔۔ تو تم نے کون سا مجھے صاف انکار کردیا تھا۔ یہی کہتے رہے کہ ابھی شادی نہیں کرنی۔ ابھی شادی نہیں کرنی۔ اگر اسی وقت کہہ دیتے کہ سبرین سے ہی شادی نہیں کرنی تو میں کیوں انہیں لٹکائے رکھتی اور اب الزام میرے سر تھوپ رہے ہو۔" ملامت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے مجھے شرمندہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

"تو ٹھیک ہے۔ بگڑا تو اب بھی کچھ نہیں۔ کون سا سبرین کی عمر نکل گئی ہے۔ کسی بھی اچھی جگہ رشتہ طے کردیں' بات ختم۔" میں لمحہ بھر کو شرمندہ ہو کر پھر سے ڈھیٹ بن گیا۔

دراصل دو سال پہلے جب امی نے میرے سامنے سبرین کا نام لیا تھا تب مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن تب بھی میری زندگی میں نہیں تھی۔ آئی تو خیر اب بھی نہیں تھی۔ مگر میں اپنی سی کوشش تو کرہی رہا تھا۔ بس یہ پرانی نام کا روڑا درمیان سے نکل جاتا۔

"تو تم کب کروگے شادی۔۔ کوئی لڑکی پسند کرہی لی ہے تو مجھے بھی بتادو۔"

میرے واضح انکار کے بعد تو انہیں یہی خیال آنا تھا۔ مگر میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی لیے خاموشی سے چائے کا کپ اٹھالیا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ اب تو سوچ رہی ہوں۔ ولید کے لیے ہی لڑکی دیکھنا شروع کردوں۔ میرا اکیلا پن تو دور ہوگا ہی۔ لوگوں کی زبانیں بھی بند ہوجائیں گی۔ جسے دیکھو ایک ہی سوال پوچھتا رہتا ہے۔ بہو کب لارہی ہو۔ ارے میں تو کل ہی لے آؤں' مگر بیٹا راضی تو ہو۔" ان کا لہجہ تاسف و ناگواری سے بھرپور تھا۔ میں مسکرا دیا۔

"ہاں۔۔ واقعی۔۔ یہ ٹھیک کہا آپ نے۔ ایسا کریں ولید کے لیے ہی لڑکی دیکھ لیں۔ مجھے جب شادی کرنی ہوگی میں خود آپ سے کہہ دوں گا' پرامس۔" میں نے ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کا موڈ بری طرح آف ہوچکا تھا۔ سو وہ زیادہ نہیں ٹھہریں اور میں حیران ہو کر سوچ رہا تھا۔ کیا ولید واقعی شادی کے قابل

ہو گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

"بھائی پلیز۔ ذرا ٹین اسپورٹس تو لگائیں۔ ریسلنگ شروع ہو گئی ہو گی۔" وہ صوفے کے پیچھے سے چھلانگ لگا کر دھم سے میرے برابر آ بیٹھا۔ میں اچھل پڑا۔

"ولید۔ حرکتیں ٹھیک کرو اپنی۔ تم بچے نہیں رہے۔" مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ اتنے انہماک سے اپنے پسندیدہ اینکر کو اس حکومتی نمائندے کے بخیے ادھیڑتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مداخلت پر جی بھر کے بدمزا ہوا۔

"اسی لیے تو ریسلنگ لگانے کا کہا ہے۔ سی این این لگانے کا نہیں کہا اور آپ کو پتا کیا ہے ایک ہی قسم کے بور سیاسی ٹاک شوز دیکھ دیکھ کر۔ ان زبانی کلامی جھگڑوں سے اچھا ہے "حقیقی" والو تیچ ہو دیکھ لیں۔ آج بڑا زبردست میچ ہونے والا ہے۔ اینڈی لورڈ نیل برائن کا۔"

"کس کا؟" میں یکدم ہی چونکا تھا۔ اس نام پر میرے کان تو کیا بال تک کھڑے ہو جاتے تھے۔

"ارے وہی۔ جسے دیکھ کر آپ نے کہا تھا کہ اس کی شکل آپ کے مینیجر سے ملتی ہے۔ ویسے ایک بات کہوں "آج آپ کے مینیجر کو میں نے پھولوں کی دکان میں دیکھا۔"

"تو تم وہاں کیا کر رہے تھے؟" مینیجر کی بات تو میرا دھیان کیا کھینچتی اس نے مجھے ٹھٹکا دیا۔

"میں۔" وہ قدرے بوکھلایا۔ "میں تو وہاں پھولوں کے ریٹ معلوم کرنے گیا تھا۔"

"کس خوشی میں۔ کسی دوست کی سیج سجانی تھی یا پھر اپنے سہرے میں پھول لگانے تھے۔" گھور کر کہتے ہوئے میں اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے لگا۔

"وہ تو ویسے ہی کہا تھا۔ آپ کو پتا ہے ایک نمبر کا دکاندار ہے وہ۔ کہہ رہا تھا۔ آج کے دن ایک گلاب وہ تین تین سو کا ملتا ہے اور احمق لڑکے تیار بھی ہو جاتے ہیں۔ اتنے پیسے دینے کے لیے۔ تو میں وہی دیکھنے گیا تھا۔" وہ وضاحت دے کر معصوم سی شکل بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ مگر میں معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔

"اچھا۔ تو میرے پیارے پودے کا وہ حشر تم نے کیا تھا۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے اپنے اشتعال پر قابو پالیا۔

"ہاں۔ میرے منہ سے نکل گیا تھا اس کے سامنے کہ ہمارے گھر بڑے گلابوں والا پودا ہے۔ بس پھر وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے سارے گلاب بیچ ڈالے اور جانتے ہیں مجھے کیا دیا۔ صرف ایک جوس اور ایک برگر۔" اس نے منہ بناتے ہوئے شکایت کی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں اس کے لیے کن گالیوں کا انتخاب کروں۔

"تم نہایت گھٹیا ہوتے جا رہے ہو ولید۔" میں بمشکل۔ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"ہاں واقعی۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے آپ کے لیے ایک تو کلی چھوڑنی چاہیے تھی۔"

ندامت کا اظہار وہ بھی اس انداز میں۔ میرا پارہ تو چڑھنا ہی تھا۔ "شٹ اپ"

"ایم سوری۔" وہ لب مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔ اس وقت اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ولید۔ کسی لڑکی کا چکر تو نہیں ہے نا؟"

"توبہ کریں بھائی۔ میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔" وہ یوں بدکا جیسے میں نے پتا نہیں کیا کہہ دیا ہو۔

"تم مجھے کیسے لگتے ہو۔ جس دن تمہیں پتا چل گیا۔ شرم سے ڈوب مرو گے۔" ریموٹ اس کی طرف اچھالتا میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر تو کبھی مت بتائیے گا۔" میرے اٹھتے ہی اس نے فوراً چینل چینج کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں اس وقت اپنے دوست کے ساتھ باہر ڈنر کر رہا تھا۔ جب مجھے ہالہ کا میسج موصول ہوا۔ میں نے اسی

وقت اسے کال ملائی تھی اور اس کی روتی ہوئی آواز سن کے بری طرح ڈسٹرب ہو گیا۔

"ہالہ"

"ہم اسپتال میں ہیں۔" اس کا لہجہ بھرایا۔

"کیوں۔ کیا ہوا سب خیریت تو ہے نا؟" پریشانی سے کہتے ہوئے میں ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

"پھپھو۔ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ ہم ابھی ابھی انہیں اسپتال لے کے آئے ہیں۔"

"ہم کون؟" میں الجھ گیا۔

"میں اور رشید۔ چاچو بھی یہاں نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں کیا کروں۔ اس لیے تمہیں میسج کر دیا۔" وہ رو پڑی۔

"اوہ۔ بہت اچھا کیا۔ رونا بند کرو ہالہ۔ میں آرہا ہوں۔" اسے تسلی دیتے ہوئے میں نے فون بند کر کے دوست سے معذرت کی اور اسی وقت وہاں سے نکل آیا۔ بے چاری ہالہ۔ اس کا "قصبا" اکیلے میں کسی ایسی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا ہو گا' جب ہی تو وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ پھر صدیقی صاحب بھی کسی کام کے سلسلے میں دو دن کے لیے دبئی گئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی پریشانی میں اگر سب سے پہلے مجھے پکارا تھا تو میں کیسے لبیک کہتا ہوا نہ چلا آتا۔

میں وہاں پہنچا تو پتا چلا زیادہ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس کی پھپھو کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ مگر اب وہ بہتر تھیں اور تھوڑی دیر میں انہیں چھٹی ملنے والی تھی۔ اس کا گھریلو ملازم اس کے ساتھ تھا' مگر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود انہیں گھر چھوڑنے جاؤں۔

"میں بہت زیادہ گھبرا گئی تھی فاخر۔ جب تمہیں میسج کیا تو یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔"

سفید لباس میں ستا ہوا چہرہ لیے وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس وقت جب میں اس کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کی پھپھو مجھ سے چند باتیں کرنے کے بعد ادویات کے زیر اثر سو گئی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"تم بلاؤ اور میں نہ آؤں' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" یہ

بات میں نے دل سے کہی تھی۔ مگر وہ اسے ایک ہمدرد دوست کی ہمدردی سمجھی اور اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھپھو کہتی ہیں میں کبھی کبھی بچوں کی طرح ری ایکٹ کر جاتی ہوں۔ مگر میں کیا کروں' ان کے معاملے میں میرا دل بہت کمزور ہے۔ میرا ان کے سوا اور ہے ہی کون۔"

"میں بھی تو ہوں۔ تم بھروسا کر کے تو دیکھو۔" میں اظہار کے معاملے میں ہمیشہ سے اناڑی رہا تھا۔ اب بھی صرف سوچ کر رہ گیا۔ اس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھتے ہوئے مجھے اس لیے حقیقتاً" بہت دکھ ہوا تھا۔

اس کا تعلق ایک بدقسمت فیملی سے تھا۔ اس کی ماں نے اسے سات سال کی عمر میں ہی چھوڑ کر اس کے باپ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس کے باپ نے بیوی کی بے وفائی کا غم ایسے دل سے لگایا کہ اسے بھی بھول کر ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے نکل گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے وہیں کہیں شادی کر لی تھی۔ سو ہالہ بھی انہیں بھول بھال کر پھپھو اور چاچو کے ساتھ خوش رہتا رہا۔ اس کے چاچو یعنی میرے باس صدیقی صاحب نے بھی ایک بار شادی کی تھی مگر اس معاملے میں گویا یہ پورا خاندان ہی بدقسمت واقع ہوا تھا۔ کیونکہ جس عورت سے انہوں نے شادی کی تھی' جب اس نے اپنی اصلیت ظاہر کی' صدیقی صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس بلا سے چھٹکارا پانے کا کوئی باعزت طریقہ اختیار کرتے' وہ خود ہی ان کا کافی سارا مال سمیٹ کر انہیں گڈبائے کہہ گئی۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس کے بعد صدیقی صاحب نے پھر کبھی کسی عورت پر بھروسا نہیں کیا اور دوبارہ شادی نہیں کی اور اس کی پھپھو۔ مجھے لگتا تھا بھائیوں کا حشر دیکھ کر انہوں نے توبہ کر لی تھی۔

"تمہاری پھپھو مجھے جانتی ہیں۔" مجھے حیرت ہوئی سن کر۔ "اسے اس موڈ سے نکالنے کی خاطر میں نے بات بدلی' وہ چونک گئی۔

"ہاں۔ میں ان سے تمہاری باتیں کرتی رہتی ہوں۔ چاچو بھی ذکر کرتے ہیں تمہارا۔ وہ مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ میں تمہیں کسی دن گھر پر بلاؤں۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔

"مگر تم نے تو مجھے آج تک نہیں بلایا۔" میں خفگی سے شکوہ کر بیٹھا۔

"اف۔ مجھے یاد کہاں رہتا ہے۔" وہ ہلکا سا جھنجلائی۔

"ہاں۔ تمہیں برائن سے فرصت ملے تو کچھ اور یاد رہے۔" طنز سے کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر تپ رہا تھا' وہ اس وقت بھی کہیں اور ہی الجھی ہوئی تھی۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تم نے ! اپنی پھپھو کو برائن کے بارے میں بھی بتایا ہو گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"بالکل نہیں۔ میں ابھی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔" اس نے فوراً" ہی میرے خیال کی نفی کی۔

"تو میرے بارے میں کیا جانتی ہو۔" مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے خیال میں تو برائن اس کے لیے مجھ سے زیادہ تھا۔ اگر وہ واقعی اس کے ساتھ سیریس تھی تو اسے میرے بجائے برائن کے لیے راہ ہموار کرنی چاہیے تھی۔

"بہت کچھ جانتی ہوں۔ سب سے بڑھ کر چاچو تمہیں جانتے ہیں۔ تمہاری ایک پوزیشن ہے۔ تمہاری کریڈیبلٹی پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔"

اس نے جس طرح کہا میں ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ یعنی وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔ میں نے دروازے کی سمت قدم بڑھائے تھے۔ وہ اٹھ کر میرے پیچھے آئی۔

"میں اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ مگر میں جب بھی اس کے گھر والوں سے ملنے کی بات کرتی ہوں' وہ ٹال دیتا ہے۔"

"وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے گا۔" میں پھر سے سلگا۔ یہ ایک تضاد تو تھا ہمارے بیچ۔ وہ اپنے گھر والوں سے

میرے تذکرے تو کر سکتی تھی مگر اس نے کبھی میرے گھر والوں سے ملنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔

"تم نے اسے موبائل گفٹ کیا۔" ہم پورچ تک چلے آئے تھے کہ اچانک مجھے پوچھنا یاد آیا۔

"زیادہ مہنگا نہیں۔ بس ایک سمپل سا کیمرہ موبائل۔" دھیمے سے اعتراف کرتے ہوئے وہ مجھے مزید چڑا گئی۔

"بس کرو۔ مجھے برانڈ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتنا بے شرم انسان ہے۔ لڑکی نے گفٹ دیا اور اس نے رکھ بھی لیا۔" میں نے ایک جھٹکے سے اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا تھا۔

"ام سوسوری فاخر۔ بجائے تمہیں روکنے کے میں تو خود بھی اٹھ کر تمہارے ساتھ یہاں تک چلی آئی۔" آس پاس نظر دوڑاتے ہی وہ جیسے کسی نیند سے جاگی اور چہرے پر شرمندگی بکھر گئی۔

"ہاں۔ تم جیسا میزبان ہو تو مہمان کو سوکھے منہ ہی رخصت ہونا پڑتا ہے۔" میں نے ذرا رک کر اسے مزید شرمندہ کیا۔

"چلو چھوڑو نا۔ اندر چلو۔ میں تمہیں اپنے ہاتھ کی بنی اچھی سی چائے پلواتی ہوں۔" وہ اچھا پہلا تہذیبی کے اثرات زائل کرنے کی کوششوں میں تھی۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"تمہارے ہاتھ کی چائے بھی تو اچھی کیسے ہو سکتی ہے اور ویسے بھی گیارہ بج رہے ہیں اور میں ناشتے سے پہلے ڈنر کرنے کا عادی ہوں۔" جتا کر کہتے ہوئے میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"او مائی گاڈ۔" اس کی آنکھیں پھیلی تھیں اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تم کھانا کھا کر نہیں آئے تھے؟"

"نہیں۔ مگر اب گھر جا کر میں سب سے پہلا کام یہی کرنے والا ہوں۔ میرا خیال ہے تم صبح آفس تو نہیں آؤ گی۔ بلکہ میرا مشورہ ہے یہ سولہ کی مت آنا جب تک کہ تمہاری پھپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی۔ میں تمہارے بغیر کام چلا لوں گا۔ او کے خدا حافظ۔"

رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے جلدی جلدی میں الوداعی کلمات ادا کیے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جب میں وہاں سے نکل کر مین روڈ پر آیا تو میرے موبائل کی تھرتھراہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ شاید ہالہ ہو۔ یہی سوچ کر میں نے سیل نکالا تھا مگر اسکرین پر کسی اجنبی نمبر سے کالنگ آرہی تھی۔ کچھ الجھتے ہوئے میں نے کال ریسیو کر ہی لی۔

"بھائی! کہاں ہیں آپ؟" ولید کی پریشان سی آواز ابھری تھی۔

"اوہ۔ تو یہ تم ہو۔"

"جی ہاں۔ آپ کے بنائے گئے رولز کو فالو کرنے کی کوشش میں آج نو بجے سے پہلے ہی گھر پر موجود ہوں۔ مگر آپ کہاں ہیں جناب۔" وہ تو واقعی خاصا چڑا ہوا لگ رہا تھا اور وجہ بھی اس نے بیان کر دی۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"آ رہا ہوں یار۔ اب فون پر کیا قصے سناؤں۔ گھر آ کر بتاتا ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے موبائل خرید لیا؟" میں نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ ایک خاص ایڈوانس سسٹم کے تحت یہ سم کسی بھی الیکٹریکل آلے میں چل جاتی ہے۔ اور اس آلے سے بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔"

"کیا۔" اس بے تکی بات پر تو مجھے چلانا ہی تھا۔

"آف کورس۔ خرید لیا ہے بھائی۔" وہ میرے ری ایکشن پر ہنسنے لگا۔

"اچھا۔ میں امی کو آپ کے آنے کا بتادوں۔ تھوڑی دیر اور گزرتی تو وہ آپ کی تلاش پر کسی ڈیٹیکٹیو (سراغ رساں) کو ہائر کرنے والی تھیں۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور میں نے اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟" پلیٹ میں پڑے اس عجیب و غریب ملغوبے کو دیکھتے ہی میں نے حیران ہو کر امی کی سمت

دیکھا۔

"بینگن کا بھرتہ۔" وہ جواب دے کر سامنے والی کرسی پر آبیٹھیں۔

"اف۔ یہ بن موسم کے بینگن کب تک چلتے رہیں گے۔"

"تو تم یہ بھنڈی کھالو نا۔" امی نے دوسری پلیٹ سامنے کی۔

"ہاں۔ بھنڈی تو جیسے میری پسندیدہ ترین سبزی ہے۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں ویجیٹیرین بن گیا ہوں۔ کوئی ایک ڈش تو چکن یا مٹن کی بنا لیتیں۔" ایک تو ویسے ہی اتنی دیر ہوگئی تھی۔ بھوک سے میرے معدے میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ کتنی بے تابی سے میں کھانے کی ٹیبل پر بیٹھا تھا اور اب۔

"کیا ہوگیا ہے فاخر۔ تم نے تو کھانے میں کبھی اتنے نخرے نہیں کیے اور تم تو آنے والے تھے بھی نہیں۔ یہ سبزی تو میں نے اپنے لیے بنائی تھی۔" انہیں میری بات پر غصہ آگیا۔ "ایک فون کردیتے تو بنا دیتی تمہارے لیے کچھ۔"

میں شرمندہ سا ہوگیا۔ میں کیوں یہ بھول گیا تھا کہ میرا آج کا ڈنر تو ہادی کے ساتھ تھا۔ جیسے کفران نعمت کرتے ہوئے میں خود چھوڑ کر آیا اور جس نے لیے چھوڑ کر گیا۔ اس نے سوچی کھاس تک... وہ ڈائی لو اور اس وقت سامنے صوفے پر بیٹھے اپنے... فون سے چھیڑ چھاڑ کرتے ولید نے جیسے میری سوچ پڑھ لی۔

"کیوں بھائی۔ جس حسینہ کی مدد کو آپ سپرمین کی طرح اڑ کر گئے تھے۔ اس نے آپ کو چائے پانی نہیں پوچھا۔"

"چائے پانی پوچھا تھا۔ میرے لیے دستر خوان سجا کر نہیں بیٹھی تھی۔" اندر ہی اندر کھسیانے کے باوجود میں بظاہر بہت تپ کر بولا۔

"چلو۔ اب بس کرو۔ کھانا کھالو۔ رزق کی یوں ناقدری نہیں کرتے۔" امی نے ڈپٹا تھا۔ میں بے دلی سے لقمہ توڑنے لگا۔

"ولید۔ جاکر ذرا چائے کا پانی تو چڑھا دو۔" وہ گردن موڑ کر ولید سے مخاطب ہوئیں۔

"کس پہ۔" وہ سر اٹھا کر معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"چولہے پر اور کس پہ۔ کیا تم نے کبھی تندور میں چائے ابلتی دیکھی ہے۔" مجھے غصہ آگیا۔

"اف۔ آپ لوگوں نے بالکل ہی مجھے چھوٹا بنا دیا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کسی ڈھابے میں نوکری کرلوں۔ تنخواہ تو ملے گی۔" اس کے چہرے پہ جھنجلاہٹ ابھر آئی۔

"چھوٹا۔" میں نے ایک طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی۔ اسی پل وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں چونک سا گیا۔ بلیک جینز اور گرے ٹی شرٹ میں اس کی دراز قامت کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ اجلی رنگت پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ پیشانی پر بکھرے گھنے سیاہ بال مجھے ایک خوش گوار سے احساس نے آگھیرا۔

"کمال ہے۔ میرا بھائی اتنا ہینڈسم ہے۔ میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔"

"فاخر۔ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟؟" امی کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"کھا چکا۔ بس۔" میں نے کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

"اتنا سا۔" وہ حیرت سے بولیں۔ "کچھ اور بنا دوں؟؟" انہیں اب افسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں رہنے دیں۔ ناشتے میں کسر نکال لوں گا۔" میں اٹھ گیا۔ بھوک ویسے بھی ختم ہوچکی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر پڑے ولید کے موبائل کو دیکھنے کی خاطر میں اس طرف آیا۔ اسی وقت اس پر کوئی کال آنے لگی۔

"ولید۔ تمہارا فون ہے۔" میں نے با آواز بلند پکارا اور میری بات پوری ہونے سے بھی پہلے وہ ہاتھ میں چھلنی لیے جس طرح بھاگتا ہوا آیا تھا میں ہکا بکا رہ گیا۔

"آرام سے۔"

"میں کافی دیر سے اویس کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔"

کھسیا کر کہتے ہوئے اس نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔

"مس کال تک" میں نے تصحیح کی۔ فون اب خاموش ہوچکا تھا۔ "تھوڑا انتظار تو کرلیتے یار۔ فون ہے بھی یا تمہارے کنگلے دوستوں کی مس کال ہے۔" طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کا جائزہ لیا۔ "یہ چار ہزار کا موبائل تو نہیں ہے ولید۔" مجھے حیرت بھی ہوئی اس سیاہ جدید سے اسمارٹ فون کو دیکھ کر۔

"ہاں نہیں ہے مگر اس کی کوئی وارنٹی بھی نہیں ہے۔ دوست نے کچھ عرصہ یوز کیا۔ اب بیچنا چاہ رہا تھا تو میں نے خرید لیا۔" وضاحت دے کر وہ سیل فون کو جیب میں ڈال کر واپس کچن کی طرف پلٹ گیا تھا۔ میں الجھا ہوا سا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی جان! ایک منٹ رکیں۔" صبح مجھے آفس کے لیے تھوڑی دیر ہوگئی تھی۔ عجلت میں تیار ہو کر میں گاڑی تک آیا ہی تھا کہ ولید نے بھاگتے ہوئے آکر مجھے روکا۔

"مجھے دس بجے ایک ضروری لیکچر اٹینڈ کرنا ہے۔ میری بائیک خراب ہوگئی ہے۔ آپ مجھے اپنے آفس تک چھوڑ دیں۔ آگے سے میں لفٹ لے لوں گا۔" ہانپتے ہوئے کہہ کر وہ اگلا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر گر سا گیا۔

"کیا ہوا تمہاری بائیک کو۔ کئی دنوں سے دکھائی نہیں دے رہی۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔ اسٹارٹنگ میں مسئلہ کررہی تھی۔ میں نے ظفر کے حوالے کردی۔ وہ کہہ رہا تھا آج شام تک ٹھیک ہوجائے گی۔"

"میں تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کردیتا مگر آج پہلے ہی کافی دیر ہوگئی ہے۔ تم چاہو تو گاڑی لے کر جاسکتے ہو۔" میں نے اسے آفر کی۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تھوڑا سا ہی تو راستہ ہے۔ میں مینیج کرلوں گا۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق ہالہ نہیں آئی تھی۔ امید ٹوٹے تو برا لگتا ہے۔ کوئی توقع اس طرح سے پوری ہوجائے تو اور بھی برا لگتا ہے۔

پتا نہیں۔ میں کسی ٹین ایج عاشق کی طرح اس دبی چھپی خاموش محبت سے کیا حاصل کرنے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ عمر کے جس حصے میں، میں تھا وہاں ایسی یک طرفہ احمقانہ بچکانہ محبت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں سنجیدہ تھا۔ تمنائی تھا اور بھرپور کوشش کرنے کے قابل بھی تو پھر وہ کیا چیز تھی جو مجھے روک رہی تھی۔ میں مدعا زبان تک نہیں لا پا رہا تھا میں جو بڑی بڑی ڈیلز منٹوں میں فائنل کرلیتا تھا اس لڑکی کے سامنے اتنا کنفیوز ہوجاتا تھا۔ میں کیوں یہ سوچتا تھا کہ وہ انکار ہی کرے گی۔ وہ اقرار بھی تو کرسکتی تھی۔

جانے کیسی خوش گمانی تھی یہ کہ اس دن اسی خیال کے زیر اثر میں بے اختیار اسے فون کر بیٹھا۔

"لو۔ فاخر یہ تم ہو ناں۔ کام کیسا چل رہا ہے میرے بغیر۔" اس نے کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ لہجہ بشاشت سے بھرپور تھا۔

"ٹھیک چل رہا ہے۔ تم بتاؤ۔ پھپھو کی طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"اب تو بہتر ہیں اور... میرے چھٹی کرنے کا کوئی جواز تو نہیں تھا مگر تم نے کہا تھا مت آؤ اسی لیے نہیں آئی۔ کل مدر ڈے ہے اور میری سالگرہ بھی ہے تو میں نے سوچا کچھ شاپنگ ہی کرلی جائے۔ ابھی میں یہاں ہوں شاپنگ مال میں۔"

اب مجھے اس کے لہجے کی تازگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اور ایک لمحے کے لیے دل میں برہمی کی بڑی بھرپور لہر اٹھی۔

"میں نے تمہیں آفس نہ آنے کا کہا تھا کہ تم اپنی پھپھو کے ساتھ رہ سکو اس لیے نہیں کہ اپنی سالگرہ کی خریداری کے لیے بازاروں کی خاک چھانتی پھرو۔

حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی بھی۔"

میرے لہجے میں دکھائی آئی تھی وہ یکدم خاموش سی ہوگئی۔ یہی تو مسئلہ تھا جہاں کہیں اسے حال دل کہنے کا موقع آتا میرے اندر کا وہ درشت اور سخت گیر باس بیدار ہو جاتا۔

"مجھے تمہیں یہ بات بتانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ تم لمحوں میں جھاڑ کر رکھ دیتے ہو۔ خود ہی مجھ سے کہا میں نہ آؤں۔ اب میری مرضی۔ میں اپنے اس دن کا استعمال جیسے بھی کروں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ہاں!" میں نے ایک گہری سانس کھینچی۔ "آئی کس کے ساتھ ہو؟"

"اکیلی آئی ہوں۔ مگر اس بات پر مجھے ڈانٹنے مت لگ جانا۔ تم آفس کی حد تک میرے باس ہو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ میرے سرپرست بننے کی کوشش مت کرو۔" میرے یوں پوچھنے پر وہ مزید چڑ گئی۔

"اچھا۔ مجھے بتاؤ تم کہاں ہو۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ لنچ ٹائم ہونے ہی والا تھا۔

"کیا!" اس کی آواز بلند ہو گئی۔ "تم آرہے ہو۔ تم کیوں آؤ گے؟"

"وہ آکر ہی بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا تو وہ ایک پل کو چپ ہو گئی۔ پھر قدرے توقف سے اس نے مجھے شاپنگ مال کا نام بتایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟" وہ حیرت بھری نظروں سے سامنے رکھے کیس کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔" میں نے کہتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں اسے مال کے فوڈ کورٹ لے آیا تھا۔

"مگر میری سالگرہ تو کل ہے۔" اس نے ابھی تک اسے اٹھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"کل آف ڈے ہے۔ شاید میں تم سے نہ مل سکوں۔ اسی لیے سوچا آج ہی تمہارا گفٹ دے دوں۔"

"تم رل سکتے تھے۔" اس نے کیس اٹھا کر کھولا۔ ایک پل کو امڈنے والی حیرت ستائش میں بدلی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "یہ بہت ایکسپینسیو ہے فاخر۔" اس نے اس خوبصورت بریسلٹ کو ہاتھ میں اٹھالیا۔

"نہیں۔ اتنا زیادہ بھی نہیں۔" یہ سچ تھا اسے خریدنے میں میری ایک مہینے کی سیلری چلی گئی تھی۔ اور اسے خرید کر میں نے آفس ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا اس کی سالگرہ چھٹی والے دن آتی ہے۔ سوچا تھا پہلے سے اسے دے دوں گا۔

"تم کوئی چھوٹا موٹا گفٹ دے دیتے۔ کیا میں اسے پہن لوں؟" کہتے ہوئے اس نے اچانک میری طرف دیکھا۔ میں مسکرا دیا۔ یعنی اس نے میرا تحفہ قبول کر لیا تھا۔

"ضرور۔"

"نہیں۔ تم ہی پہنا دو۔" اس نے بریسلٹ میری طرف کھسکا کر ہاتھ بھی میری طرف بڑھا دیا اور میں ساکت رہ گیا۔ وہ کبھی کبھی حیران کر دیتی تھی۔ بریسلٹ اٹھا کر اس کی کلائی میں ڈالتے ہوئے میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"برائن کو پتا ہے تمہاری سالگرہ کا؟" یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ میں اس کا نام لیتا مگر میں خود کو یاد دلانا چاہتا تھا کہ فاخر بیگ اپنی اوقات میں رہو۔

"ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا اس نے میری سالگرہ کے لیے کچھ الگ سے پلان کیا ہے۔" سرہلا کر کہتے ہوئے وہ اپنی کلائی کا جائزہ لینے لگی۔

"کیا مطلب۔ کیا وہ تمہیں کہیں کھانے پہ لے کے جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی امید ہے تو نہیں۔ لے بھی گیا تو بل تم ہی سے ادا کروائے گا۔" ان کی سابقہ ملاقاتوں کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جلال سا ابھرا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے ایسا ہوا ہوگا ایک دو بار۔"

"ہر بار۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر یاد دلایا۔

"اور جب جب ایسا نہیں ہوا تب تب وہ لنچ اور ڈنر کے

لیے تم دیں برنس روڈ کی فوڈ اسٹریٹ لے گیا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل سے ڈائریکٹ فوڈ اسٹریٹ امیزنگ۔" میں لاکھ خود کو قابو میں رکھتا اس اچکے کے نام پر تلخی اُمڈ اُمڈ پڑتی تھی۔

"ہاں۔ تو کیا ہوا۔ برنس روڈ کی نہاری اور سیخ کباب تو پورے پاکستان میں مشہور ہیں۔" وہ اپنی خجالت اس طرح مٹا سکتی تھی۔ میں چند لمحے اس کے چہرے کی سرخی دیکھتا رہا۔

"تم نے اس سے اس کی پلاننگ نہیں پوچھی؟"

"نہیں۔ سرپرائز بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ ایسا کرے جس سے میں حیران رہ جاؤں۔" کچھ سوچ کر کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں پھنس پڑا۔

"وہ ہر بار ہی کچھ ایسا کرتا ہے جس سے تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی حیران رہ جاتا ہوں۔ بائی دا وے تمہیں لنچ پر لے کے جا رہا ہے یا ڈنر پر؟"

"کہا ناں۔ مجھے نہیں پتہ۔" وہ قدرے جھنجلا گئی۔

"اور لے کے جائے گا کس پہ۔"

"کاش اس کے پاس ایک گاڑی ہوتی۔ ایک پرانی کھٹارا بائیک ہے تو وہ بھی خراب۔" وہ متاسف ہوئی تھی۔

"کمال ہے۔" استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے میں نے سر جھٹکا۔ "عجیب کٹی ہوئی ہوا میں چلتا ہوا بائیک خراب۔ کیا چیز ہے یہ بھی۔ کہیں اب تمہارا ارادہ اسے گاڑی دینے کا تو نہیں۔"

کہتے کہتے میری چھٹی حس کا الارم بڑے زور دار آواز میں بجا تھا۔ میں یک لخت خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"میں نے ابھی کیا کہا؟" ذہن جو مجھ سے کہہ رہا تھا دل اسے ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"تم نے کہا۔ میں اسے تحفے میں گاڑی دوں گی اور میں کہتی ہوں نہیں۔" وہ پرزور انداز میں بولی۔

"اس کا۔ اس کا نام کیا ہے بالا۔؟" میں اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ اس کا اپنا نام؟"

اس کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی۔ "عاشر۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں۔" میں تیزی میں سرہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے بالا! تم ٹیکسی سے گھر چلی جانا۔ منڈے کو آفس میں ملاقات ہو گی۔" میں اس سے نگاہیں ملائے بغیر عجلت کرتا وہاں سے چلا آیا۔ پیچھے میں نے اس کی کئی پکاریں سنیں۔

☼ ☼ ☼

میں اس وقت ولید کے کمرے میں اس کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا اور خود کو انتہائی احمق محسوس کر رہا تھا بلکہ کسی حد تک چور بھی حالانکہ میں پہلے بھی کئی بار اس کا کمپیوٹر استعمال کر چکا تھا مگر آج تو مجھے میری طبیعت ہی کچھ یہاں کھینچ لائی تھی۔ کسی کی ٹوہ لینا جو مجھے بہت ہی گھٹیا ترین کام لگا کرتا تھا۔ آج میں خود وہی کرنے جا رہا تھا۔ مجھے گمان سا تھا کہ شاید وہ فیس بک سے لاگ آؤٹ نہ ہوا ہو۔ دل میں عجیب ہی جذباتی طوفان لیے میں نے اس کا کمپیوٹر آن کیا تھا اور میری دھڑکنیں تھم تھم گئیں جب فیس بک پر آتے ہی میں نے اسے لاگ آن پایا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے اپنے ہیجان پر قابو پا کر اسکرین کی سمت دیکھا۔

اس کی آئی ڈی میرے سامنے کھلی پڑی تھی مگر ولید بھائی۔ ولید بھائی؟ جھنجلاہٹ یکایک ہی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ یہ وہ چیز تو نہیں تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔

ہونٹ کاٹتے ہوئے میں خالی خالی نظروں سے کچھ دیر تو اسکرین کو دیکھتا رہا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے میسجز چیک کرنے شروع کیے۔ مگر کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔ اس کے وہی دوست جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ مگر یہ کوئی بڑی بات تو نہ تھی۔ اگر اس نے جعلی نام سے کوئی آئی ڈی بنائی بھی تھی تو وہ اسے یوں کھلا چھوڑ کر کیوں جائے گا جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمپیوٹر یوز کر چکا ہوں۔

مایوسی سے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے میں نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔۔۔ یقیناً" یہ میرا وہم ہے اور کچھ نہیں۔" میں خود کو سمجھا رہا تھا۔

"مگر یہ سارے اتفاقات محض اتفاقات تو نہیں ہو سکتے۔" پھر سے آیا یہ خیال میرے ذہن و دل میں اضطراب بھر گیا۔

"کیا یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جن دنوں ولید کا موبائل چھنا' براؤن بھی اسی صورت حال کا شکار تھا اور پھر چودہ فروری کا دن۔۔۔ کیا وہ بھی اسی یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے جہاں ولید پڑھنے جاتا ہے۔ ولید کی مہنگی مہنگی شرٹس اس کے پاس سے اٹھنے والی دلفریب مہک ۔۔۔ جنہیں وہ دوستوں کی دریا دلی قرار دیتا ہے۔ ولید کا محض چار ہزار میں خریدا جانے والا اتنا مہنگا سیل فون ۔۔۔ ٹھیک اسی دن جب ہالہ نے براؤن کو سیل فون گفٹ کیا۔ ولید کی بائیک خراب ہوئی تو براؤن کی بھی ہو گئی۔ ہالہ نے اس کا نام عاشر بتایا تھا۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے اس بات سے جب یہ سارے شواہد چیخ چیخ کر یہ بتا رہے ہیں کہ ولید اور براؤن ایک ہی شخص کے دو الگ نام ہیں۔ جس طریقے سے وہ ہالہ کو بیوقوف بنا رہا ہے وہ اسے اپنا نام بھی کیوں کر ٹھیک بتائے گا۔

میرا چھوٹا بھائی۔۔۔ میرا پیارا چھوٹا بھائی۔۔۔ جو کل تک میری نظر میں کسی فرشتے کی طرح معصوم تھا۔ کیا نکل آیا۔ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ اسی وقت میرا سیل بجا۔ اٹھا کر دیکھا تو ہالہ کال کر رہی تھی۔ میں جس طرح وہاں سے اٹھ کر آیا تھا' اسے پریشانی لاحق ہو گئی ہوگی پھر بھی میں نے اس کی کال ڈسکنکٹ کر دی اور ولید کے کمرے سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"اف۔۔۔ آج تو میں بہت ہی تھک گیا۔" نڈھال سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ آ کر صوفے پر نیم دراز ہوا تھا۔ میں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں مسل رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا گدھوں سے اظہار یکجہتی کے لیے آج کے دن کی بار برداری کا کام تم نے سنبھال لیا تھا۔" میرے الفاظ خود بخود تو کیلے ہو گئے۔۔۔ وہ چونکا تھا۔

"کون دیتا ہے آپ کو میری خبریں۔"

میں نے اپنی جھلاہٹ پر بمشکل قابو پایا۔ اس پر کسی بات کا اثر ہونا مشکل تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کسی فولادی ریوالور کو پتھر ماریں اور وہ اس سے ٹکرا کر واپس آپ کے منہ پر آ لگے۔

"کہیں کسی نے میری ویڈیو تو نہیں بنالی۔ عدیل کی گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے۔ اف عدیل کی گاڑی کو دھکا لگانا عدیل سمیت۔۔۔ کسی گدھا گاڑی کو گدھے سمیت کھینچنے سے کم نہیں ہے اس کے بعد وہ گھنٹے کی ایمرجنسی کی لائن میں لگنا۔۔۔ اگر وہاں سے گھر تک کا فاصلہ ذرا زیادہ نہ ہوتا تو میں تین حرف بھیجتا عدیل پر بھی اور عدیل کی گاڑی پر بھی۔" اس نے بتا کر پوری کتھا سنائی۔

"تمہاری بائیک ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ تم تو کل کہہ رہے تھے کہ شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ہاں وہ۔۔۔" وہ گڑبڑا سا گیا۔ "وہ تو ٹھیک ہو گئی ہے۔ اویس کو کوئی کام تھا سو وہ لے گیا۔۔۔" وہ سر جھکائے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔

"بائیک اویس لے گیا تو ہالہ کو لینے کیسے جاؤ گے؟" یہ سوال میری نوک زبان پر مچل گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا مار مار کر اسے اس کی ساری ایکٹنگ بھلا دوں۔ وحشت پن میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

"امی کہاں ہیں؟" وہ جوتے لے کر اٹھتے ہوئے بولا

"خالہ کی طرف گئی ہیں۔ شام تک گھر میں ہوں گی' اگر ایک گھنٹے میں تم انہیں لینے جاؤ گے۔" سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اس کا بدکنا واضح طور پر محسوس کیا۔

"میں۔۔۔ میں تو انہیں لینے نہیں جا رہا۔"

اس کے چہرے پر پریشانی پھیلی تھی۔ یہی تو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ آج ے تھا یعنی ہالہ کی سالگرہ کا دن برائن یہ دن ہالہ کے ساتھ گزارنے والا تھا تو ولید کیسے کوئی اور پروگرام بنا سکتا تھا۔

"کیوں نہیں جاسکتے۔ میری گاڑی لے جاؤ۔ وہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ ایک گھنٹے کے اندر واپسی ہو جائے گی۔"

"میں نہیں جاسکتا ناں بھائی! میرے سب دوست آج بیچ پر جانے والے ہیں۔ اور ایک گھنٹے میں فریش ہو کر مجھے بھی نکلنا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی بھائی — پلیز آپ چلے جائیے۔"

اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ میں اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی حد تک حقیقی تھے اور ظاہر ہے عین وقت پر کسی کی وزٹ کینسل ہونے لگے تو وہ اتنا ہی بوکھلائے گا جتنا کہ اس وقت ولید۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا "کیا یاد کرو گے تم بھی۔ چلا جاتا ہوں۔"

"تھینک یو بھائی۔" وہ مسکرایا تھا اور یقیناً اطمینان کی سانس بھی لی ہو گی۔ وہ اپنے کمرے کی سمت بڑھا تھا۔ شاید اب وہ ہالہ کو فون کرکے اپنے آنے کا بتائے گا۔ مگر وہ جائے گا کس پر؟ اس سوال کا جواب ہنوز اندھیرے میں تھا کہ یکایک ہی ایک خیال برق کی طرح میرے دماغ میں کوندا۔ عدیل کی گاڑی۔ ہاں یہ ممکن ہے بلکہ یقینی ہے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔

میں نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ ہالہ اب تیار ہو رہی ہو گی۔ دل یکدم ہی بجھ سا گیا۔

وہ شام میری زندگی کی سب سے بری شام تھی۔ اسی کو گھر لانے کے بعد میں کتنی ہی دیر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ذہن و دل پر مستقل ایک ہی خیال حاوی تھا۔ ہر گھڑی صرف ایک ہی سوچ بے قرار کر رہی تھی۔ وہ اب کہاں ہوں گے۔ وہ اب کیا کر رہے ہوں گے۔ میرے تخیل نے ہالہ کے ساتھ اس ہیولے کی جگہ اب ولید کو دے دی تھی۔ شام سات بجے کے قریب میں گھر آیا تھا اور آتے ہی اپنے کمرے میں آ کر پڑ گیا۔ مجھے نہیں پتا میری آنکھ کب لگی۔ مگر کھلی میرے سیل فون کی بجتی ٹون سے تھی۔ میں نے بنا اسکرین کی طرف دیکھے کال ریسیو کی تھی۔

دوسری طرف سے سسکیاں ابھریں اور میں تعجب میں گھر گیا۔ ایک نظر سیل کو دیکھتا میں اٹھ بیٹھا۔

"فاخر... سیوی۔" ہالہ کا گلوگیر لہجہ مجھے اچھلنے پر مجبور کر گیا۔

"ہالہ... تم کہاں ہو؟ کیا ہوا ہے؟" میں از حد بوکھلا گیا۔

"میں یہاں ہوں..." آگے... اس نے جو کچھ بھی کہا میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

پھر مجھے نہیں پتا۔ میں کیسے اٹھا اپنی گاڑی تک آیا اور کتنی دیر میں متعلقہ تھانے پہنچا۔

میرا دل سینکڑوں اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ میں وہاں کیا دیکھوں گا۔ مگر اتنا ضرور یقین تھا کہ جو بھی ہو گا وہ خوشگوار ہرگز نہیں ہو سکتا اور ہوا بھی یہی... میرے بدترین اندیشے صحیح ثابت ہوئے جب میں نے وہاں ولید کو اپنے دوستوں سمیت دیکھا اور ہالہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی رو رو کر آنکھیں سجا چکی تھی۔ مجھے معاملے کا کوئی آئیڈیا نہیں تھا مگر یہ صورت حال دیکھتے ہی میرا خود پر سے اختیار اٹھ گیا تھا اور میں نے ولید کے قریب جا کر پوری قوت سے اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ وہ سکتے میں آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی باقی سب بھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن ایس ایچ او سے معاملات طے کرتے کرتے اور تھانے سے نکلتے نکلتے ہمیں رات کے دس بج گئے تھے۔ ہالہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بجائے میں اپنے گھر لے آیا تھا۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ حسیات سن سی ہو رہی تھیں۔ اور اس وقت جب میں صوفے پر نڈھال سا بیٹھا تھا ولید میرے قدموں میں آ بیٹھا۔

"آئم سوری بھائی ۔۔۔ آئم ریئلی ویری سوری۔" اس کا لہجہ ندامت سے چور تھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "میں آپ کو بتانا چاہتا تھا مگر بتا نہیں پایا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ پتا نہیں آپ کا کیا ری ایکشن ہو' اس لیے بہانے بناتا رہا۔ یہ کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔"

میں نے ہالہ کی سمت دیکھا۔ ابھی اس کے پاس بیٹھی شاید مورل سپورٹ دے رہی تھیں حالانکہ اسے دیکھ کر لگ نہیں رہا تھا کہ اسے اس کی کوئی ضرورت ہو۔ اس مشکل صورت حال سے نکلتے ہی اس کا کروفر لوٹ آیا تھا۔

"وہ ساری زندگی جیل میں سڑتا رہے گا۔ آپ دیکھیے گا۔ میں اس چھچھورے کا جینا حرام کردوں گی۔"

"میں نے تھانے میں چوری کی رپورٹ بھی درج کروادی تھی۔ مگر مجھے امید نہیں تھی کہ بائیک مل بھی جائے گی شاید ایک دو دن بعد میں آپ کو بتا بھی دیتا کہ بائیک چوری ہوگئی ہے مگر آج اچانک ہی جب باجی کی طرف جاتے ہوئے ہماری گاڑی اس جنرل اسٹور پر رکی تو اولیس نے وہ بائیک دیکھ لیا' جس پر محترمہ اور ان کے دوست سوار تھے۔ نمبر پلیٹ چینج تھا مگر مجھے سوفیصد یقین تھا کہ وہ میری ہی بائیک تھی۔ بس پھر ان سب نے "تا" "فاقا" "ہی گاڑی سے اتر کر اس لڑکے کو پیٹنا شروع کردیا۔ نہ جانے کس نے پولیس کو فون کیا اور یوں ہم سب تھانے پہنچ گئے۔" کہتے کہتے اس کا لہجہ دھیما ہوگیا۔

تو یہ تھا اس ساری کہانی کا لب لباب' جس نے میرا چین و سکون غارت کر رکھا تھا۔ آج شام کو جب میں تھانے جا رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صورت حال یہ رخ اختیار کر جائے گی۔ ولید کو تھپڑ مارنے کے پیچھے میری بھرپور ذہنی اذیت اور اشتعال کا غصہ تھا وہ سمجھا کہ میں اس کے ہالہ کو چھیڑنے اور اس الزام میں پولیس کسٹڈی میں آنے پر آپے سے باہر ہوا۔ بے چارا میرا بھولا بھائی اور اس اثنا میں جب روتی ہوئی ہالہ میرے کندھے سے آ لگی تو وہ ہکا بکا رہ گیا تھا اور تب ہی میں نے حقیقی برائن کو بھی دیکھ لیا۔

سچ تو یہ تھا شکل و صورت میں وہ ولید کے پاسنگ بھی نہیں تھا اور اس وقت ان کے مارے گئے پنچوں کی بدولت تو اس کے چہرے کی حالت اور بھی بگڑ گئی تھی۔ وہ رو رو کے چلا چلا کے پولیس والوں کو بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ بائیک وہ اپنے دوست سے مانگ کر لایا تھا اور اسے بالکل نہیں پتا تھا' یہ چوری شدہ بائیک ہے مجھے تو خیر اس کی بات پر ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا اور پولیس والے ۔۔۔ انہیں تو تلاش ہی ایسے کیسوں کی ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا وہ اب اس معاملے کو لمبا کھینچیں گے۔ وہ تو ہالہ کو بھی اسی گینگ کا حصہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے اگر میں بیچ میں نہ آتا۔ درمیان کی رولا ڈالنے کو میں ہالہ کو نکال تو لایا تھا مگر مجھے پتا تھا۔ بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ مجھے اس کے چاچو کو یہ بات بتانی ہی تھی اگرچہ ہالہ نہیں چاہتی تھی کہ انہیں اس کی اس حماقت کا پتا چلے۔

"مجھے فاخر نے کئی بار سمجھایا ۔۔۔ کتنی ہی بار خبردار کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں بے وقوف پتا نہیں کیسے اس فراڈ کی باتوں میں آگئی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اتنا بڑا دھوکے باز نکلے گا۔ صرف اس کی وجہ سے آج میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئی۔ اگر فاخر نہ آتا تو پتا نہیں کیا ہوتا ۔۔۔ فاخر ہی ہر مشکل وقت میں میری مدد کو آتا ہے۔ ہی از لائیک آ سپر ہیرو۔" وہ ممنونیت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ولید نے معنی خیزی سے کھنکھار کر مجھے دیکھا۔

"تو اب کیا ہوگا؟"

"کیا؟" میں چونک گیا۔

"مجھے میری بائیک مل تو جائے گی ناں۔" وہ امید بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ضروری نہیں ہے۔ زیادہ امید نہ ہی پالو تو بہتر ہے۔ یہاں کسی گمشدہ چیز کا واپس ملنا ہفت اقلیم کی دولت ملنے سے کم نہیں۔" مگر میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سچ تو یہ ہے میں ان لمحات میں اس کے سامنے بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچتا تھا جب ہالہ کو پتا چلے گا کہ برائن میرا ہی بھائی ہے تو میں

اس سے نظریں کیسے ملا پاؤں گا۔ مگر اب جب مجھے براٹن کی حقیقت پتا چلی تھی میں ولید سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ان پے در پے ہونے والے واقعات و اتفاقات نے مجھے اتنا الجھا دیا تھا کہ میں اپنے ہی بھائی پر شک کرنے لگا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آرہی تھی۔

"ویسے ایک بات کہوں۔۔۔ آپ کی یہ کولیگ مجھے عقل سے بالکل پیدل لگتی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔ میں نے ہالہ کی طرف دیکھا۔

"اٹھو ہالہ۔۔۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے اپنی جگہ چھوڑی۔ ابھی ایک اور سفر درپیش تھا۔

"تم چاہو گو تو تمہیں بتاؤ گے نا؟" وہاں سے نکلتے ہی وہ مجھ سے یقین دہانی چاہنے لگی۔

"بالکل بتاؤں گا۔" میری تمام تر توجہ سامنے سڑک پر تھی۔

"لیکن کیوں فاخر؟" وہ تڑپ گئی۔

"بچی مت بنو ہالہ! یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان سے چھپائی جائے۔ بعد میں کوئی مسئلہ ہو گیا، جس کا کافی امکان ہے تو وہ معاملہ سنبھال تو سکیں گے۔" "ان کا اس سارے قصے سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ سمجھیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات پر زور دیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے مرے ہوئے لہجے میں کہتے سر ہلا دیا۔ "تمہیں پتا ہے میں نے تمہارا بریسلٹ بھی کھو دیا۔" اداسی سے کہتے ہوئے وہ اپنی کلائی سہلا رہی تھی۔ "میں نے چونک کر ایک نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں تمہیں دوسرا دلا دوں گا۔"

"کب۔۔۔؟" وہ اچھل پڑی۔

"تمہاری اگلی سالگرہ پر۔" میں اس کی بے تابی پر کچھ حیران سا ہو گیا۔

"یعنی اگلے سال۔" وہ میری بات سنتے ہی جھاگ کی مانند بیٹھ گئی۔

"نہیں اس سے پہلے بھی دے سکتا ہوں۔۔۔ اگر تم لینا چاہو تو۔" میں مسکراہٹ دباتے بولا۔ اس نے آنکھوں میں تعجب سمو کر مجھے دیکھا۔ "میں ضرور لینا چاہوں گی۔"

"کہیں تم میں براٹن کی روح تو حلول نہیں کر گئی؟" میں نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ نام مت لو اس کمینے کا میرے سامنے۔" وہ بری طرح بگڑ گئی۔ "اس بار مجھے واقعی جھٹکا لگا۔

"تم گالیاں بھی دینے لگی ہو۔ یہ واقعی اس کی سنگت کا اثر ہے۔"

"اب اگر تم نے اس کا ذکر کیا ناں فاخر۔۔۔ تو میں اس چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔" وہ انگلی اٹھائے کہہ رہی تھی۔ میں نے بغور اس کے چہرے کی برہمی کو دیکھا۔

"لیکن تمہیں تو وہ بہت پسند تھا۔"

"ہاں۔۔۔ میں اسی قابل ہوں کہ مجھے اس کے نام کا

طلب متاثر ہے۔" وہ تاسف سے کہتی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ "میں اس کی باتوں میں آگئی تھی۔ مجھے لگا وہی میرا رائٹ مین ہے۔ حالانکہ وہ شروع سے ہی اپنی اصلیت ظاہر کر چکا تھا۔ پتا نہیں میں اس شاک سے کیسے نکلوں گی۔ میں کیسے خود پر یقین کروں گی جب کہ مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میں اس دنیا کی سب سے بے وقوف لڑکی ہوں۔" وہ اضطرابی کیفیت میں ناخن کترنے لگی تھی۔ میرا دل پھر سے پگھلنے لگا۔

جو کچھ بھی ہوا اس میں ساری غلطی اس کی نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کی وہ رہنمائی و تربیت سے محروم ایک ننھی پھولی لڑکی تھی اور یہی سارا مسئلہ تھا۔ اسے وہ ماحول نہیں ملا تھا جو ملنا چاہیے تھا۔ اس کے انکل اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ اور پھپھو صرف پھوپھی ہونے کا فرض نبھا رہی تھیں۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کوئی پابندی نہیں تھی کوئی اچھا برا بتانے والا نہیں تھا۔ اس کی شخصیت کی کی یا کمزوری اس باعث تھی کہ اسے مکمل فیملی اور خوش گوار ماحول نہیں ملا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی ہالہ ———؟" میں خود بھی نہیں جانتا میرے منہ سے یہ سوال کیسے نکل گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں نے کچھ پوچھا ہے؟" اس کا گھر آگیا تھا میں نے گاڑی روک دی۔

"تم مذاق کر رہے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے اس کی حواس باختہ صورت دیکھی۔ "ٹھیک ہے۔ میں برائن لارا کی طرح نہیں دکھتا مگر۔ مجھے لگتا ہے میری شکل نکولس کیج سے تو ضرور ملتی ہے۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ بات ایک دن اسی نے مجھ سے کہی تھی۔

"تم مجھ جیسی اسٹوپڈ لڑکی سے شادی کرنا کیوں چاہو گے۔"

"تاکہ تمہیں تھوڑی چالاکی سکھا سکوں۔" اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"صرف اسی لیے۔" وہ کچھ مایوس سی ہو گئی۔

"باقی کی وجوہات۔ میں بعد میں روشنی ڈالوں گا۔ تم یہ بتاؤ میں تمہارے انکل سے بات کر لوں؟" میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا پھر بھی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر اگلے ہی پل دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔

"ہالہ ——— جواب تو دو۔" میں حیران رہ گیا۔ وہ گھوم کر میری کھڑکی کی طرف آگئی تھی۔

"میں بے وقوف ہی ٹھیک ہوں ——— میں نہیں چاہتی کہ تم صرف اس لیے اتنی زحمت اٹھاؤ چاچو سے بات ضرور کرنا اگر تمہارے پاس مجھ سے شادی کرنے کا کوئی اور ساؤنڈ ریزن ہو تو۔"

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے غصے سے کہا تھا۔ کچھ دیر حیران سی نظروں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"واہ کیا بات ہے۔ تم بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ جلد باز بھی ہو۔ مگر ٹھیک ہے۔ جس دن تمہارے چاچو سے بات کرنے آؤں گا۔ اپنے ساتھ ایک لسٹ بھی لیتا آؤں گا۔ ایک اچھا بھلا دماغ رکھنے والا ذی ہوش انسان بغیر کسی وجہ کے تو تم سے شادی کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔" میری بات سمجھ میں آتے ہی اس کے چہرے پر سرخی چھائی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان بکھری اور دوسرے ہی پل وہ پلٹ گئی۔

رات کے سناٹے میں سڑک پر اس کی ہنسی کی کھنک تک کافی گونج پیدا کر رہی تھی۔ مگر پہلی بار اس سے چڑنے کے بجائے مجھے وہ کسی دلآویز موسیقی کی طرح اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی لگی۔

اس کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھالی تھی۔ دوبارہ بہت جلد واپس آنے کے لیے۔ کیونکہ مجھے ہالہ کی مسکراہٹ میں اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

رشکِ حبیبہ

ایک تھوڑا سا ترا لیک سیر

وہ بھیگی جنوری کا بھیگا بھیگا دن تھا۔ کہرے بادلوں سے اٹے آسمان میں کہرے کے لحاف سے کبھی چھپتا کبھی جھانکتا نرم گرم سنہرا سورج زمین والوں کے لیے خاصا لطف آمیز تھا۔ پیڑ پودوں کی نکھری، تروتازگی بخشتی ہریالی نے موسم کی خوشگوارت کا سامان کر رکھا تھا۔ لیکن موسم کی یہ خوشگوارت اس گھر کے مخصوص پر تپش ماحول پر رتی بھر بھی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں؟۔ گھر کے ماحول کی گرما گرمی تو افراد خانہ کے ابلتے کھولتے مزاجوں کی مرہون منت تھی۔ گئے وقتوں کی مثل مشہور ہے کہ "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں" مگر امید واثق کہ اس گھر کی دیواروں کے اگر ذہن ہوتے تبھی تو اب تک حس



سماعت سے محروم ہو گئے ہوتے کہ اتنا شور شرابا اور چیخ پکار سنتے رہنا یقیناً" حسِ سماعت کے لیے نقصان دہ ہے۔

یاد رکھیے! حسِ سماعت کی بات ہو رہی ہے تو لگے ہاتھوں تذکرہ ہو جائے اس گھر کی سربراہِ عالیہ سطوت بیگم کا جن کی حسِ سماعت محرومی کی حد تک کمزور ہے اور ان کی یہ کمزوری ان کے لیے پریشانی کا سبب ہو تو ہو مگر ان کی بہوؤں کے لیے خاصی فائدہ مند ہے۔

مرزا استاد جہاں زیب کو دارِ فانی سے کوچ کیے سال ہونے کو ہے۔ یوں تو باپ کی زندگی میں بھی دونوں سپوت پوری طرح ماں کے تابعدار عرفِ عام میں۔ منّھی میں تھے مگر والد کے انتقال نے دونوں کو جذباتی حد تک ماں کا طرف دار کر دیا تھا۔ دونوں تھے بھی خاصے "غصہ ور" اوپر سے ماں نے کچھ جھوٹی سچی بتائی۔ ادھر بیویوں کی جان عذاب میں آگئی۔

دونوں بہوئیں بالترتیب اپنی ازدواجی زندگی کی آٹھ اور سات بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ بڑی دلہن کے بھی دو بچے منی اور گنڈو تھے تو چھوٹی دلہن نے بھی مقابلہ خوب نبھایا اور بلی اور ہیلو کو مرزا منزل کی رونق بڑھانے کو لے آئیں۔

مگر قابلِ ذکر عرصہ سسرال میں گزار لینے کے باوجود آج تک دونوں بہوؤں نے ساس سسر یا شوہر کے سامنے چوں کرنے کی بھی ہمت نہ کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں سیدھی سادی شریف النفس عورتیں تھیں۔

دونوں آپس میں ہی لڑ بھڑ کر اچھی طرح بھڑاس نکال لیا کرتی تھیں

یونہی کسی چھوٹی سی بات پر پہلے ایک نے اونچی چیخ کی۔ "جواباً" دوسری نے چیخ پکار مچائی۔

سطوت بیگم کا نچلا دھڑ مفلوج تھا۔ سو وہ سارا وقت ٹی وی پر سیاسی ڈراموں سے استفادہ کرتیں یا تسبیحات پر توبہ استغفار۔ باہر بہوؤں نے کون سی آفت اٹھائی ہے انہیں خبر نہ ہوتی۔

آج بھی بھیگے بھیگے ٹھنڈے موسم سے بے نیاز جٹھانی جی گرم تندور جیسی گفتگو کر رہی تھیں۔

دونوں مرد حضرات روزگار کی دوڑ دھوپ میں نکل چکے تھے۔ منی، گنڈو، بلی اور ہیلو۔ چاروں بچے اپنے اپنے باپوں کے ساتھ صبح سویرے ہی بیدار ہو گئے تھے۔ یوں بھی بچپن اور عہدِ ضعیفی میں نیند کم ہی نزدیک آتی ہے۔

چاروں بچے برآمدے میں کھلونوں کا ڈھیر لیے بیٹھے تھے۔ منی البتہ اسکول کا بیگ لیے کھلونوں کے ڈھیر سے دور تھی۔ دیورانی جی کل ہی ہفتے بعد میکے سے سسرال آئی تھیں۔ سو اب میاں کو روانہ کرنے کے بعد تھکن مٹانے کی غرض سے دوبارہ محوِ استراحت تھیں۔

"چھن" "چٹاخ" "تڑاخ"!

یہ آوازیں دائیں طرف والے کچن سے سنائی دیں۔ ممکنہ خدشات کے پیشِ نظر دونوں بہوؤں کا کچن کچھ سال پہلے ساس محترمہ کی ایما پر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

جٹھانی صاحبہ نے شدید غصے میں دو تین پلیٹیں دانستہ پٹخ کر توڑی تھیں جن کی پہلی تین پلیٹیں منی اور گنڈو کے ہاتھوں وقتاً "فوقتاً" چکنا چور ہو چکی تھیں۔
اس خاصی نازیبا حرکت کا مقصد دن چڑھے تک دیورانی صاحبہ کے کمرے میں روپوشی پر برہمی ظاہر کرنا تھا۔

طریقہ کارگر رہا کہ دیورانی جی کے کمرے سے بھی بڑبڑاہٹ بلند ہوئی۔

صحن میں پھدکتی ننھی منی چڑیائیں پھر اڑ گئیں۔ برآمدے میں کھلونوں سے کھیلتے بچے پہلے چونکے پھر سہم گئے۔ منی نے کلر بک میں رنگ بھرتے سر اٹھایا۔ بلی پہلے ہی ڈری ڈری نظروں سے کچن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چار اور پانچ برس کی منی اور بلی اتنی سمجھ دار تو تھیں کہ ماحول کی کشیدگی بھانپ لیتیں۔

البتہ ہیلو ان سب میں سب سے چھوٹا تھا اور جوس کی چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی بوتلوں کا بند دروازہ ننھی ننھی انگلیوں سے کھولنے کی بے کار سعی میں مصروف

تھا۔ پلیٹیں ٹوٹنے کی زوردار اور متواتر آوازوں سے سہم کر ایک دم حلق پھاڑ کر چلایا۔

جھوجھنک کا طبل بج گیا۔

"بس! اب چپ کرواؤ اس کم بخت کو۔ رونے کے لیے اس منحوس کی نانی اماں کافی ہے۔ اس کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔" ماں کی اونچی چنگھاڑتی آواز پر بجلی فورا" آگے بڑھ کر گندو کے قریب بیٹھے پپلو کو بہلانے لگی۔

"سکون نہیں اس گھر میں۔ ذرا جو دو گھڑی آرام کو مل جائے۔ صبح ہی صبح جاہلوں کی طرح حلق پھاڑ پھاڑ کے اپنے اگلے پچھلوں کو کوسنے دینا ضروری ہے۔" دیورانی جی کمرے سے نکل آئیں گویا کمر کس کے میدان میں اتر آئیں۔

"ہاں ہاں، ہم جاہل ہی بھلے! ہفتہ ہفتہ بھر ماں کے گھر ٹھہر کر تمیز تہذیب کی کلاسیں لینا ہمیں گوارا ہے نہ ہم اس کے مجاز۔ ہونہہ! عیاشیاں کرنے کو مہینے میں دس پندرہ دن میکے جا کر مرنا ضروری ہے۔ پیچھے چاہے کوئی جیے یا مرے۔ پھر آکر بھی مہارانی آٹھ دن اور پوری رات کمر توڑے پڑی رہتی ہیں۔"

جیٹھانی جی کا میکہ لاہور میں تھا اسی وجہ سے وہ سال میں فقط دو مہینے ہی میکے قیام کر کے لوٹتیں۔ مگر دیورانی جی کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہ تھی خیر سے ان کے میاں بھی کسی نہ کسی کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون شہر ہفتہ پندرہ دن کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس دوران دیورانی جی بھی میکے کا قصد باندھ لیتیں۔ خوش قسمتی سے سطوت بیگم وضع داری اور دنیا داری کا بڑا لحاظ رکھتیں سو دونوں بہوؤں کو میکے کی طرف سے کبھی پابند نہ کیا۔ وہ تو بڑی دلہن کا میکہ ہی دور تھا سو وہ دل مسوس کر مجبور ہو جاتیں۔

اس بار دیورانی جی کے میکے سدھارنے کے بعد جیٹھانی جی بیمار پڑ گئیں اور مصیبت یہ ہوئی کہ گھر کی دیکھ ریکھ سے لے کر ساس امی کی خدمت اور میاں جی کے ناز نخرے علاوہ ازیں بچوں کے ہزاروں کام۔ اور ایک تھی بے چاری جیٹھانی جی وہ بھی بیمار مگر اس بیماری میں بھی وہ جیتے مرتے ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہوتی رہیں کہ بیماری کم تھی اور ان کی ہائے وائے زیادہ اندر کی کھولن نکالنے کو دیورانی جی آج ہی میسر آئی تھیں۔

"بڑی دلہن! چائے نہیں آئی ابھی تک۔" ساس امی کے کمرے سے صدا بلند ہوئی۔ بڑی بہو ہونے کی وجہ سے جیٹھانی جی پر ذمہ داری بھی زیادہ تھی۔

"اٹھا پٹخ سے فرصت ملے تو کوئی کام بھی ہو۔" دیورانی جی نے موقع سے وار کیا۔ جیٹھانی جی گویا توے پر جا بیٹھیں۔

"تمہیں تو مل گئی ناپلنگ توڑنے سے فرصت۔" جواب دینے کی جلدی میں جیٹھانی جی نے چائے میں چینی کی جگہ نمک ملا دیا۔ دیورانی جی کو ان کا طعنہ ہضم نہ ہوا۔ لہٰذا اشتعال کے مارے ذات کی جھوٹی دیگچی سنک میں اٹھا پٹخی جس میں ابھی کچھ سالن موجود تھا۔ جیٹھانی جی کو بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جلدی کے بیچ کپ زمین پر دے مارا جس میں ساس امی کے لیے چائے نکالنے لگی تھیں۔

چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کپ یہاں سے وہاں تک زمین پر بکھر گیا۔ پپلو کھیلنا ترک کر چکا تھا۔ اب ٹکر ٹکر کبھی دائیں بائیں کی آوازوں پر کان دھر رہا تھا۔

"تڑاخ، تڑاخ، تڑاخ۔" اب کے برتن ٹوٹنے کی آواز چھوٹی دلہن کے کچن سے برآمد ہوئی تھی۔

"میرے بھی امی ابا نے جہیز میں برتن دیے ہیں مجھے۔" ساتھ ہی دیورانی جی کی پاٹ دار آواز بھی بلند ہوئی۔

"برتن کپڑے لتے ضرور دیے۔ نہ دیے تو شریفانہ اطوار نہ دیے۔" ساس کو دوسرے کپ میں چائے پہنچا کر کمرے سے نکلتے ہوئے جیٹھانی جی نے حساب بے باق کیا۔ ساتھ کنارے پڑی جھاڑو اٹھائی اور کچن کے فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑے سمیٹنے شروع کیے۔

"صبح سے طوفان اٹھا رکھا ہے شریفانہ اطوار سے بہرہ مند لوگوں نے۔ میں باز آئی ایسی شرافت سے۔" دیورانی جی اب واش روم میں میاں کی رنگین داغ دار

شرٹ دھونے کی غرض سے موجود تھیں۔ غلطی سے شرٹ بھگونے کے لیے سرف پانی میں حل کرنے کے بعد۔ بلیچ انڈیل دی۔ سوئے بدحواسی احساس بھی نہ ہوا۔

"میکے سے زبان دودھار کروا لائی ہیں محترمہ! اب بھلا باتوں میں کون جیت سکے ان سے۔" جیٹھانی جی نے ناک کروار کیا۔ کانچ اٹھاتے ہوئے بے احتیاطی سے کئی بار انگلیوں میں کانچ کے ٹکڑے پیوست ہوئے مگر غصے میں درد کا احساس نہ ہوا۔

"ہاں! تو میں نے کس کو زنجیریں ڈال رکھی ہیں مگر یہاں تو پہلے ہی ماشاء اللہ سے لوگوں کی زبانیں کاری وار کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ ضرورت ہی نہیں ہے دوبارہ سے دھنہ لگانے کی۔" وہ پلٹیں اور دیورانی جی کے غضب کا نشانہ بنیں۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر

منی نے بلند آواز میں نظم یاد کرنی شروع کی۔

جیٹھانی جی نے اب کانچ سمیٹ کر دیورانی محترمہ کو کرارا جواب دینا چاہا تو بات کچھ بن نہ پڑی۔ غصہ سر پہ سوار تھا۔ سجھائی نہ دیا کہ کریں تو کیا کریں۔ اسی پل گندو کی چیخ بلند ہوئی۔ ببلو اور گندو دونوں گتھم گتھا تھے۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر

منی کی آواز مزید بلند ہوئی۔

"گندو! چھوڑو اسے۔" جیٹھانی جی پل کے پل بچوں کے سر پہ پہنچیں اور دھادھم دھموکے گندو کی پشت پہ پڑے اور گندو کا حلق اونچے سروں پہ کلام کرنے لگا۔ دیورانی صاحبہ کیوں پیچھے رہتیں وہ بھی جائے وقوعہ پہ پہنچیں پھر تھا ببلو کا گال اور کرارے کرارے چماٹ! چٹاخ پٹاخ کئی چانٹوں سے استفادہ کرنے کے بعد دونوں بچے بلاتکلف "راگ بھیری" الاپنے لگے۔

بچوں کو پیٹ کر دونوں اماؤں کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑا۔ دونوں گہری گہری سانسیں لینے کے بعد حواسوں میں لوٹ آئیں تو دونوں معصوم بچوں کے سرخ سرخ چہرے اندرونی ملال سے دوچار کرنے لگے۔

مگر پھر اندرونی کیفیت پر چار حرف بھیج کر پہلے دیورانی جی نخوت سے منہ پھیرے کچن میں روپوش ہوئیں۔ پھر جیٹھانی جی نے بھی کمرے میں پناہ تلاشی۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر

منی کے لیے یہ سارے مناظر مانوس تھے اور وہ بچوں میں سب سے بڑی بھی تھی سو سارے ماحول سے بے نیاز اپنی نظم یاد کرنے میں مگن تھی۔

بلی البتہ خوف اور ترحم بھری نظروں سے ببلو اور گندو کو دیکھ رہی تھی۔ جن کے چہرے آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔

دیورانی جی اس بار مکمل حواسوں کے ساتھ کچن میں گئی تھیں۔ سو جلد ہی انہیں قیمتی اور عزیز ہلمٹوں کے ٹوٹنے کا بھی پتا چل گیا۔

جیٹھانی جی نے ہاتھ کی انگلیوں پر مرہم لگاتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔ پہلے ہی بے دھیانی میں کانچ ہاتھ سے اٹھانے لگی تھیں۔ نتیجتاً" ہاتھ زخمی ہوئے اور پھر جو گندو کی دھلائی کی تو کٹے ہوئے حصوں میں مزید چوٹ لگ گئی۔

لڑتے لڑتے ہوگئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دُم

منی نے نظم کا اگلا حصہ رٹنا شروع کیا۔ بلی جو کافی دیر سے منی کو ہل ہل کر نظم پڑھتے دیکھ رہی تھی۔ کسی سوچ میں غرق نظر آئی۔

دیورانی جی پہلے ہلمٹوں کے ٹوٹنے اور پھر رات کا سالن ضائع ہو جانے کا غم تمام کر کے اب جو غسل خانے کی طرف آئیں تو ان کا دل بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے کی ضد کرنے لگا۔

اور کیسے نہ کرتا!

میاں جی کی پسندیدہ رنگین شرٹ پہ پھیلتے اور چھپکے ہوتے رنگ کے بڑے بڑے دھبے بہار دکھا رہے تھے۔ کچھ دیر ہی بلیچ میں بھیگے رہنے کے باعث شرٹ اپنی

اصل حالت سے محروم بدرنگ اور بے رونق ہوچکی تھی اب تو اس شرٹ پہ آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے علاوہ کچھ چارہ نہ تھا۔

میاں جی کے عتاب کا سامنا کیسے ہوگا۔ دیورانی جی کی حالت پتلی ہونے لگی۔

ادھر جیٹھانی مرہم لگانے کے بعد کچن میں آگرا پنے لیے چائے نکال رہی تھیں۔ زبان ضرور رک گئی تھی مگر دل ہی دل میں صلواتیں ابھی بھی جاری تھیں۔ اسی کیفیت میں چائے کا گھونٹ بھرا۔ سرعت سے گھونٹ بھری چائے واپس پیک کی مانند پچکاری بن کر باہر آگئی۔

چائے نمکین تھی نا!

شومئی قسمت۔ ساس امی کو بھی چائے پہنچائی تھی۔ فوراً ادھر کا رخ کیا۔

"امی جی! وہ چائے۔" ان کی بات ساس جی غضبناک نظروں نے ادھوری۔ انہوں نے آنا "فانا" چائے کا کپ اٹھایا اور کمرے سے نکل آئیں۔

"میں ابھی دوسری بنا کر لاتی ہوں۔"

منمنا کر کہتے ہوئے بھی وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ خواہ کچھ بھی کرلیں اب۔ رات میں میاں جی کی حاضری لگنی ہے اور ان کی "جھاڑ پھونک" بھی یقینی ہے۔

ساس امی کا "ساس پنا" وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھیں۔

ایک تھا تیتر ایک بٹیر
لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہوگئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دم

دوسری چائے میں دھیان سے دودھ پتی اور چینی ڈالتیں جیٹھانی جی اور روتی صورت بھیگی آنکھوں کے ساتھ صحن کے تار پہ بدرنگ شرٹ سوکھنے کو پھیلاتی دیورانی جی۔ دونوں نے لک لک کر نظم پڑھتی منی کی آواز سنی بے دھیانی سے۔

"منی! تیتر کی چونچ گم ہوگئی تو وہ پریشان ہوا ہوگا نا؟"

ببلی کی آواز بھی دونوں نے سنی مگر غیر محسوس کی توجہ دی۔

"ہاں! ہوا تو ہوگا۔" منی نے لاپروائی سے کہہ کر پھر توجہ نظم پر مرکوز کی۔

ایک تھا تیتر' ایک بٹیر

"پھر تو بٹیر بھی رویا ہوگا۔ اس کی بھی تو دم کا مسئلہ ہے نا۔" وہ پھر بلاوجہ پریشان ہوئی۔

"ہاں! وہ بھی رویا ہوگا۔" منی نے پر سوچ انداز میں سرہلایا۔

لڑنے میں تھے دونوں شیر

"زیادہ درد کس کو ہوا ہوگا۔ تیتر کو یا بٹیر کو؟"

ببلی متواتر سوالات سے منی کی پڑھائی میں خلل ڈال رہی تھی۔

"دونوں کو برابر ہوا ہوگا۔" منی نے کچھ سوچ کر بتایا۔

لڑتے لڑتے ہوگئی گم

"دونوں آخر لڑتے کیوں تھے؟" ببلی نے ایک بار پھر اس کے ردھم میں رکاوٹ ڈالی۔

"گندے تھے نا۔" منی نے اس بار ترنج کر کہا۔

"میری ٹیچر کہتی ہیں۔ گندے بچے جھگڑا کرتے ہیں یہ دونوں بھی گندے تھے۔" منی نے اپنی معلومات اس تک پہنچائی۔

ایک کی چونچ اور ایک کی دم

منی کی نظم پوری ہوگئی۔ اس نے کتاب بند کردی مگر ببلی ابھی بھی الجھی ہوئی تھی۔

"منی۔!" اس نے کسی سوچ سے سر اٹھا کر منی کو پکارا تھا۔

"یعنی ماما اور تائی ماما بھی گندی ہیں کیا؟" دونوں امائیں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگئیں۔

"پتا نہیں! میں اپنی ٹیچر سے پوچھوں گی۔" منی نے متانت سے کہا اور کتابیں سمیٹ کر بیگ بند کرنے لگی۔

لیکن منی اور ببلی کے معصومانہ مکالمے نے دیورانی جی اور جیٹھانی جی کی بند عقل کا قفل ضرور کھول دیا۔

اور اگر آپ کی بند عقل کا قفل کھل گیا ہے تو بلاوجہ لڑنے بھڑنے سے توبہ کرنے میں دیر مت کیجئے!

حالانکہ نہیں ہے کچھ بھی آگے
پھر بھی میں قدم بڑھا رہا ہوں

جب سب نے بھلا دیا ہے اس کو
تب میں اُسے یاد آ رہا ہوں

بے وجہ نہیں مری خوشی
اک عمر میں لوٹتا رہا ہوں

بھولا ہوا یاد آ رہا ہے
یاد آیا ہوا بھلا رہا ہوں

وعدہ تھا، جسے نبھا رہا ہوں
ورنہ میں کہاں ترا رہا ہوں

مت روک ظفر کہ سوئے مقتل
میں اپنی خوشی سے جا رہا ہوں

صابر ظفر

راج ہنس

پہلے پہل جب شہر کو میں نے دیکھا تھا
شہر ہمارا
راج ہنس کی صورت قدم بڑھاتا تھا
شبنم کے قطرے جب صبح کو گرتے تھے
راج ہنس کی خاطر
سچے موتی ارزاں کرتے تھے
پنکھ پسارے اپنی دنیا ساتھ لیے
وہ پیہم رقص میں رہتا تھا
چترکار اپنی تختی پر اس کا روپ سجاتے تھے
دور دیس سے آنے والے
اس کی ایک جھلک پانے کو
وقت کی صورت رک جاتے تھے
اور اب ایسا قہر مچا ہے
زندہ رہنے کی کوشش میں
راج ہنس کو خون کے قطرے ہی ملتے ہیں

سحر انصاری



دلِ سودائی کو پیکار میں رکھ آئے ہیں
ہم کہانی کو بھی کردار میں رکھ آئے ہیں

وہ جو اک تیرے بچھڑنے کی گھڑی تھی اس کو
کب کا ہم عمرِ طلب گار میں رکھ آئے ہیں

وہ جو اک لمحۂ جاں سوز تھا حاصل تیرا
اس کو بھی وقت کی رفتار میں رکھ آئے ہیں

کیسے پائے گی بقا رسم شناسائی کی
جب تعلق کو بھی بازار میں رکھ آئے ہیں

اک زمانہ ہے شریکِ رہِ منزل اب تو
عزم وہ جرأتِ انکار میں رکھ آئے ہیں

نثار ترابی

میں سفر میں تھا، میں سفر میں ہوں، تجھے قربتوں کی خبر کہاں
تجھے راستوں کا پتہ نہیں، اسے منزلوں کی خبر کہاں

مرے بے خبر! تجھے کیا خبر، کہاں کون تجھ سے بچھڑ گیا
تجھے اپنی ذات عزیز ہے، تجھے دوستوں کی خبر کہاں

تُو عروج ہے، میں زوال ہوں، تُو یقین ہے، میں گمان ہوں
یہ ہمارا رشتہ اٹوٹ ہے، ہمیں فاصلوں کی خبر کہاں

یونہی کٹ گئے مرے روز و شب، تجھے کوئی کیسے بتائے اب
ترے ہجر میں جو ملے مجھے، تجھے ان دکھوں کی خبر کہاں

مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں، مجھے حوصلہ ہی ملا نہیں
مرے مہرباں! تجھے بھلا، مری خواہشوں کی خبر کہاں

سید علی سلطان

اسے ہنسنا سکھادیں

وجہ تعاقب

نام کار میں اپنی بیوی کے ساتھ سسرال جا رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے ایک خاتون ڈرائیور آرہی تھیں۔ انہوں نے اوور ٹیک کرنے کے لیے ہارن بجایا اور نام نے بڑی سعادت مندی سے انہیں راستہ دے دیا۔ وہ خاتون آگے نکل گئیں۔ لیکن آگے جاتے ہی خاتون نے اس حد تک اپنی کار ہلکی کرلی کہ مجبوراً "نام کو آگے نکلنا پڑا۔ خاتون نے دوبارہ اسے اوور ٹیک کیا۔

یہ کھیل دیر تک چلتا رہا۔ پہلے وہ خاتون نام کو اوور ٹیک کرتیں، پھر کار ہلکی کرکے اسے اوور ٹیک کرنے کا موقع دیتیں۔ وہ انہیں اوور ٹیک کرلیتا تو ایک بار پھر ان پر اوور ٹیک کا بھوت سوار ہو جاتا۔ تین بجلیا کے اس کھیل کے بعد کسی حادثے کے باعث آگے ٹریفک جام تھا۔ خاتون اور نام کو اپنی اپنی کاریں روکنا پڑیں۔ کار سے اتر کروہ خاتون کے پاس گیا اور بڑے ادب سے کہا۔

"محترمہ میں سمجھتا ہوں کہ میری ڈرائیونگ میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی، جس کی وجہ سے آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مسلسل اوور ٹیک کیوں کرتے رہے ہیں؟"

"اوہ" خاتون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں اس سوئٹر کا نمونہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہی تھی، جو تمہاری بیوی نے پہن رکھا ہے اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ تمہیں اوور ٹیک کرا کے سوئٹر دیکھوں اور دوبارہ اپنے آپ کو اوور ٹیک کرا کے سوئٹر پر نظر ڈالوں۔"

حمیرا شیراز۔ لیاقت آباد

آخری خواہش

خاتون پر نزع طاری تھا۔ زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اس نے پاس بیٹھے اپنے شوہر سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ جب میرا جنازہ قبرستان جارہا ہو تو تم میت گاڑی میں میرے بھائی کے ساتھ بیٹھو۔"

"یہ نا ممکن ہے۔" شوہر نے قدرے ناراضی سے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے بھائی سے سخت نفرت کرتا ہوں۔"

"مگر یہ میری آخری خواہش ہے جان۔ کیا تم یہ بھی نہیں کرسکتے میرے لیے۔" خاتون نے آخری ہچکیاں لیتے ہوئے کچھ افسردگی سے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو میں اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔" شوہر نے فرماں برداری سے کہا۔ "مگر سوچ لو ذرا۔ جنازے کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

ممتاز زبیر۔ نارتھ کراچی

سوچ

ایک خاتون کمبل کی دکان پر گئیں اور کمبل دیکھنے شروع کیے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ سیلز مین انہیں کمبل دکھا دکھا کر تھک گیا ہے تو انہوں نے جھینپی جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ اصل میں۔ میں نے یہ خریدنے نہیں ہیں۔ یہ تو میں یہ اپنی سہیلی کے لیے دیکھ رہی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں میڈم!" سیلز مین نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "مگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اس میں لپٹی ہوئی ہیں تو میں یہ آخری کمبل بھی آپ کو کھول کر دکھا دیتا ہوں۔"

نزالہ شہبانہ۔ ہجرت کالونی

غلط فہمی

عدالت میں جج نے ایک گواہ عورت سے کہا۔
"تم نے حیرت انگیز بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ایک ڈاکو پر یوں پل پڑیں۔ زبردست۔"
"مجھے یہ پتا ہی کب تھا" عورت نے صفائی پیش کی۔ "میں تو یہ سمجھی تھی کہ میرا شوہر دیر سے گھر آیا ہے۔"

حنا شاہد۔ ملیر

امپورٹڈ جہاز

ایک جہاز سمندر پر سے گزرتے ہوئے فضا میں ہچکولے کھانے لگا۔ جس پر مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی اور انہوں نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ اسی وقت اسپیکر پر کپتان کی آواز سنائی دی۔
"خواتین و حضرات۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک بہترین امپورٹڈ جہاز ہے۔ غیر ملکی ماہرین روزانہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ بالکل مطمئن ہو کر سفر کریں۔ کھڑکی سے باہر دیکھیں۔ نہایت خوب صورت نظارہ ہے۔ شام ہونے کو ہے۔ سورج کا سرخ گولا سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ لوگ رنگ برنگی کشتیوں میں سمندر کی سیر کررہے ہیں۔ آپ ایک پیلے رنگ کی کشتی بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ میں اسی کشتی سے بول رہا ہوں۔"

نورین فیاض۔ پاپوش نگر

میرا نام

ایک ریٹائرڈ پروفیسر صاحب کو ان کے دوست نے مذاق میں ایک مشروب پلا دیا۔ پروفیسر صاحب گھر جانے کو باہر نکلے تو راستہ بھول گئے۔ آدھی رات کو انہیں سڑک پر جھومتے دیکھ کر ایک کانسٹیبل ان کے پاس پہنچا اور نام دریافت کیا۔
"معلوم نہیں۔" پروفیسر صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"تمہیں اپنا نام بھی نہیں معلوم؟" کانسٹیبل کو شدید غصہ آیا تو پروفیسر صاحب ڈر گئے۔ پھر اپنے تئیں عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔
"آپ ایسا کریں۔ شاہراہ نمبر چار سو پانچ پر جائیں۔ ہاؤس نمبر بیاسی کی گھنٹی بجا کر پوچھیں ایڈورڈ گھر پر ہے؟ اگر جواب ملے۔ نہیں۔ تو سمجھ لیجئے گا کہ وہ میں ہوں۔"

نیر انیس۔ ناظم آباد

قیمت

تین چور چوری کی نیت سے ایک گھر میں داخل ہوئے۔ داخل ہونے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ یہ مشہور باکسر محمد علی کلے کا گھر ہے۔ یہ جان کر وہ چور تھر تھر کانپنے لگے۔ ایک بولا۔
"چپکے سے کھسک لو۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"
"ہائے۔ محمد علی کے مکے مار مار کر ہماری ہڈی پسلی توڑ دے گا۔" دوسرا گھبرا کر بولا۔
"گھبراؤ نہیں یارو!" تیسرا چور باہمت انداز میں بولا۔ "میں محمد علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جب تک پچاس ہزار ایڈوانس نہ لے لے۔ ایک مکا بھی نہیں مارے گا۔"

افشاں فرقان۔ سخی حسن

ترقی کا سفر

"تم کس جرم میں یہاں آئے ہو؟" جیل میں ایک قیدی نے دوسرے سے پوچھا۔
"میں شروع سے ہی محنت کرنے کا سخت عادی تھا۔" دوسرے قیدی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ بالکل نیچے سے اپنی ترقی کا سفر شروع کروں۔ دراصل میں۔ جیلر بننا چاہتا تھا۔"

یاسمین ظفر۔ لاہور

اعتراف

آمنے سامنے سے آتی ہوئی ایک خاتون اور ایک صاحب کی گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ خاتون گاڑی سے اتر کر معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔

"غلطی میری ہے۔"

"نہیں غلطی میری ہے۔" وہ صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار کو ایک خاتون چلا رہی ہیں۔ میں چاہتا تو جلدی سے اپنی گاڑی کچے میں اتار کر کسی درخت کے پیچھے پناہ لے سکتا تھا لیکن میں نے اپنی گاڑی کو سیدھا چلنے دیا۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی تھی۔"

فائزہ صلاح الدین۔۔۔ میٹروول

سوال

نیلام گھر میں طارق عزیز نے ایک نوجوان سے کہا۔

"آپ تمام مرحلے جیت چکے ہیں۔ اب صرف آخری سوال رہ گیا ہے۔ اگر آپ نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو آپ انعام کے حق دار ہوں گے اور اگر جواب نہ دے سکے تو کچھ نہیں ملے گا۔ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں سوال صحیح ترتیب سے پوچھوں گا لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں دوسرا حصہ پہلے پوچھ لوں۔"

"پوچھ لیں۔ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔" جیت جانے کے زعم میں نوجوان نے بے نیازی سے کہا۔

"بتایئے یہ واقعہ کس سن میں پیش آیا؟" طارق عزیز نے دریافت کیا۔

صائمہ عمران۔۔۔ جوہر ٹاؤن

صحت مند

ہسپتال میں دماغی امراض کے چند مریض رو بہ صحت تھے۔ ڈاکٹر نے ان میں سے ایک کا نفسیاتی جائزہ لینے کی غرض سے کہا۔

"تمہاری بیوی تم سے ملنے آئی ہے۔ باہر بیٹھی ہے، جا کر مل لو۔"

مریض نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ اس سے کہہ دیں کہ مجھ پر پاگل پن کے شدید دورے پڑتے ہیں۔ وہ میرے قریب نہ آئے، ورنہ میں اس کا منہ نوچ لوں گا۔"

ڈاکٹر نے اس کی یہ بات سن کر رپورٹ میں لکھا۔

"یہ مریض اب بالکل صحت مند ہو گیا ہے۔ اسے اسپتال سے رخصت کر دیا جائے۔"

مدیحہ احمد۔۔۔ گلشن اقبال

ٹماٹر

"میرے شوہر انتہائی بھلکڑ ہیں۔ کہیں جائیں تو لازما" اپنی کوئی نہ کوئی چیز ضرور بھول آئیں گے۔ دفتر میں کبھی کوٹ بھول آتے ہیں، کبھی چھتری، کبھی ہینڈ بیگ۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے انہیں ٹماٹر لینے بھیجا ہے۔ آپ دیکھ رہی ہوں گی کہ وہ واپس آئیں گے مگر تم دیکھنا۔ وہ ٹماٹر لانا بھول جائیں گے۔ میں یقین سے کہتی ہوں۔"

ایک خاتون بے زاری سے اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔ اسی لمحے خوشی سے بے قابو ہوتا ایک شخص گھر میں داخل ہوا اور چلایا۔

"بیگم! دیکھو مجھے کیا ملا ہے۔ سڑک پر ایک خبطی دولت مند میرے ہاتھوں میں اتنے بہت سارے نوٹ تھما کر تیزی سے اپنی کار بھگا لے گیا۔" یہ کہہ کر انہوں نے وہ ڈھیر سارے نوٹ بیوی کے سامنے رکھ دیے۔ بیوی نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پڑوسن کو دیکھا۔

"دیکھا تم نے۔۔۔ میں نے کہا تھا نا" یہ ٹماٹر لانا بھول جائیں گے۔"

ارم جاوید۔۔۔ پی آئی بی کالونی

یادوں کے دریچے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو (کسی رشتہ دار کے ساتھ) احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہے۔ بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے، جب اس سے قطع رحمی (بدسلوکی وغیرہ) کی جائے تو وہ صلہ رحمی (حسن سلوک) کرے۔"

(بخاری)

فائدہ:۔ اس حدیث سے صلہ رحمی کے حقیقی تقاضے واضح ہوتے ہیں۔ جو رشتے دار ادب واحترام سے پیش آئیں اور آپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ ظاہر بات ہے آپ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے لیکن یہ صلہ رحمی نہیں ہے، احسان کے بدلے احسان ہے۔ اس کے برعکس آپ کا ایک قریبی رشتے دار بداخلاق ہے، آپ سے بدسلوکی کرتا ہے۔ اور آپ سے تعلق توڑنے پر تلا رہتا ہے (جیسا کہ جہالت کے مظاہرے ہمارے معاشرے میں عام ہیں) لیکن آپ صبر و تحمل اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ بدسلوکی کا جواب حسن سلوک سے دیتے ہیں اور ترک تعلق کی کوششوں کے مقابلے میں تعلق برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ہے اصل صلہ رحمی جس کا تقاضا اسلام کرتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ یہ جذبات۔ انا اور وقار کا مسئلہ ہے۔ اس جھوٹی انا کو شریعت کے تقاضوں پر قربان کر دینا بہت دل گردے کا کام ہے۔ لیکن کمال ایمان بھی یہی ہے کہ ایسا کیا جائے ورنہ باہم مسکراہٹوں کے تبادلے میں تو کوئی کمال نہیں۔

موت کی یاد ،

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کتنی بڑی شان والے صحابی تھے۔ انہوں نے ایک آدمی کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا اور اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ تم مجھے وقتاً فوقتاً موت کی یاد دلاتے رہنا چنانچہ مختلف محفلوں میں وہ موت کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

ایک دن آپ نے ان سے فرمایا۔

"اب آپ کوئی دوسرا کام کر لیجیے۔"

کہنے لگے۔ "حضرت، کیا اب موت یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

آپ نے اپنے ریش مبارک کی طرف اشارہ کیا جس میں کچھ سفید بال آگئے تھے، فرمایا۔

"یہ سفید بال مجھے موت کی یاد دلانے کے لیے کافی ہیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر موت کی یاد آتی رہے گی۔"

ماخوذ "سکون دل"

علیمہ زمان۔ صوابی

مہکتی ہوئی بات ،

- پانی بن جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ پتھر نہ بنو جو دوسروں کا راستہ روک لیتا ہے۔
- اگر غلط فہمیاں دور نہ کی جائیں تو وہ نفرتوں میں بدل جاتی ہیں۔
- اہمیت دکھ کی نہیں بلکہ دکھ دینے والے کی ہوتی ہے۔ دور رہیے ایسے دوستوں سے جو کھیل ہی کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔

استغفار کا بیان ،

امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ مجھے عراق کے کسی گاؤں میں رات ہو گئی۔ میں ایک مسجد میں گیا مگر چوکیدار نے نکال دیا۔ میں مسجد کے باہر فرش پر سو گیا۔ چوکیدار نے مجھے پاؤں سے گھسیٹ کر مسجد سے دور کر دیا۔ اسی دوران ایک آدمی مجھے اپنے گھر لے آیا۔ وہ شخص چلتے پھرتے ہر کام کے دوران استغفار پڑھتا تھا۔ صبح میں نے

پوچھا۔

"آپ کو استغفار پڑھنے کا کچھ فائدہ ہوا؟"

اس نے کہا: "جی ہاں، میری ہر دعا قبول ہوئی سوائے اس کے کہ میری ملاقات امام احمد بن حنبلؒ سے ہو جائے۔"

میں نے کہا: "میں ہی احمد بن حنبلؒ ہوں اور تم دیکھو کہ مجھے کیسے گھسیٹ کر تمہارے پاس لایا گیا ہے۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

باعث عبرت

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فرعون ایک بادشاہ تھا جس نے حضرت موسیٰ کے زمانے میں خدائی کا دعویٰ کیا۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ فرعون دراصل ایک لقب ہے جو مصر کے بادشاہ اختیار کرتے تھے۔ ایسے سینکڑوں فراعنہ گزرے ہیں جن میں سے صرف چالیس حنوط شدہ لاشیں یعنی ممیاں محفوظ رہ گئیں۔ کیونکہ انہیں چوروں سے بچانے کے لیے بعد کے زمانوں میں پروہتوں نے اہرام سے نکال کر وادی شاہان کے ایک پہاڑ میں قدرتی غار میں محفوظ کر دیا۔ 1898ء میں اتفاقاً ایک چرواہے کے ہاتھوں دریافت ہوئیں۔

یہ ممیاں مصری عجائب گھر کے اوپری منزل کے ایک کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔

ان میں اس فرعون کی ممی بھی ہے، جس نے حضرت موسیٰ کی نبوت کو جھٹلایا تھا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے نیل میں اپنے لاؤ لشکر سمیت ڈوب گیا۔ اس کا نام فرعون منفتاح تھا۔ یہ رعمسیس دوم کا بیٹا تھا، جس نے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کی تھی۔ منفتاح کی لاش بیسویں صدی عیسوی میں سمندر سے نکالی گئی۔ جو قرآن پاک کے فرمان کے مطابق لوگوں کے لیے عبرت ہے۔ قرآن پاک میں لکھا ہے۔

"ہم تیرے بدن کو اخلاف کے لیے نشانی کے طور پر بچا لیں گے۔"

منفتاح کے نام کے ساتھ 1225 ق م لکھا ہوا ہے۔ قد ساڑھے پانچ فٹ ہوگا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے۔ اس کی لاش عجائب گھر میں پڑی ہوئی تمام ممیوں میں سب سے زیادہ ٹھیک حالت میں ہے۔ اور ابھی تک بالکل محفوظ ہے۔ اس کے تمام اعضاء صحیح و سالم ہیں جیسے ابھی حنوط کیا گیا ہو۔

اللہ کی راہ میں

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے۔ (سواریاں اتنی کم تھیں کہ) ہم چھ آدمیوں کو صرف ایک اونٹ ملا، جس پر ہم باری باری سوار ہوتے تھے۔ (پتھریلی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے) ہمارے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ اور ہمارے پاؤں گھس گئے اور میرے دونوں پیروں میں بھی چھالے پڑ گئے اور میرے ناخن جھڑ گئے۔ ہم اپنے پیروں پر پٹیاں باندھتے تھے۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام ذات الرقاع رکھا گیا کیونکہ ہم نے اپنے پیروں پر پٹیاں باندھی تھیں۔

یکسانیت

٭ اگر عقل سب میں یکساں ہوتی تو پھر سب کے سب لوگ لقمان ہوتے۔

٭ اگر سارے پتھر لعل بدخشاں ہوتے تو دنیا میں لعلوں کی قدر نہ ہوتی۔

٭ اگر موتی اولوں کی طرح ارزاں ہوتے تو ہر گھر میں ٹوکرے بھرے ہوتے۔

٭ اگر بڑ کے پیڑ کے پتے پان ہوتے تو بیل اور گدھے بھی انہیں کھانا پسند نہ کرتے۔

(خوشحال خان خٹک)

حنا سلیم اعوان۔ اخون باندی

تہمت

حضرت ابو عمران فلسطینیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عاصؓ کی بیوی ان کے سر میں سے جوئیں نکال رہی تھی۔ ان کی بیوی نے اپنی باندی کو آواز دی۔ باندی نے آنے میں دیر کر دی تو ان کی بیوی نے کہا۔

"او زانیہ!"

حضرت عمروؓ نے کہا: "کیا تم نے اسے زنا کرتے دیکھا ہے؟"

ان کی بیوی نے کہا: "نہیں!"

حضرت عمرؓ نے کہا: "اللہ کی قسم! تمہیں اس باندی کی وجہ سے قیامت کے دن اسی کوڑے مارے جائیں گے۔"

ان کی بیوی نے اس باندی سے معافی مانگی۔
باندی نے معاف کر دیا۔
حضرت عمرؓ نے کہا: "یہ بے چاری تمہیں کیوں معاف نہ کرے، یہ تمہاری ماتحت جو ہے۔ اسے آزاد کر دو۔"
ان کی بیوی نے کہا: "کیا یہ آزاد کرنا کافی ہو جائے گا؟" (پھر مجھے آخرت میں سزا تو نہیں ملے گی)
حضرت عمرؓ نے کہا: "ہاں امید ہے۔"

مکافاتِ عمل!

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک ظالم بدبخت کمزوروں پر ظلم کرتا اور ان کی لکڑیاں سستے داموں خرید کر انہیں زیادہ منافع پر فروخت کر دیتا تھا۔
ایک دن ایک نیک شخص نے اس سے کہا۔
"تو ہر ایک کو نقصان پہنچاتا ہے کیا تو سانپ ہے؟ یا پھر الو کہ جہاں بیٹھے وہاں ویرانی ہو۔ اگر تیرا زور ہم پر چلتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تیرا یہ زور اللہ عزوجل پر بھی چل جائے۔ اپنی زمین پر ظلم بند کر دے، کہ کسی مظلوم کی بددعا آسمان پر نہ پہنچ جائے۔"
اس ظالم نے اس نیک شخص کی نصیحت پر کان نہ دھرے یہاں تک کہ دولت کے نشے نے اسے گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا۔ ایک رات اس کی لکڑیوں کے گودام میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اب وہ نرم بستر کے بجائے گرم راکھ پر بیٹھتا تھا۔
ایک دن وہی نیک شخص وہاں سے گزرا تو اس نے اس ظالم کو کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"نامعلوم آگ کہاں سے آئی جس نے میرا گودام جلا کر خاکستر کر دیا۔"
اس نیک شخص نے کہا: "یہ آگ ان غریبوں کے دلوں کا دھواں تھا اور یہ ان پریشان دلوں کی آہ تھی جن پر تو ظلم کرتا تھا۔
یاد رکھو کہ پریشان دل کی آہ سارے جہاں کو پریشان کر دیتی ہے۔"
خسرو پرویز کی قبر کی محراب پر لکھا تھا: "چند روز تک حکومت کرنے کے بعد جب ہم خاک میں مل جائیں گے تو مخلوق ہمارے سروں پر چلے گی۔ اللہ جس طرح آج ہم حکومت کرتے ہیں اسی طرح کل دوسرے حکومت کر رہے ہوں گے۔ پس یاد رکھو کہ مظلوموں کی آہ سے بچو کہ اللہ عزوجل مظلوموں کی پکار نزدیک ہو کر سنتا ہے۔"
(حکایاتِ سعدیؒ - گلستان)

جواہر پارے!

- کسی ایک انسان کو متاعِ کل سمجھنا زندگی برباد کرنے کے مترادف ہے کیونکہ توحید کی صفت صرف اللہ کے لیے ہے۔
- ہمیں ادب، تصوف، بادشاہوں کے بارے میں باتیں کرنا اس جہاں کی مانند ہے جو اپنے بچوں کو ادب نہ سکھائے اور صرف اس کے بارے میں باتیں پوچھے۔ (ڈسرائیلی)
- ہمیشہ سچ بولو، سچ جذبے، خواہش کا اظہار کرو۔
- مصیبت زدوں کے لیے امید کے سوا کوئی دوا نہیں۔ (شیکسپیئر)
- جذباتِ انسانی میں سب سے زیادہ کارآمد جذبہ امید ہے۔

شفاعت بتول، نین تارا - جام پور

سوچ سمجھ کر بولو!

جس طرح ریت میں پانی کے قطرے جذب ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہمارے چند جملے کسی کے دل میں نشتر بن کر اتر سکتے ہیں۔ اور دوسروں کے دل میں دکھ کا احساس پیدا کر سکتے ہیں۔ جس طرح پانی کے چند قطرے ریت سے نکالے نہیں جا سکتے، اسی طرح ایک دفعہ زبان نکلی ہوئی بات کا اثر بھی دل سے —— نہیں نکالا جا سکتا۔ انسان اپنی تربیت معاف تو کر سکتا ہے بھول نہیں سکتا۔ اس لیے سوچ سمجھ کر بولیں۔

حلیمہ زمان - صوابی

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ثمانہ سحر —— ڈی جی خان

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

آسیہ جاوید —— علی پور چٹھہ

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

عائشہ خان —— ٹنڈو محمد خان

عشق تیری انتہا، عشق میری انتہا
تو بھی ابھی نا تمام، میں بھی ابھی نا تمام

افق آتش —— چیچہ وطنی

عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں!

شازیہ ہاشم —— کنڈیاں

موسم کو ہی فقط بدلتے نہیں
ہم نے انسانوں کو بدلتے دیکھا ہے

تحریم —— گوجرہ

اک لمحہ ملا تھا کہنے کو
زندگی بھر کی کیا بات کرتے

ثناء اجالا —— بھلوال

میرا خیال تھا یہ سلسلہ دلوں تک ہے
مگر یہ لوگ مرے خواب بھی بھلانے لگے

شگفتہ اکرم —— گاؤں کولیکی

لفظوں کے ستم، لہجوں کے آزار بہت ہیں
کہنے کو اس شہر میں غم خوار بہت ہیں

ندا، فضہ یوسف —— کراچی

شام آ رہی ہے ڈوبتا سورج بتلائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

درخشاں نور —— فیصل آباد

کچھ اور بڑھ گئی ہے اندھیروں کی زندگی
یوں بھی ہوا ہے جشن چراغاں کبھی کبھی

انعم قمر —— ملتان

ہم سے شکایتیں بجا، ہم کو بھی ہے مگر گلہ
چاہتے ہم نہیں اگر چاہتے آپ بھی نہیں

رخشانہ قمر —— لاہور

یہی نہیں ہے کہ ہمیں توڑ کر گیا ہے کوئی
اسے بھی خود کو بہت دیر جوڑنا ہوگا

[illegible] —— کراچی

[illegible] ایک ہو تو بتلائیں
اس کو کھونے کا اس کو رونے کا
بس یہی زندگی کا حاصل ہے
ایک احساس اپنے ہونے کا

زرغونہ خان —— پشاور

سوچا کیے کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں
خالد وہ بات تو اسے یاد بھی نہیں
ہم جی کو خون کر گئے جس کے ملال میں

نصرت زہرا —— کراچی

جاگا نہیں گیا کبھی سویا نہیں گیا
ہم سے حساب ہجر بھی نہیں رکھا گیا
اک عمر جن پہ جاں کو نچھاور کیے رہے
ان سے ہمارا حال بھی پوچھا نہیں گیا

بشریٰ خالد —— کراچی

جس دل آرا کی خاطر پائی رسوائی بہت
ہم نے اپنے عشق کی سچائی دکھلائی بہت
کیا ملے تجھے زنجیر رفاقت توڑ کر
تو بھی تنہا میں بھی تنہا اور تماشائی بہت

نمرہ اقصیٰ ـــــــ کراچی

خوشی بول اٹھے ہر نظر پیغام ہو جائے
سنا تا اگر حد سے بڑھے کہرام ہو جائے
شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کر چلتے ہیں جو راستہ عام ہو جائے

لائبہ ـــــــ چونیاں

اگر کچھ قیمتی لمحے نکل آئیں کسی صورت
چلو اس دل کی خاطر ہم بھی کوئی کام کر جائیں
کئی شامیں گزار دی ہیں غم حالات میں ہم نے
تمہارے نام اک سندر سہانی شام کر جائیں

ماہ زیب ـــــــ چونیاں

مجھے اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اسی سے کہتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں سے کانٹا نکال دیتا ہوں

ارم کمال ـــــــ فیصل آباد

عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے
کسیلا جو بھی تھا جاناں اب تو اب یہی رہا
جیت خواہ کسی کی ہو ہم نے ہار مانی ہے

عابدہ جلاؤ ـــــــ کبیر والا

تیرے نام کی جو روشنی اسے خود ہی تو نے بجھا دیا
نہ جلا سکی جسے دھوپ بھی اسے چاندنی نے جلا دیا
میں یوں گردشوں میں گھر ہوا مجھے اب اپنی خبر نہیں
وہ جو شخص تھا میرا رہنما اسے راستوں میں گنوا دیا

حرا قریشی ـــــــ ملتان

تیرے قریب رہ کر بھی تجھے تلاش کروں
محبتوں میں مری بدحواسیاں نہ گئیں
خدا خبر کہاں گو بچوں کے قافلے اترے
سمندروں کی طرف بھی تو پیاسیاں نہ گئیں

عالیہ عثمان ـــــــ چکوال

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا

ستارہ سحر ـــــــ موسیٰ شریف

ایسے ٹوٹا ہے تمناؤں کا پندار کہ بس
دل نے جھیلے ہیں محبت میں وہ آزار کہ بس
ایک جھونکے میں زمانہ میرے ہاتھوں سے گیا
اس قدر تیز ہوئی وقت کی رفتار کہ بس

عائشہ جمیل ـــــــ کراچی

تھا کوئی جو میرے دل کو زخم دے گیا
زندگی بھر جینے کی قسم دے گیا
لاکھوں پھولوں میں سے ایک پھول چنا تھا میں نے
جو کانٹوں سے بھی گہری چبھن دے گیا

الوینہ فاطمہ، راحیلا بتول ـــــــ ملتان

وہ یہ ہم جان اتنا تھی میری کج ادائی کے پیچھے
تجھے بھولا کیوں نہ جاتے اگر اختیار ہوتا

کائنات اصغر، بروز ڈار ـــــــ ڈہرکی

میرے یادہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جاں پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

عابدہ پروین ـــــــ رحیم یار خان

سو اب بند مٹھی میں اندھیروں کی حکومت
مجھے جگنو ہتھیلی میں چھپا لینے کی عادت تھی
میں ان کو ڈال کر دانا بہت مسرور ہوتی تھی
مجھے آنگن کی چڑیوں سے دعا لینے کی عادت تھی

فوقیہ رباب جمیر ـــــــ بورے والا

شک تو تھا کہ محبت میں خسارے ہوں گے
یقیں نہ تھا کہ سارے ہمارے ہوں گے

نوال افضل تبسم ـــــــ گجرات

کیا ملے مجھے زنجیر رفاقت تو ذکر
تو بھی تنہا میں بھی تنہا اور تماشائی بہت
عمر بھر کی ریاضتیں یہ نگر نگر کی مسافتیں
یہ تو رونگ میں سو سال کا یہ تو گردشیں ہیں سفر نہیں

سونیا خان ـــــــ لاہور

تیری آرزو ہی کا فیض ہے تیری یاد ہی کا کمال ہے
کبھی مجھ کو تیرا خیال تھا مگر آج اپنا خیال ہے

شعاع کے ساتھ

ادارہ

یاسمین حنفی۔ کراچی

1 ۔ شعاع کے ساتھ وابستگی تو خیر بچپن سے ہے' بہنوں کو پڑھتے دیکھتے تھے باقاعدگی سے پڑھنا 3 سال پہلے شروع کیا ہے' ورنہ پہلے تو جو ہاتھ آیا پڑھ لیا کرتے تھے (سمجھ میں جو نہیں آتا تھا) خاص واقعہ تو خیر یاد نہیں بس اتنا کہ پہلے ابو منع کرتے تھے پر اب میرے پیارے ابو خود لا کے دیتے ہیں۔

2 ۔ روز مرہ کی مصروفیات بس ایک جیسی ہی ہیں' صبح نو بجے اٹھتی ہوں' میاں کو ناشتا بنا کے دیتی ہوں پھر بھی تین کے سو جاتی ہوں لائٹ جو نہیں ہوتی' پھر دوبارہ بارہ بجے اٹھتی ہوں گھر کے کام کاج' برتن' متفرق کپڑے (ہفتے میں دوبار مشین لگاتی ہوں) پھر جب ہم ہوتے ہیں اور ہماری ٹی وی۔ موڈ ہوا تو سلائی تو حلق بھی کرلیتے ہیں ورنہ پڑوسیوں سے گپیں لڑاتے ہیں' بس جی پھر شام کا کھانا تھوڑا اہتمام سے پکاتی ہوں۔

3 ۔ پسندیدہ تحریریں۔ سب سے پہلا ناول جو پڑھ کے ہم بہت روئے تھے وہ تھا یہ وطن ہم کی کہانی۔ رائٹر کا نام یاد نہیں۔ اور بھی کتنے ناول ہیں جو دل کو چھو کے گزرے۔ جنت کے پتے۔ شہر دل کے دروازے۔ مرگ وفا زندگی اک روشنی' اپنی جھلک تو خیر آج تک کسی بھی ناول میں نظر نہیں آئی۔

4 ۔ خوبیاں اور خامیاں۔ تو جناب بدولت کے حساب سے تو ہماری اتنی خوبیاں ہیں کہ اب اپنے منہ سے کیا کہیں پر کچھ تو لکھنا ہے (خامیاں بھی ویسے کوٹ کوٹ کے بھری ہیں تو جناب پہلے خامیاں ...... ضدی' بہت جلا ننہ' پھٹ بھی کہہ سکتے ہیں اور میرے حساب سے جو سب سے بڑی خامی وہ یہ کہ میں کسی کو معاف نہیں کر سکتی' جس نے مجھے تکلیف دی ہو اس سے پھر دوبارہ (آخری حد تک کوشش کرتی ہوں کہ) سامنا نہ ہی ہو تو اچھا ہے (اس کے لیے) خوبیاں تو یہ ہے کہ ہر کسی کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں' راز دار ہوں اور کسی کو کچھ بھی منہ پر نہیں جتاتی (بس یار بہت ہو گیا ناں)

5 ۔ تو سادہ ہے۔ کبھی ہم بھی بڑا انجوائے کیا کرتے تھے' سب بہن بھائی ساتھ ہوتے تھے اب تو بس دور سے بیٹھ کے ہی نظارہ کر لیتے ہیں (سب بہن بھائیوں کی شادی جو ہو گئی ہے!)

6 ۔ پسندیدہ اقتباس۔ شازیہ چوہدری کے شہر دل کے دروازے۔ سب سے پہلے سے اپنی اولاد کو ایک وقت کا کھانا کھلاؤ' مگر انہیں اپنی محفوظ و معتبر محبت سے نوازو کہ انہیں کل کلاں کو یہ محرومی دور کرنے کے لیے وہ کسی غلط در پہ دستک نہ دے' بیٹھیں۔ اور شعر

وہ اچھا ہے تو بہتر' برا ہے تو بھی قبول
مزاج عشق میں عیب یار نہیں دیکھے جاتے

مقدس ارشد لکھنوال کلاں ضلع گجرات

1 ۔ شعاع اور اپنی دوستی کے بارے میں یہی کہوں گی کہ جب سے لفظوں کو جملوں میں بولنا سیکھا تب سے شعاع کو دیکھ رہی ہوں پہلے امی پڑھتی تھیں پھر بڑی بہن (حنا صدف) میں ان کا مذاق اڑاتی تھی کہ ہر ماہ ڈائجسٹ منگوانے کی کیا ضرورت ہے ایک جیسی ہی کہانیاں ہوتی ہیں' پر جب خود شعاع کا چسکا لگا تو اس کا جواب مل گیا کہ شعاع کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔

2 ۔ صبح کا آغاز پرندوں کی چہچہاہٹ اور موذن کی پکار سے ہوتا ہے نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی سی تلاوت کی سعادت حاصل کرکے دن کے سکون و اطمینان (جو کہ تلاوت قرآن سے حاصل ہوتا ہے) کے ساتھ کام کا

آغاز کیا جاتا ہے۔ آتا تو امی ہی گوندھتی ہیں (یہ نہیں کہ مجھے گوندھنا نہیں آتا جناب آتا ہے بس امی کے ہاتھ سے گوندھے آٹے کی روٹیاں ذرا خستہ بنتی ہیں) پھر سب گھر والوں کو ناشتہ کروانے کے بعد امی برتن دھوتی ہیں میں اور باجی جھاڑو پونچھا کر لیتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا بنانے تک میرا اور شعاع کا ساتھ ہوتا ہے۔ ایک بجے دوپہر کی ہنڈیاں چڑھا کر ساتھ ہی تندور پر روٹیاں بنا لیتی ہوں ظہر کی نماز پڑھ کے کھانا کھایا جاتا ہے۔ (بقول نانی اماں کھانا کھا کر شیطان سستی پیدا کر دیتا ہے "نماز پہلے پڑھ لو) پھر آرام کیا جاتا ہے۔ عصر کے ٹائم بچے ٹیوشن پڑھنے آجاتے ہیں۔

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد چائے پی جاتی ہے۔ اگر چاول پکے ہوں تو رات کو کھا لیے جاتے ہیں ورنہ گرمیوں میں چائے کے ساتھ فروٹ کیک وغیرہ ہی ہو جاتا ہے سات سے نو بجے تک اگر لائٹ ہو تو ایجوتی دیکھتے ہیں پھر نو بجتے ہی امی کی آوازوں کے ساتھ اٹھ کر وضو کر کے نماز عشاء ادا کرتے ہی بستر پر دراز ہو کر گوش کے مزے اڑاتے ہیں کیونکہ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے جناب۔

3 - آج کل رتعی بسمل میں مجھے اور رامر تعنی میں اپنی بہن کی جھلک نظر آتی ہے۔ شعاع کی ہٹ کی تحریریں ہیں جو ایک خوبصورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں کبھی نہ بھولنے والی نمرہ احمد کی "قراقرم کا تاج محل" جنت کے پتے" "ماہ ملک "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" "کال ٹل کے موسم" "تیری راہ میں رُل گئی" وے" مصنف "فائزہ افتخار" "اک نئی سنڈریلا"

4 - کوئی بھی انسان دنیا میں ایسا نہیں جو خوبیوں و خامیوں سے ماورا ہو۔ خیر جناب بدولت میں موجود خوبی (بقول امی) خدمت گزار بیٹی ہوں دوسروں کی خواہشات کو ترجیح دیتی ہوں۔ کبھی کسی فقیر کو خالی نہیں بھیجا (بقول باجی) ضدی ہوں غصہ جتنی جلدی آتا ہے اس سے جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ کسی بات کو بھی دل میں نہیں رکھتی۔

ساون کا موسم کسے پسند نہیں ہوگا بارش بہت اچھی لگتی ہے خصوصاً" بارش کے موسم میں چائے کے ساتھ پکوڑے اور کانوں میں واک مین پر گانا۔

"میرے یار بدل نہ جانا موسم کی طرح" سننا پسند ہے۔

آخر میں بس یہ کہوں گی کہ زندگی، محبت، بھروسا ایک بار ختم ہو جائیں تو دوبارہ یہ چیزیں نہیں ملتیں سوچ سمجھ کے گزاریں۔

واصفہ سہیل



توفیق کی بات

بھارتی اداکارہ مونیکا نے اسلام قبول کرنے کے بعد فلم میں کام کرنے کی پچاس کروڑ روپے کی آفر ٹھکرا دی۔ چنائے شہر میں ایک پریس کانفرنس میں رحیمہ (رحیمہ مونیکا کا اسلامی نام ہے۔) نے کہا کہ میں فلمی دنیا کو خیرباد کہہ چکی ہوں۔ اب ایک ارب روپے کی بھی آفر قبول نہیں کروں گی۔ میری دعا ہے کہ میرے والدین بھی اسلام قبول کریں۔ (آمین)

رحیمہ نے دس برس کے دوران پچاس سے زائد ہندی اور تیلگو فلموں میں کام کیا ہے اور پانچ ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں۔ پریس کانفرنس میں رحیمہ (مونیکا) نے بتایا کہ ان کا اسلام قبول کرنا کسی دنیاوی مقصد یا شہرت دولت کے لیے نہیں بلکہ انہوں نے چار برس اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر اسلام قبول کیا ہے۔ کیونکہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے۔ رحیمہ کے والد عیسائی اور والدہ ہندو ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کے اسلام قبول کرنے پر خوش ہیں۔

سازش

بھارتی فنکارائیں اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلتی نظر آتی ہیں اور اکثر بعد میں اس کی تردید کرکے ایک دوسرے کی دوست بھی بن جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں جگنو کاظم بھی اداکارہ نور کے خلاف بیان بازی کرتی نظر آئیں۔ جگنو کاظم اداکاری اور ماڈلنگ کے ساتھ ساتھ آج کل مارننگ شو بھی کررہی ہیں۔



جگن کاظم نے نور کے بارے میں کہا کہ "اداکارہ نور کی اتنی اوقات نہیں ہے کہ وہ میرا مقابلہ کریں۔ میں نے ہمیشہ معیار کو ترجیح دی ہے۔ (کس چیز کا معیار؟) جبکہ نور جیسی اداکاراؤں کا معیار سب کے سامنے ہے۔ (جگن فنکار تو ایک برادری کی طرح ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی کی اوقات کسی کی برتری جیسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں' کم از کم آپ جیسی پڑھی لکھی اداکارہ سے۔) نور میرے خلاف شوبز حلقوں میں سازشیں کررہی ہیں۔ لیکن وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوں گی۔ (تو پھر ڈر کس بات کا؟) کیونکہ شائقین میرے کام کو پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر سازشوں کے باوجود میں آج شوبز میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہوں۔"

اسکینڈل

ہمایوں سعید کہتے ہیں کہ فنکاروں کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے رہتے ہیں۔ اس کو غلط رنگ دینا بیمار ذہنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اشنا شاہ کے ساتھ میرے نام کو جوڑنا درست نہیں۔ سوشل میڈیا پر جعلی اور من گھڑت اسکینڈل پھیلانے والے لوگ نئے لوگوں کو آگے آنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ (لیکن سمجھنے کی بات یوں ہے کہ صرف "اشنا" کا نام ہی کیوں' ہیں جی؟) اشنا میری نئی فلم (زندگی کی؟) میں اہم کردار کے لیے منتخب کی گئی ہیں۔ شاید لوگوں کو (کون سے لوگوں کو؟) یہ بات ہضم نہیں ہورہی۔ ماضی میں بھی میرے ساتھ کئی اداکاراؤں کے نام لیے جاتے رہے ہیں' لیکن وہ سب غلط ثابت ہوئے۔ (تو پھر پریشانی کس بات کی' اگر غلط ہوا تو پھر سب چپ ہوجائیں گے۔)

ہمایوں نے مزید کہا کہ میں اس وقت ڈراموں اور فلموں کی شوٹنگز میں اتنا بزی ہوں کہ اسکینڈل چلانے کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔ (اور اگر خود چل جائے تو۔؟) میرے اس اسکینڈل کا مرکزی کردار کوئی اور ہے جس کا مجھے ہی نہیں بلکہ پوری انڈسٹری کو پتا ہے۔



(لوگوں کی بات ہے ہمایوں سر بزم نہ اچھالیں۔) لیکن میں کسی کا بھی کیچڑ اچھالنے کے حق میں نہیں ہوں۔ (ہاں چھینٹوں سے تو ڈر ہوتا ہے نا!)

ترجیح

اداکارہ ماریہ واسطی کو بچپن سے دیکھنے والے بچے بڑے ہوگئے' لیکن ماریہ واسطی نے اپنے آپ کو بہت فٹ فاٹ رکھا ہوا اور وہ اب بھی مرکزی کردار ادا کررہی ہیں۔ (دینے والوں کا حوصلہ ہے بھئی۔) ماریہ کہتی ہیں کہ لاہور ٹی وی پر بہت کام کیا ہے۔ (چلو جی قسمی مانتے تو ہو۔) اور اس شہر کے حوالے سے بہت اچھی یادیں وابستہ ہیں۔ کراچی میں ڈراموں کے حوالے سے ان دنوں زیادہ اور بہتر کام ہورہا ہے۔ اس لیے بیشتر فنکار کراچی شفٹ ہورہے ہیں۔ (جی ہاں جب ہی ہر چینل پر اب چند مخصوص لوگ ہی ہر ڈرامے میں نظر آرہے ہیں۔ بعض میں تو گیٹ اپ بھی نہیں بدلا جاتا۔) لیکن کراچی میں مصروفیت کے باوجود لاہور جانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی۔

ماریہ کا مزید کہنا تھا کہ کچھ عرصے سے میں نے منفی کرداروں کو ترجیح دینا شروع کی ہے۔ (کیونکہ ہیروئن کا



کردار اب چیتا تمھیں ہے نا) جس سے میری بھی مقابلہ میں نکھار آیا ہے۔ (کاش یہ فیصلہ آپ پہلے کرلیتیں۔) میں صاف ستھرا کام کرتی ہوں اور کام کے لیے کسی سے سفارش نہیں کرواتی۔ ان دنوں بھی فلمیں بن رہی ہیں۔ اگر کوئی مجھے کسی اچھی فلم کی آفر کرے گا تو میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔ (جی ہاں ضرور کرسکتی ہیں' آخر صائمہ بھی تو کررہی ہیں۔)

قسمت

آج کل فلم انڈسٹری میں فلمیں نہ ہونے کے برابر بن رہی ہیں اور ان میں بھی چند مخصوص چہرے ہی نظر آرہے ہیں۔ اس کا حل ہماری انڈسٹری کی اداکاراؤں نے یہ نکالا ہے کہ وہ ٹی وی اور تھیٹر کی طرف آگئی ہیں۔ اب جن کو یہاں بھی امید نظر نہیں آرہی ہے وہ ادھر ادھر ہاتھ مار رہی ہیں (کہ کہیں تو دال گلے۔) اداکارہ زارا شیخ بھی فلم سے مایوس ہو کر اب گلوکاری کے میدان میں قسمت آزمانے کا ارادہ رکھتی ہیں اور ان دنوں وہ گائیکی کی تربیت لے رہی ہیں اور بہت جلد اپنی ایک ویڈیو بھی بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ (یعنی گلوکاری کی آڑ میں اداکاری) لیکن زارا اگر یہ ویڈیو بھی آپ کی دس سال قبل بننے والی فلم "دیوداس" کی طرح ریلیز نہ ہوسکی تو پھر آپ کیا کریں گی؟

ادھر ادھر سے

شیخ رشید کو اس بات کا بھی غصہ ہے کہ الیکشن سے قبل نواز شریف نے ان کی صلح صفائی کی تمام کوششیں ناکام بنادیں اور انھیں دوبارہ اپنی پارٹی میں لینے سے انکار کردیا۔

(رؤف کلاسرا۔ راولپنڈی)

دہلی کے اسٹوڈیو میں طلبا نے سشما سوراج سے جس قسم کے سوال کیے۔ ان کا لب لباب یہ تھا کہ بھارت ایک ہی دفعہ پاکستان پر ایٹم بم پھینک کر اسے ملیا میٹ کیوں نہیں کردیتا۔ بھارت کیوں پاکستان پر فوج کشی کرکے اسے سبق نہیں سکھاتا' پاکستانیوں پر جب تک بھارتی ٹینک نہیں چڑھائے جائیں گے تب تک دہشت گردی ختم نہیں ہوگی۔ بظاہر فیشن ایبل اور ماڈرن نظر آنے والے ان طلبا نے جس جنگی جنون کا مظاہرہ اس پروگرام میں کیا کم از کم مجھ جیسے شخص کے لیے وہ چشم کشا تھا۔

(یاسر پیرزادہ۔ ذرا ہٹ کے)

کراچی میں 300 ڈاکٹروں کو بھتے کی کالز موصول ہوئی ہیں۔ یہ کالز جنوبی افریقہ سے کی جارہی ہیں۔

(شرجیل میمن کا انکشاف)

انتخاب: منور

واقعے کے جھروکے

حضرت لیا (حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجہ محترمہ)

حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر مثالی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام دنیاوی نعمتیں عطا کیں اور پھر وہ نعمتیں آپ سے واپس لے لی گئیں' لیکن اچھے حال میں اور مصیبت میں صبر کا دامن نہ چھوڑا اور دونوں حالتوں میں ثابت قدم رہے اور آج بھی دنیا والوں کے لیے صبر کی اعلا ترین مثال ہیں۔

حضرت لیا علیہ السلام انہی نبی کی وفا شعار' صابر' نیک اور راست گو بیوی تھیں۔ وہ اللہ کی شکر گزار بندی تھیں جنہوں نے سخت آزمائش کے وقت بھی اپنے شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ صبر کیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی اطاعت کی حلاوت سے نوازا۔ ابن عساکر نے ان کا نام لیا علیہ السلام بتایا ہے۔ یہ یشا بن یوسف علیہ السلام بن یعقوب علیہ السلام بن اسحاق علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام کی بیٹی ہیں۔ ابن کثیر نے ان کا نام رحمت بنت افرا ئیم بتایا ہے۔

ایوب علیہ السلام نہایت امیر و کبیر شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے تحاشا مال و دولت اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھرپور نوازا تھا جن میں سرفہرست وسیع و عریض سرسبز و زرخیز زمینیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ پورا البثنیہ اپنی وادیوں اور پہاڑوں سمیت ان کی ملکیت تھا۔ ان کے پاس ایسے عمدہ اور خوش منظر گھوڑے تھے جن پر نگاہ نہ ٹکے۔ لاتعداد اونٹ' گائیں' بکریاں ہر قسم کے مویشی ان کی ملکیت تھے۔ کہا جاتا ہے ایوب علیہ السلام کے پاس ایک ہزار بکریاں مع اپنے چرواہوں کے موجود تھیں اور ان کے خدام لونڈیوں اور غلاموں کا تو کیا کہنا جو زمین اور جانوروں کی خدمت پر مامور تھے۔

ایوب علیہ السلام نہایت متقی' نیک اور رحم دل انسان تھے۔ غربا و مساکین کی مدد کرنا' یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کرنا' مہمانوں کی خاطر کرنا' مسافروں کی اعانت کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔

ایوب علیہ السلام کی بیوی لیا اس پر آسائش زندگی میں خوش اور مطمئن تھیں مگر ساتھ ہی وہ اللہ کے حقوق سے ہرگز غافل نہ تھیں۔ ہر دم اس کی بے شمار نعمتوں کا شکر ادا کرتی رہتی تھیں۔ وہ عبادت گزار اور شکر گزار بندی تھیں جو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اپنے بیٹے بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں اور اپنے پروردگار کی مشکور و ممنون رہتیں جس نے ان پر اور ان کے شوہر پر بے تحاشا رزق' مال و دولت اور اولاد جیسی نعمتوں کی بارش کر دی تھی اور ان کو اپنے بندوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی۔

مولانا امین احسن اصلاحی "تدبر قرآن" میں لکھتے ہیں:

"سفر ایوب" میں ہے کہ (حضرت ایوب علیہ السلام) ان کی اس حالت پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بڑا حسد ہوا۔ انہوں نے ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اگر ایوب علیہ السلام دن رات خدا کی عبادت میں لگے رہتے ہیں تو یہ کیا کمال ہوا۔ خدا نے جب اتنا مال و اسباب دے رکھا ہے تو عبادت نہ کریں تو اور کیا کریں۔ ہم تو جب جانیں جب خدا یہ ساری چیزیں ان سے چھین لے پھر بھی وہ اس کے عبادت گزار رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے انہیں محروم کر دیا۔ نہ ان کے پاس مال کی قسم کی کوئی چیز رہ گئی

نہ اولاد، خدم و حشم باقی رہے۔ ایک ایک کر کے سب ہلاک ہوتے چلے گئے لیکن وہ اس عظیم مصیبت سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے حضور سجدے میں گر پڑے۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا "تو نے میرے بندے کو دیکھ لیا سب کچھ چھن جانے کے باوجود میرا ہی ہے۔"

اس پر شیطان نے کہا "یہ مال و اولاد کا معاملہ تھا اس لیے وہ صبر کر گیا۔ میں تو جب جانوں جب تو اسے شدید قسم کے جسمانی آزار میں مبتلا کر دے اور پھر بھی وہ تیرا عبادت گزار رہ جائے۔"

تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک ایسے مرض میں مبتلا کر دیا کہ ان کے سارے جسم پر پھوڑے نکل آئے مگر اس تکلیف کے بعد وہ اللہ کے ذکر میں اور بڑھ گئے اور اس آزمائش میں بھی انہوں نے شیطان کو شکست دے دی۔

اور کہنے لگے "اے پالنے والوں کے پالنے والے۔ تو نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کیے ہیں مال دیا اولاد بھی دی اس وقت میرا دل بڑا مشغول تھا اب تو نے سب کچھ لے کر میرے دل کو ان فکروں سے آزاد کر دیا۔ اب میرے دل میں اور تجھ میں کوئی حائل نہ رہا۔"

یہ بیماری کوئی ایک مدت تک نہ تھی بلکہ سالوں پر محیط تھی مگر اس حالت میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام کے پایہ استقلال و صبر میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ آئی اور وہ دن رات اپنے رب کا ذکر کرتے اور لمحہ بہ لمحہ اسے یاد کرتے۔

ایوب علیہ السلام کا مرض طول پکڑتا گیا۔ بیماری نے شدت اختیار کر لی سب عزیز و اقارب نے ان سے منہ موڑ لیا۔

ان تمام حالات میں صرف اور صرف ان کی بیوی لیا علیہ السلام تھیں جو ہر دم ان کے ساتھ تھیں۔ جن کے دل میں اس حال میں بھی اپنے شوہر کے لیے محبت و ہمدردی تھی۔ وہ دن رات ان کی خدمت کیا کرتیں۔ ہر وقت ان کا خیال رکھتیں کیونکہ وہ گزرا وقت نہیں بھولی تھیں جب ہر طرح کی آسائش تھی صحت و عافیت تھی تو ایوب علیہ السلام کس طرح ان کا خیال رکھتے تھے۔

اب صحت کا معاملہ یہ تھا کہ قضائے حاجت کے لیے وہ ان کے ساتھ جاتیں کیونکہ ان کے لیے چلنا پھرنا دشوار ہو چکا تھا۔ گھر بار مال و دولت ختم ہو چکا تھا۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہ تھا۔

وہ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور اپنے شوہر کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی رہیں۔ ان نامساعد حالات میں بھی ان کے ماتھے پر بل تک نہ پڑا اور اپنے صابر شوہر کے ساتھ مشکلات جھیلتی اور صبر شکر کے مراحل طے کرتی رہیں اور اپنے آپ کو اللہ کے حکم پر راضی رہ کر باوفا عورت ثابت کر کے بہترین بیوی کی مثال قائم کی۔

[illegible] یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو ان کے درجات بلند کرنے، عظم خدا اور ناگوار امور پر صبر [illegible] عمل نمونہ بنانے کے لیے آزماتا ہے۔

[illegible] حضرت ایوب علیہ السلام کو اس حال میں دیکھ کر بست دکھی ہوتیں۔ ایک دن حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ تکلیف جھیلتے زمانہ گزر گیا اور ان کے صبر و شکر میں کوئی کمی نہ آئی تو لیا نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے نبی آپ تو مستجاب الدعوات لوگوں میں سے ہیں، اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو صحت یاب کر دے۔"

تو ایوب علیہ السلام فرمانے لگے کہ "ستر سال تک اللہ نے مجھے صحت و عافیت میں رکھا تو اگر ستر سال تک میں اسی حالت میں رہوں اور صبر کروں تو یہ بھی بہت کم ہے۔"

ان کی رضا و تسلیم سے بھرپور بات سن کر لیا کانپ اٹھیں۔ وہ ان کا ساتھ دیتی رہیں اور ان سے محبت اور تعلق نبھاتی رہیں کیونکہ وہ اللہ کے نبی ایوب علیہ السلام پر دل سے ایمان رکھتی تھیں۔

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایوب علیہ السلام تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلا رہے حتیٰ کہ تمام عزیز و اقارب قریب و بعید کے متعارف سبھی نے

ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی البتہ اعزا میں سے دو عزیز ضرور صبح و شام ان کے پاس آتے رہے۔ ایک مرتبہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایوب علیہ السلام نے ضرور کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے تب ہی تو وہ اس کی پاداش میں ایسی سخت مصیبت کے اندر مبتلا ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیا خدا ان پر مہربان نہ ہوجاتا اور ان کو شفا نہ ہوجاتی۔"

یہ بات دوسرے نے حضرت ایوب علیہ السلام سے کہہ سنائی۔

ایوب علیہ السلام یہ بات سن کر بہت بے چین اور مضطرب ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں سربسجود ہوکر دعا گو ہوئے اور ان کی دعا کو فوراً" بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ رفع حاجت کے لیے اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کی بیوی ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ جب فارغ ہوئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو خدا کی وحی نازل ہوئی کہ

"زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارو۔"

اور جب انہوں نے ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ ابل پڑا اور انہوں نے غسل صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح اور تندرست نظر آنے لگے۔ یہاں بیوی انتظار کررہی تھیں کہ ایوب علیہ السلام تازگی اور شگفتگی کے ساتھ سامنے نظر آئے وہ قطعاً" نہ پہچان سکیں اور ایوب علیہ السلام کے متعلق ان ہی سے دریافت کرنے لگیں۔ تب آپ علیہ السلام نے فرمایا میں ہی ایوب ہوں اور خدا کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا۔

روز مرہ کے کھانے کے لیے ایوب علیہ السلام کے پاس ایک کٹھڑی گیہوں کی اور ایک جو کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے گیہوں کو سونے اور جو کو چاندی میں بدل دیا۔

لیا علیہ السلام ہر وقت حضرت ایوب علیہ السلام کی تیمارداری میں مشغول رہا کرتی تھیں ایک مرتبہ انہوں نے ایوب علیہ السلام کی انتہائی تکلیف سے بے چین ہوکر کچھ ایسے کلمات کہہ دیے جو صبر ایوبی کو ٹھیس پہنچانے والے تھے اور اللہ کی جناب میں شکوہ لیے ہوئے تھے۔ ایوب علیہ السلام اس کو برداشت نہ کرسکے اور قسم کھا کر فرمایا کہ میں تجھ کو سو کوڑے لگاؤں گا۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام کی مدت امتحان ختم ہوگئی اور صحت یاب ہوئے تو قسم پوری کرنے کا سوال سامنے آیا۔ ایک جانب لیا علیہ السلام کی انتہائی وفاداری، غمگساری اور حسن خدمت کا معاملہ تھا اور دوسری جانب قسم کو سچا اور پورا کرنے کا سوال۔

ایوب علیہ السلام سخت تردد میں تھے کہ کیا کریں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس نیک بی بی لیا کی نیکی اور شوہر کی فرمانبرداری کا یہ صلہ دیا کہ ایوب علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ سو تنکوں کا ایک مٹھا بنائیں اور اس سے اپنی رفیقہ حیات کو ماریں تاکہ ان کی قسم بھی پوری ہوجائے اور لیا علیہ السلام کو تکلیف بھی نہ ہو۔ اس حکم سے اللہ کی نظر میں لیا علیہ السلام کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا:

"حضرت ایوب علیہ السلام غسل فرمارہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹڈیاں ان پر برسائیں۔ ایوب علیہ السلام نے انہیں دیکھا تو مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو پکارا۔

"ایوب کیا ہم نے تم کو یہ سب کچھ دے کر مال و دولت دے کر غنی نہیں بنایا پھر یہ کیا؟"

ایوب علیہ السلام نے عرض کی "پروردگار یہ سب صحیح اور درست مگر تیری نعمتوں اور برکتوں سے کون بے پروا ہوسکتا ہے۔"

اللہ عزوجل نے کڑے امتحان میں سرخروئی حاصل کرلینے کے بعد ایوب علیہ السلام اور لیا علیہ السلام پر اپنے انعامات کی بارش کردی۔ ان کے اہل و عیال، مال و دولت دوگنے چوگنے کرکے انہیں لوٹا دیے اور جو مال متاع اور بال بچے دنیا میں چھن گئے تھے ان کے بدلے میں انہیں بے پناہ اجر و ثواب سے نوازا۔

سچ ہے اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(بہ شکریہ ماہنامہ بتول)

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دہی بڑے چنا چاٹ

اجزا :

دہی	دو کپ
ابلے کابلی چنے	ایک کپ
مونگ، ماش کی دال	آدھا آدھا کپ
آلو، ٹماٹر	دو دو عدد
پیاز	ایک عدد
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا، زیرہ، کٹی مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	حسب ذائقہ
ہینگ	ایک چٹکی
پاپڑی	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

مونگ اور ماش کی دال چار گھنٹے تک بھگونے کے بعد پیس لیں اور اس میں نمک، میٹھا سوڈا، تھوڑی سی کٹی ہوئی لال مرچ اور آدھا چمچہ بھنا زیرہ ڈال کر رکھ دیں۔ آمیزہ پتلا نہیں ہونا چاہیے۔ فرائنگ پین میں ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کرکے اس میں ہینگ ڈالیں پھر ثابت دھنیا اور باقی زیرہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کوٹ کر دال میں ملا دیں۔ کڑاہی میں دال کے بڑے بنا کر سنہرا ہونے تک تلیں پھر نمک ملے پانی میں ڈال دیں۔ دہی میں نمک اور باقی کٹی ہوئی لال مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ آلو کو ابال کر چوکور کاٹ لیں اور کابلی چنوں کے ساتھ دہی میں ڈالیں پھر بڑے بھی پانی سے نکال کر دہی میں ڈال دیں۔ ٹماٹر، مرچ، پیاز اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور ہلکے ہاتھ سے سب کو مکس کر دیں۔ چاٹ مسالا، پاپڑی اور املی کی چٹنی کے ساتھ مزے دار دہی بڑے چنا چاٹ پیش کریں۔

ویجی ٹیبل آملیٹ

اجزا :

انڈے	چار عدد
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر، آلو	ایک ایک عدد
دودھ	ایک چوتھائی کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چوتھائی کپ

ترکیب :

انڈوں میں نمک، لال مرچ اور دودھ ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر اس میں چوپ کیے ہوئے آلو، پیاز، ٹماٹر، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر پھینٹیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے آملیٹ کا آمیزہ ڈال کر آنچ ہلکی کر دیں۔ ڈھک کر ایک منٹ تک پکائیں۔ آملیٹ سیٹ ہو جائے تو پلٹ کر دوسری طرف سے پکائیں۔ دونوں طرف سے پک جائے تو پلیٹ میں نکال کر پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔

اسپگیٹی فروٹ چاٹ

اجزا :

سیب، خربوزہ	ایک ایک عدد
کیلے	چھ عدد
آڑو	تین عدد
جیلی، فریش کریم	آدھا، آدھا کپ
چینی	چار کھانے کے چمچے
اسپگیٹی	آدھا پیکٹ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

اسپگیٹی کو نمک اور تیل والے پانی میں ابال لیں ٹھنڈے پانی سے گزار کر چھان لیں۔ تمام پھلوں کو چوکور کاٹ لیں۔ دو رنگ کی جیلی الگ الگ جما کر چوکور کاٹ کر رکھ لیں۔ فریش کریم میں ایک چٹکی نمک اور چینی ڈال کر پھینٹ لیں۔ پھر کٹے ہوئے پھل اور اسپگیٹی ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں۔ جیلی سے سجاوٹ کرکے فریج میں ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔ فریش کریم دستیاب نہ ہو تو

آپ دہی استعمال کرسکتی ہیں لیکن اس صورت میں کیٹے اور آڑو کی جگہ دوسرے پھل استعمال کریں۔

چکن پکوڑے

اجزا :

چکن	تین پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن	دو جوے
بیسن	آدھا پاؤ
پسا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچ
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

پیاز، لہسن، دو ہری مرچ اور آدھی گٹھی ہرا دھنیا کو آدھا کپ پانی میں بلینڈ کرکے پیسٹ بنالیں۔ بیسن میں زیرہ، گرم مسالا، سرخ مرچ، ایک چٹکی میٹھا سوڈا اور نمک ڈال کر گھول لیں۔ اوپر والا آمیزہ بھی مکس کرلیں۔ چکن (بغیر ہڈی) کے ٹکڑے بیسن میں ڈال دیں۔ (چکن کے بجائے قیمہ کو بھی ملایا جاسکتا ہے اور کیوبز میں کٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں بھی) اچھی طرح پلیٹ کو گرم تیل میں تلیں۔ سنہری ہوجائیں تو اتارلیں۔

چکن کچیاں

اجزا :

چکن قیمہ	ایک کپ
میدہ	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
کٹی ہری مرچ	دو عدد
سیاہ مرچ زیرہ	ایک، ایک چائے کا چمچ
اجوائن	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

فرائنگ پان میں تھوڑا سا تیل گرم کرکے چوپ کی ہوئی پیاز سنہری کرلیں۔ ٹماٹر، لہسن اور ہری مرچ کتر کر شامل کریں، پھر نمک اور کٹی ہوئی کالی مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کرنے کے بعد قیمہ ڈال کر بھونیں۔ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہوجائے تو ہرا دھنیا اور زیرہ ڈال کر چولہا بند کردیں۔ میدے میں نمک، اجوائن اور تقریباً چار کھانے کے چمچے تیل ملا کر گرم پانی سے گوندھ لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر روٹی بیل کر کٹوری کی مدد سے گول کاٹ لیں۔ ایک طرف قیمہ کا آمیزہ رکھ کر دوسرا حصہ پلٹ دیں اور کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کردیں۔ اسی طرح ساری کچیاں بنا کر گرم اور گہرے تیل میں تل لیں۔ چٹنی یا کیچپ کے ساتھ افطاری میں پیش کریں۔

تل کا پراٹھا

اجزا :

آلو	آدھا کلو
آٹا	ایک کلو
اجوائن	ایک چٹکی
انار دانہ	ایک کھانے کا چمچ
تل	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

آلو ابال کر میش کریں، پھر اس میں تمام اجزا مکس کرلیں۔ آٹے کا پیڑا بنا کر ایک چھوٹی روٹی بیل کر الگ رکھیں اور دوسری روٹی اسی سائز کی بیلیں۔ اس پر آلو والا آمیزہ رکھ کر اوپر بیلی ہوئی روٹی رکھیں اور ہلکے ہاتھ سے بیل کر تھوڑی بڑی کرلیں۔ کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کرلیں۔ تھوڑے سے تل چھڑک کر کانٹے کی مدد سے گودیں، پھر عام پراٹھوں کی طرح تل لیں۔

لائم جوس

اجزا :

لیموں	آٹھ عدد
لیمن سوڈا	ایک گلاس
چینی	دو چائے کے چمچے

لیمن سوڈا میں چینی ڈال کر گرائنڈ کریں۔ لیموں کو چھیل کر بیج نکال لیں اور لیمن سوڈا میں ڈال کر ایک بار پھر خوب گرائنڈ کریں۔ برف ڈال کر ٹھنڈا کریں اور افطار پر پیش کریں۔

ادارہ

خوب صورت بنیے



سکنجبین کے فائدے

گرم موسم میں سادہ لیکن صاف شفاف پانی زیادہ پینا مجرب نسخہ شفا ہے۔ لیکن اگر پانی سے ہٹ کر کچھ پینے کو جی چاہے تو سکنجبین سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اور جھاگ دار مشروبات سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔ آیئے ہم بتاتے ہیں کہ ایک گلاس پانی میں آدھا لیموں نچوڑ کر پینے سے آپ کی صحت کو کتنا فائدہ ہو سکتا ہے۔

☆ لیموں میں وٹامن سی کی بہتات ہوتی ہے جو جسم کو بیماریوں سے بچانے والے نظام کو صحت مند رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ سانس کی نالیوں میں انفیکشن کا خطرہ گھٹ جاتا ہے۔ دمہ اور سانس کے دیگر مسائل میں بھی اسکوربک ایسڈ یعنی وٹامن سی کا استعمال کرنا مفید ہے۔ لیموں میں ایسے اجزا بھی ہوتے ہیں جو جراثیم کش خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں اور لیموں کا یہ جزو نزلہ زکام سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اسکوربک ایسڈ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ جسم میں فولاد کو جذب کرنے میں مدد دیتا ہے کیوں کہ آئرن جسم کے ہارمونی نظام کی کارکردگی پر گہرا اثر رکھتا ہے۔

☆ اگرچہ لیموں کا ذائقہ قدرے تیزابی محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہ جسم کے تیزابی مادوں کی تیزابیت معتدل کرتا ہے۔ واضح رہے کہ تیزابیت کی وجہ سے جسم میں درد بھی ہو جا سکتا ہے' وزن بڑھ سکتا ہے اور دیگر طبی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں' لیکن لیموں کا شربت ان تمام خرابیوں کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆ لیموں کا شربت کھانا ہضم کرنے کے لیے بھی بہترین نسخہ ہے۔ لیموں کا رس جگر کو صاف اور فعال کرتا ہے۔ لیموں میں شامل وٹامن سی معدے میں زخم بننے کے خطرے کو بھی کم کر دیتا ہے۔

★ لیموں میں شامل وٹامن سی اور دیگر تمام اینٹی آکسیڈنٹس جسم کو فری ریڈیکل سے پہنچنے والے نقصانات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بڑھاپے کی زیادہ تر علامتوں کا سبب بھی فری ریڈیکلز ہوتے ہیں۔ اگر سکنجبین کی صورت میں اینٹی آکسیڈنٹ جسم کو فراہم کیے جائیں تو فری ریڈیکلز کے نقصانات کی تلافی ممکن ہے۔ ایسی صورت میں جسم پر جھریاں بھی کم نمایاں ہوں گی۔ لیموں کا شربت پینے کے علاوہ لیموں کا عرق ان داغ دھبوں پر براہ راست لگایا بھی جا سکتا ہے' جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچنے کے بعد جلد پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ لیموں کا شربت خون میں موجود فاسد مادوں کو بھی خارج کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ جس سے جلد کی شگفتگی اور شادابی برقرار رہتی ہے۔

☆ لیموں میں سوزش رفع کرنے کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس لیے دباؤ' چوٹ یا زخم کو ٹھیک کرنے میں وٹامن سی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

☆ ہر صبح کا آغاز اگر آپ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر کریں تو دن بھر آپ کا ہاضمہ ٹھیک رہ سکتا ہے اور رات کو نظام ہضم میں کوئی فاسد مادہ اگر اٹک گیا ہو تو لیموں کا استعمال اسے جسم سے خارج کر سکتا ہے۔